سخن در سخن

طنزیہ
مزاحیہ
کالموں
کا انتخاب

خامہ بگوش کے قلم سے

مرتّبہ

مظفّر علی سیّد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

© مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ہم اعلان کرتے ہیں کہ اس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں، سوائے لاغر مراد آبادی کے نام کے، وہ سب فرضی ہیں ناموں کی جزوی یا کلی مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے، ارادی نہیں۔ خامہ بگوش

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

مجلد 150/=

پہلی بار فروری ۱۹۹۵ء تعداد 1000 قیمت عام اڈیشن پیپر بیک 80/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

الفاظ یا آلاتِ حرب و ضرب ۱
آمد اور آورد ۷
ایک اور غالب شکن ۱۶
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ۲۱
دامنِ یوسف یا دامنِ تار تار ۳۰
علامہ اقبال کے گھوڑے کا شجرۂ نسب ۴۲
لسانیات اور لسّانیات ۴۸
اژدر نامۂ ساقی فاروقی ۵۲
استفادہ یا سرقہ ۵۷
شخصی خاکے یا دوستوں کے غلط نامے ۶۱
۸۱ سال کا جوانِ رعنا ۶۸
تنقید یا قصیدہ گوئی ۷۳
طبع زاد تراجم کا خالق ۷۸
شعری مجموعہ یا فرس نامہ ۸۳
دھان پان طنز و مزاح ۸۹
شاعری یا عذابِ الٰہی ۹۳
دنیادار صوفی ۹۷
عذرِ شاعری بدتر از شاعری ۱۰۰
بزرگی بہ سالِ گرہ ۱۰۶
خراجِ تحسین یا اخراجِ تحسین ۱۱۱
رجحان ساز یا کتاب ساز ۱۱۵
انشائیہ اور سنگِ طفلان ۱۲۰
شاعری یا سوءِ تنفّس ۱۲۵
نقدِ مستعار ۱۳۱
طنز و مزاح کا خانۂ خالی ۱۳۵
نقشا کھینچنا یا نقشا بگاڑنا ۱۴۱
کمالِ کفش دوزی اور تنقید ۱۴۶
ورودِ نامسعود ۱۵۲
ہمہ صفت موصوف ۱۶۲
تنقید یا تخریب کاری ۱۶۸

ڈبویا ان کے ہونے نے ۱۷۳
اہلِ تحقیق کی سخن ناشناسی ۱۷۷
عمرِ عزیز یا عمرِ رائیگاں ۱۸۱
ترقی پسندی یا روایتی کمبل ۱۹۱
تحسینِ ناشناس ۱۹۶
ریختی اور ریختہ ۲۰۰
شرحِ ناخواندگی میں اضافہ ۲۰۵
شہرت اور شاعری کی دوڑ ۲۱۱
سفرنامہ یا تذکرۂ انسا ۲۱۵
ساختیات اور خود ساختیات ۲۲۱
ادبِ عالیہ امام ۲۲۶
ادب اور پبلک ریلیشننگ ۲۳۳
شاعری یا کلامِ موزوں ۲۳۸
طبع آزمائی یا طالع آزمائی ۲۴۴
شاعری یا ہفت خوانِ رستم ۲۴۹
سچا جھوٹ یا جھوٹا سچ ۲۵۵
انشائیے کی تدفین ۲۶۱
ترقی پسند تحریک کی لُٹیا ۲۶۵
خام خیالی یا روشن خیالی ۲۷۰
قافیہ و ردیف کا بوجھ ۲۷۵
خود نوشت شاعری ۲۸۱
"بوئے رسیدہ" یا "بوئے عمر رسیدہ" ۲۹۱
بڑی شاعری یا بُری شاعری ۲۹۴
ناول یا تحقیقی مقالہ ۲۹۹
اسقاطِ سخن ۳۰۳
ادبی غنڈہ ٹیکس ۳۰۷
ادب کا جعلی شناختی کارڈ ۳۱۳
شاعری اور عزّتِ سادات ۳۱۷
سرقہ نویسی ۳۲۲

غلط نامہ

خود اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کسی دوسرے کی کتاب پر لکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ پڑھے بغیر اس کی وہ خوبیاں تلاش کر لی جاتی ہیں جو اس میں نہیں ہوتیں۔ اپنی کتاب کی جھوٹی تعریف تو الگ رہی، سچّی تعریف بھی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ خدشہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بھی جھوٹ ہی سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ہم یہ عرض کریں کہ اِس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے تو آپ پہلے لفظ "سنجیدہ" کے کئی بار استعمال پر مُسکرائیں گے، اور پھر نہایت سنجیدگی سے یہ فرمائیں گے، اگر یہ کتاب سنجیدہ ہے تو غیر سنجیدہ کتاب کسے کہا جائے گا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن خدا لگتی کہنے میں اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو یہ فرمائیے، کیا یہ کتاب ویسی ہی نہیں ہے جیسی اردو میں عام طور پر تنقیدی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ اردو کی تنقیدی کتابوں کے مصنّفوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ نہیں ہے بلکہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ ہاں کہیں کہیں دو اور دو کا حاصل جمع تین یا پانچ بھی ہو گیا ہے لیکن اس عمل کا اردو کے محاورے "تین پانچ کرنا" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محاورہ اردو کے پیشہ ور نقادوں ہی کے حوالے سے اچھا لگتا ہے جو بقول شخصے، تنقید کم لکھتے ہیں، گھوڑوں پر رقم زیادہ لگاتے ہیں۔ گھوڑوں پر رقم لگانے میں کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ مگر ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے کیونکہ ہم سے وہ لوگ عموماً ناراض ہو جاتے ہیں جن کو موضوع بنا کر ہم اظہارِ خیال کی جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے

لکھا ہے۔ مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے، صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔

بہر حال اب جب کہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے، ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے، ان سب کے لیے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبّت بھی۔ محبت میں چونکہ سبھی کچھ جائز ہوتا ہے، اِس لیے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جنھیں غالب کے لفظوں میں "سخن گسترانہ" کہا جا سکتا ہے۔ امید ہے ہماری "یہ سخن گستری" آیندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ "خوشگوار تعلقات" سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ لکھتے رہیں جو اب تک لکھتے رہے ہیں اور ہم ان کے لکھے پر بساط بھر اظہار خیال کرتے رہیں۔ جب ہم اُن کے لکھے کا بُرا نہیں مانتے تو اُنھیں بھی ہمارے لکھنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

ممکن ہے ہماری مذکورہ بالا معذرت خواہانہ باتوں پر بعض لوگوں کو یقین نہ آئے، لہٰذا ہم ان کی تالیفِ قلب کے لیے اعلان کرتے ہیں کہ اس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں، سوائے لاغر مراد آبادی کے نام کے، وہ سب فرضی ہیں۔ ناموں کی جزوی یا کلّی مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے، ارادی نہیں۔

ہمیں اس موقع پر وہ لوگ بھی یاد آرہے ہیں جو اَب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ مرحومین کے بارے میں کوئی کالم کتاب میں شامل نہ کیا جائے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مرحومین کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کا ذکر اُسی طرح کرتے رہیں جس طرح ان کی زندگی میں کرتے تھے تاکہ وہ ہمیں اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے رہیں۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب زندہ ادب کے بارے میں نہ سہی، زندہ ادیبوں کے بارے میں ضرور ہے۔

کالموں کا انتخاب شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جس ادبی معاشرے میں سبھی صاحبِ کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے۔ مگر یہ جو ہمارے کرم فرما شاہد علی خاں صاحب ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے کالم مکتبہ جامعہ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہوئے تو ضائع ہو جائیں گے۔ خاں صاحب بڑے تجربہ کار ناشر ہیں اور دوسروں سے زیادہ اِس

حقیقت سے واقف ہیں کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے ہی کی وجہ سے ضائع ہوجاتی ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے لوٹتے ہیں اور جب ان کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لُٹ گئے۔ ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخوں میں تو نہیں، کاغذ کے ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔ ہم نے خاں صاحب کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ رشید حسن خاں صاحب نے خان صاحبی کی کچھ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ ہم ہر اس شخص سے ڈرتے ہیں جس کے نام میں ''خاں'' کا لاحقہ شامل ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں خاں صاحب کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

کالم نگاری ہم بہت عرصے سے کر رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے کالموں کی مجموعی ضخامت ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' سے کم نہیں ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کو پڑھ کر انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے، حشر کے دن گناہ گار عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ انھیں صرف وہی کھانے کھلائے جائیں گے جو انھوں نے خود پکائے ہوں۔ اسی طرح کسی لکھنے والے کو جو بڑی سے بڑی سزا دی جاسکتی ہے وہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسے اُسی کی تحریریں پڑھوائی جائیں۔ ہم اس سزا کے بھگتنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکے۔ البتہ سزا کا دورانیہ کم کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کے آٹھ برسوں کے دوران لکھے گئے کالموں میں سے کچھ کالم انتخاب کرلیے جائیں۔ ان کالموں کو ہم نے جمع کیا اور ان پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابلِ انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔

اس مرحلے پر اردو کے منفرد نقّاد مظفر علی سیّد نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمے داری قبول کرلی۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے فرمایا، کوئی مصنّف اپنی تحریروں کا انتخاب خود نہیں کرسکتا کیوں کہ اسے اپنی ہر تحریر ''عالم میں انتخاب'' اور آپ کو ''کالم میں انتخاب'' نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کون سا ہے اور بُرا کون سا۔ میں تو اس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم بُرا ہے اور کون سا زیادہ۔ انتخاب کرنے کا یہ کڑا معیار سیّد صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیونکہ اُن کی نگاہِ انتخاب خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدر داں ہے۔ اور پھر اس

معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں۔ اس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سیّد صاحب نے مرتب فرمایا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ نظیر صدیقی صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کسی نقاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات کے ہوتے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سیّد صاحب نے نہایت توجّہ اور محنت سے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑی محبّت سے ہمارے کالموں کو پڑھا۔ ان تمام کالموں کو مسترد کر دیا جن میں ان کی پسندیدہ شخصیات کو ہم نے مسترد کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے نزدیک وہ کالم بھی بے اعتبار ٹھہرا جو خود ان کے اعزاز میں لکھا گیا تھا۔ اور جس میں ان کے وزیٹنگ کارڈ کو ان کی واحد مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اس کالم کی اشاعت کے بعد سیّد صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تنقید کی آزادی" بالآخر شائع ہو گیا۔ مزید دو مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ یہ بھی ایسی عجیب بات ہے کہ ہماری کالم نگاری کا کم از کم ایک مثبت نتیجہ بھی ظاہر ہوا ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ سیّد صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطورِ انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی محنت اور ہماری ناکارکردگی کا دستاویزی ثبوت لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر کی طرح باقی رہ جائے لیکن اس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے، لہٰذا دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن اب ایک اور مشکل سامنے آ گئی کہ اگر سیّد صاحب کے تمام منتخبہ کالم شائع کیے جائیں تو ان کی ضخامت بھی قاری اور ناشر دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ مجبوراً منتخبہ کالموں میں سے بھی تقریباً نصف حذف کرنے پڑے۔

ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد نظرِ ثانی کا مرحلہ آیا۔ دو چار کالم پڑھ کر ہی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ بہرحال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ کتاب کے آخر میں "غلط نامہ" شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر خیال آیا کہ اردو کی کتابوں میں غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو خود غلط نامے کا نعم البدل ہوتی ہیں۔

الفاظ یا آلاتِ حرب و ضرب

عبدالعزیز خالد ایک غیر معمولی ادبی شخصیت ہیں۔ علم و فضل کے اعتبار سے وہ ایسے قد آور ہیں کہ ان کی طرف دیکھنے والوں کی ٹوپی گر جاتی ہے اور اُن کا علم و فضل اتنا وزنی ہے کہ اس کی زد میں آکر ٹوپی کے ساتھ اس کا پہننے والا بھی گر جاتا ہے۔ قادر الکلام وہ ایسے ہیں کہ ذرا سی بات کو پھیلا کر کتاب بنا سکتے ہیں اور کتاب کے تمام مطالب کو ایک مصرعے میں سمیٹ سکتے ہیں۔ گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا اور کوزے کے پانی کو سمندر میں تبدیل کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دائیں ہاتھ کا کھیل یہ ہے کہ وہ خالد کے خیالاتِ عالیہ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اور صفحۂ قرطاس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سارے بوجھ کو بخوبی سہار لیتا ہے' اسی لیے تو خالد کی کتابوں میں نہایت دبیز اور مضبوط کاغذ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ وہی ہے جس سے پرانے زمانے میں کاغذی پیرہن تیار کیے جاتے تھے۔ فریادی انھیں پہن کر فریاد کرتے تھے۔ اب کاغذی پیرہن کا رواج نہیں رہا' اس لیے کاغذ پر جو کچھ لکھا ہوتا ہے اُسی کو پڑھ کر فریاد کی لے تیز ہو جاتی ہے۔

خالد کا ذخیرۂ الفاظ اتنا وسیع ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا کوئی لفظ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کئی زبانوں کی لغات گھول کر پی گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ ہے۔ خالد کا لسانی نظامِ ہضم اتنا قوی ہے کہ لغات کو گھول کر پینے کی ضرورت نہیں' وہ انھیں سالم بھی نگل سکتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ کوئی نظم تخلیق کرتے ہیں تو الفاظ کے ساتھ قاری بھی ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس بیان سے بھی بوئے مبالغہ آتی ہے۔ خالد کی کوئی نظم پڑھنے کے بعد قاری میں اتنی سکت کہاں رہتی ہو گی کہ پہلے تو وہ ہاتھ باندھے اور پھر کھڑا ہو جائے۔ بہر حال

اس میں شک نہیں کہ خالد نے اردو زبان کو نئے نئے لفظوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لفظ اتنے بھاری ہیں کہ ان سے آلاتِ حرب و ضرب کا کام لیا جا سکتا ہے اور قارئین کو سنگ سار بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان باتوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خالد صرف لغت نگاری کرتے ہیں۔ وہ نغز گو شاعر ہیں۔ ان کے چند خوب صورت شعر سنیے:

کنارِ بحر پہ غواص رُو بہ قبلہ ہے
کہ بے دعا گہرِ شایگاں نہیں ملتا

ہوا کے دوش پہ آئی ہے دور کی خوشبو
پرانی یادوں سے دیوار و در مہک اٹھے

ظلمتِ شب میں تیرے چہرے کی صبح
جیسے امید کی کرن پھوٹے

خالد نے ایسے سیکڑوں شعر کہے ہیں لیکن انھیں تلاش کرنا شرط ہے کیوں کہ اس قسم کے شعر دوسری قسم کے ہزاروں شعروں کے درمیان بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی لیے تو ہماری یہ رائے ہے کہ غالب کی طرح خالد کے کلام کا انتخاب بھی ہونا چاہیے۔ شرح نویسی کا مرحلہ اس کے بعد آئے گا۔

خالد اردو کے ان تین خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ باقی دو غالب اور اقبال ہیں۔ خالد کو ان دونوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے ان کی زندگی میں لکھا گیا ہے۔ غالب اور اقبال مرنے کے بعد نقادوں کی خوش فعلیوں کا ہدف بنے۔ خالد کے بارے میں کئی رسالوں کے ضخیم نمبر شائع ہو چکے ہیں اور کچھ کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ خالد نے خود زیادہ لکھا ہے یا ان پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ان کا کلام رکھا جائے اور دوسرے میں ان کے بارے میں لکھی گئی تحریریں تو ترازو ٹوٹ جائے گا، کیونکہ ترازو اتنا بوجھ نہیں سہار سکتا۔

حال ہی میں "ارمغانِ خالد" کے نام سے بڑے سائز کے گیارہ سو صفحات کی کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مرتب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ہیں۔ اس کتاب میں خالد کے بارے میں وہ تمام تحریریں یک جا

کردی گئی ہیں جو مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوئی تھیں۔ نیز کچھ تحریریں ایسی بھی ہیں جو پہلی مرتبہ اسی کتاب کے ذریعے منظرِ عام پر آئی ہیں۔

مرتب نے منتشر تحریروں کو جمع کرنے میں جو محنت کی ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہو گا۔ خالد کی شخصیت اور فن پر طویل مقالوں کے ساتھ ہر وہ جملہ اور پیراگراف بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے جس میں مرتب کو خالد کا نام نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی ایسی تحریریں بھی اس کتاب میں شامل ہو گئی ہیں جن کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ ان میں لفظ "خالد" خطاطی کے اعتبار سے بہت عمدہ لکھا گیا ہے۔

بہرحال مرتب کی یہ محنت بے فائدہ نہیں۔ سو سال بعد جب خالد پر تحقیق ہو گی تو محققوں کو "خام مواد" کی فراہمی کے لیے اخبارات و جرائد کی گرد جھاڑنا نہیں پڑے گی۔ سب کچھ انھیں ایک ہی جگہ مل جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جن لوگوں کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں ان میں سے بعض کے بارے میں سو سال بعد محققوں کو یہ جاننے میں دقت پیش آئے گی کہ یہ لوگ کون تھے اور کیا بیچتے تھے۔ یہ بات باندازِ دیگر یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں شامل بعض تحریروں کے لکھنے والوں کے نام محض اس لیے باقی رہ جائیں گے کہ انھوں نے خالد پر کبھی کچھ لکھا تھا۔

مضامین کے ساتھ ساتھ بہت سی نظمیں بھی داخلِ دفتر کی گئی ہیں۔ بعض شعرا نے نہایت نادر انداز میں خالد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ مثلاً :

ابنائے فن کے والد

عبدالعزیز خالد

(رئیس امروہوی)

شعلہ نوا سخن ور عبدالعزیز خالد
علم و فن و زبان پر کس شان سے ہیں قادر
ہوتے ہیں شعر نازل یا کرتے ہیں چڑھائی
غوری و غزنوی و ابدالی اور نادر

(نظیر لدھیانوی)

رئیس امروہوی نے اچھا کیا کہ ابنائے فن کی ولدیت کا راز فاش کر دیا۔ امید ہے آیندہ ابنائے

فن کے شناختی کارڈوں میں ولدیت کے خانے میں لفظ "نامعلوم" نہیں لکھا جائے گا۔ البتہ نظیر لدھیانوی نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ خالد پر شعر اسی طرح نازل ہوتے ہیں جس طرح نادر شاہ وغیرہ کے لشکر دشمن پر چڑھائی کرتے تھے۔ تشبیہ ناقص ہے کیوں کہ نادر شاہ وغیرہ تھک کر قتلِ عام بند بھی کر دیتے تھے لیکن خالد کی شاعری ایک مسلسل عمل ہے۔ اس عمل کے دوران ماندگی کا وقفہ بالکل نہیں آتا۔

اس مجموعے کی جان "پری گوشۂ عفت موہانی" ہے جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ عفت موہانی ہندوستان کی ایک معروف ادیبہ ہیں اور خالد کی عقیدت مند۔ عفت کے چند عقیدت مندانہ مضامین کے ساتھ اس گوشے میں خالد و عفت کی طویل خط و کتابت بھی ہے۔ عفت موہانی کو خالد سے اس درجہ عقیدت ہے کہ وہ انھیں "شاعرِ آخر الزماں" کا خطاب دے کر یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان جیسا عظیم شاعر پہلے کبھی پیدا ہوا ہے نہ آیندہ ہو گا۔

وہ خالد پر اپنی عمرِ فانی نثار کرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں کیوں کہ وہ بحرِ جہالت میں ایک مینارۂ نور ہیں۔ ان کے نزدیک خالد آسمانوں کی طرح بلند، سمندروں کی طرح عمیق، کائنات کی طرح وسیع اور انسان کے روپ میں فرشتہ ہیں۔ وہ انھیں کبھی "بھائی خالد" کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اور کبھی "میرے دیوتا" کہتی ہیں۔ یہ خط و کتابت کیا ہے اچھا خاصا دیومالائی ادب ہے۔ بعض دیومالائی کرداروں کے باہمی رشتوں میں ایسی ہی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔

کتاب کے دیباچے میں جناب مرتب نے لکھا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانوں کی اہمیت نہیں رہی۔ اس وجہ سے عربی اور فارسی کا ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ خالد کی شاعری اس خلا کو پُر کرتی ہے۔ ہمیں اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو چاہیے کہ کلامِ خالد کا مطالعہ کرنے والوں کو مولوی فاضل اور منشی فاضل کی اسناد عطا کر دیں۔ اس کے لیے کسی تحریری امتحان کی ضرورت نہیں کہ کلام خالد کا مطالعہ بجائے خود ایک امتحان کا درجہ رکھتا ہے۔

جناب مرتب نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ خالد ہم عصری چشمک کا شکار ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ شکایت بے جا ہے۔ خالد کو ہم عصروں سے جتنی داد ملی ہے اتنی شاید ہی کسی کو ملی ہو گی۔ کئی کئی ہزار صفحوں کے خالد نمبروں اور زیرِ نظر کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم عصروں نے خالد کو ہاتھوں ہاتھ لیا

ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض حسد پیشہ ہم عصروں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اُن کے بارے میں طرح طرح کے بے سروپا لطیفے مشہور کیے ہیں۔ مثلاً پچھلے سال انیس ناگی کراچی آئے تھے تو انھوں نے یہ لطیفہ سنایا تھا۔ ریل کے سفر کے دوران دو مسافر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا' عبدالعزیز خالد کے شعر کسی کو یاد نہیں رہتے' اگر آپ ان کے پانچ شعر سنا دیں تو میں پچاس روپے دوں گا۔ دوسرے نے فوراً خالد کے پانچ شعر سنا دیے۔ پہلا بہت متعجب ہوا۔ اس نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور شرط جیتنے والے کے حوالے کرتے ہوئے کہا' اپنا تعارف تو کرائیے۔ شرط جیتنے والے نے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا' میں ہی تو عبدالعزیز خالد ہوں۔

(۹/ فروری ۱۹۸۹ء)

آمد اور آورد

اگر کوئی ہمارے تین پسندیدہ شاعروں کے نام پوچھے تو ہم رسوائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر میر، غالب اور بشیر بدر کے نام لیں گے۔ میر و غالب کے نام تو تین کی تعداد پوری کرنے کے لیے ہیں ورنہ اصل پسندیدہ شاعر ایک ہی ہے جس کی تعریف میں ہم صفحوں کے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں، اور یہ سیاہی کسی بھی گناہ گار کے نامۂ اعمال کی سیاہی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ لیکن بشیر بدر کی شاعری سے زیادہ جو چیز ہمیں پسند ہے، وہ مشاعرے میں کلام سنانے کا اُن کا انداز ہے۔ بلاشبہ اُنھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ مشاعرے میں وہ اپنی آواز کا جادو اِس طرح جگاتے ہیں کہ سامعین اُن کے ایسے شعروں پر بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو اگر کوئی دوسرا شاعر سنائے تو داد کی بجائے سزا کا مستحق قرار پائے۔ شعروں کے ساتھ ساتھ بشیر بدر کو اُن کی نثر پر بھی داد ملتی ہے۔ ہر شعر سے پہلے وہ ایک آدھ جملہ ضرور ارشاد فرماتے ہیں جو کچھ اِس قسم کا ہوتا ہے:

"جو شعر میں سنانے جا رہا ہوں، اُس پر اگر آپ نے داد نہ دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا"۔

"میں کتنی دور سے چل کر آپ کے شہر میں آیا ہوں، یقین ہے کہ مجھ مسافر کو آپ شجرِ داد کے سائے سے محروم نہیں رکھیں گے"۔

"میں اپنا کلام صرف سخن فہموں کو سناتا ہوں اور اُن سے داد پاتا ہوں، آپ سخن فہم ہیں، اِس لیے آپ کی داد میرے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے"۔

"ذرا دیکھیے اِس شعر میں میں نے کیسی نازک بات کہی ہے، یہ نازک بات نہیں، نازک شیشہ ہے، یہ شیشہ آپ کی خاموشی کے پتھر سے ٹوٹ جائے گا، اِس لیے داد سے محروم نہ رکھیے گا"۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ بہت وسیع المطالعہ ہیں کیوں کہ سارا

سال مشاعرے پڑھتے رہتے ہیں۔ بشیر بدر بھی وسیع المطالعہ ہیں لیکن اُن کا مطالعہ مشاعروں تک محدود نہیں ہے۔ اُنھوں نے اردو ادب خصوصاً جدید اردو غزل کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل کے بارے میں اُن کی ایک ضخیم تنقیدی و تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اُس میں کثرت سے ایسے شعر درج کیے گئے ہیں جو جدید رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اُن میں زیادہ تعداد خود بشیر بدر کے شعروں کی ہے اور کتاب کے ضخیم ہونے کا سبب بھی یہی ہے۔

بشیر بدر اپنے آپ کو موجودہ زمانے ہی کا نہیں آنے والے زمانوں کا بھی بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ اِس وجہ سے بعض لوگ اُنھیں خود پرستی کا مریض قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اِس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بشیر بدر خود پرستی کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ خود شناسی کے درجے پر فائز ہیں۔ بلاشبہہ موجودہ زمانے میں (بقول خود) اُن سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقیدِ حیات نہیں ہے۔ (واضح رہے بقیدِ حیات ہونا بقیدِ ہوش و حواس ہونے سے بالکل مختلف چیز ہے اور یہاں اُس سے بحث نہیں ہے)

بشیر بدر نے اپنی تعریف میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاعری کی طرح نثر میں بھی وہ اپنے آپ کو دُہرانے لگے ہیں۔ نیز منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے وہ اِس موضوع کا حق ادا نہیں کرپاتے۔ اِس صورت حال کے پیش نظر اُن کی بیگم راحت بدر صاحبہ نے اُن پر نثر لکھنے کی پابندی لگا دی ہے اور یہ شعبہ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ طے ہوا ہے کہ آیندہ بشیر بدر اپنی تعریف خود نہیں کریں گے' یہ فریضہ اُن کی بیگم صاحبہ انجام دیں گی۔ بیگم صاحبہ نے نہایت شان دار طریقے سے اِس کام کا آغاز کیا ہے۔ پچھلے دنوں بشیر بدر نے امریکہ میں مشاعرہ گردی کی تھی۔ بیگم صاحبہ ساتھ تھیں۔ اُنھوں نے اِس سفر کی دلچسپ روداد لکھی ہے جو دہلی کے رسالے "بیسویں صدی" میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ اِس وقت اِس سفرنامے کی ابتدائی دو قسطیں ہمارے سامنے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے اپنا تعارف اِن الفاظ میں کرایا ہے: "عمر ۳۵ سال' لانبی اور پتلی ہونے کی وجہ سے اور بھی کم لگتی ہوں..... میں نے بی ایس سی کیا۔ اِس کے بعد اردو غزل نے مجھے مار لیا۔ بھوپال یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے (فرسٹ کلاس) اور بی ایڈ بھی کرلیا۔ اب اردو ہی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں"۔

اِس کے بعد امریکہ کا ویزا حاصل کرنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ امریکی سفارت خانے میں

بشیر بدر سے پوچھا گیا کہ آپ کی اور آپ کی بیوی کی عمر میں اٹھارہ برس کا فرق کیوں ہے۔ بشیر بدر نے اِس کا یہ شاعرانہ جواب دیا: "اِس میں میری خطا نہیں ہے۔ آپ یقین جانیے میں محبت اور حُسن کا شاعر ہوں۔ میری شاعری سے اتنے بڑے ملک میں جو چند لڑکیاں متاثر ہوئیں اُن میں سب سے زیادہ عمر انھیں کی ہے"۔ حیرت ہے کہ ۷۵ کروڑ کی آبادی میں بشیر بدر کی شاعری سے صرف چند لڑکیاں متاثر ہوئیں۔ خیر اِس سے کیا فرق پڑتا ہے' بشیر بدر کے حریف مرزا غالب کی زندگی میں اُن کی مقبولیت کا دائرہ اتنا بھی وسیع نہیں تھا۔

بیگم صاحبہ نے بشیر بدر کی شاعرانہ اور شخصی عظمت کے جو واقعات بیان کیے ہیں' ان میں سرِفہرست یہ ہے کہ اٹلانٹا کے مشاعرے کا جو پوسٹر شائع ہوا تھا' اُس میں بشیر بدر کا نام کلیم عاجز اور قتیل شفائی کے ناموں سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ یقیناً بہت بڑا اعزاز ہے۔ اِس پوسٹر کو محفوظ کرنے کے لیے کسی عجائب گھر میں رکھوا دینا چاہیے تا کہ سند رہے اور آیندہ زمانے میں اگر کوئی بشیر بدر کو عظیم شاعر نہ سمجھے تو اِس پوسٹر کو دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ پوسٹر ہمیشہ مخالفوں کا منھ بند کرنے کے کام آئے گا۔ بلکہ اِسے مخالفوں کے منھ پر ہی چپکا دینا چاہیے۔

بشیر بدر کی عظمت و مقبولیت کا ایک واقعہ بیگم صاحبہ نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے: "....دور سے آواز آئی۔ بدر صاحب رکیے اور اِن سے ملیے یہ آپ کی شاعری کی بارہ سال سے عاشق ہیں۔ یہ چندی گڑھ میں پہلی دفعہ آپ کی گرفتار ہوئیں۔ آپ نے شادی میں ذرا جلدی کر دی.... وہ تیکھے تیور' کتابی شکل والی ایک خوب صورت سکھ لڑکی تھی... بشیر بدر نے میرا تعارف کرایا۔ محبت سے گلے ملیں۔ مجھے فیض کی نظم 'رقیب' یاد آئی"۔

ہم نے تو یہی سنا تھا کہ بشیر بدر نے شاعری میں جلدی کی تھی' اب معلوم ہوا کہ شادی میں بھی جلد بازی سے کام لیا ہے۔ ہم نے سکھوں کے بے شمار لطیفے سنے ہیں' لیکن وہ سب مَردوں سے متعلق ہیں۔ کسی سکھ عورت سے متعلق لطیفہ پہلی بار سننے میں آیا ہے۔

(۲/ اگست ۱۹۹۰ء)

(۲)

رسالہ "دائرے" علی گڑھ میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے' اِس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارا ادب معاشرے

سے بے تعلق ہو گیا ہے اور ادیب اپنی داخلی دنیا کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے؟ اِس مصرع طرح پر کئی ادیبوں نے طبع آزمائی کی ہے لیکن سب سے عمدہ غزل بشیر بدر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"برسوں سے ہر ماہ میرے پاس اردو، ہندی اور انگریزی میں بے شمار خطوط آتے ہیں اور اُن خطوں میں میری غزل یا کسی شعر کا ذکر ہوتا ہے اور اُس سے خط لکھنے والا دلی تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ جون ۸۶ء سے آج تک میری غزل کی دلی پسندیدگی کے جو خطوط آئے ہیں، اُن میں وید مہتہ ... سے لے کر مراد نگر کے ایک بچے بٹو کا خط بھی شامل ہے۔ سیونتھ اسٹینڈرڈ کا طالب علم ہے۔ ایک خط نیلما اروڑہ کا فیروز پور سے ہے جو انگریزی ادبیات میں ایم اے کر رہی ہے۔ ایک خط پریم کوٹیا کا ہے جو لدھیانہ میں ہندی کی استاد ہے۔ نسیم اختر صاحبہ ہیں جو بمبئی میں رہتی ہیں اور افسانے لکھتی ہیں۔ فرید کوٹ کے ایک ایڈووکیٹ، چندی گڑھ کے ایک ریٹائرڈ افسر کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں سے آئے خطوط صرف دلچسپ ہی نہیں ہیں بلکہ میرے نزدیک معنی خیز ہیں۔ میں آپ کے سوال نامے کا کیا جواب عرض کروں کہ یہ میرا مسئلہ بالکل نہیں ہے۔ آخر میں بزرگ و محترم شاعر رضا واہی نقوی کے خط کا اقتباس درج کرتا ہوں: "ادھر میرے ایک عزیز کراچی سے آئے تھے۔ اُنھوں نے اُن مشاعروں کا تفصیلی ذکر کیا جن میں آپ ..... شریک ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ پاکستان کے ادبی حلقوں کے علاوہ عوام میں بھی یہی چرچا ہے کہ آپ کے کلام میں جو رس ہے، موجودہ دور میں وہ کسی شاعر میں نہیں ملتا۔ بقول اُن کے، آپ پاکستان پر چھا گئے ہیں"۔

بشیر بدر کے اِس خط پر "دائرے" کے مدیر نے یہ حاشیہ چڑھایا ہے: "ہم نے بشیر بدر کو ادب کا سنجیدہ طالب علم سمجھ کر اپنا سوال نامہ برائے اظہارِ خیال بھیجا تھا، اُن کی طرف سے جواباً جو تحریر موصول ہوئی، وہ بعینہٖ پیش کی جا رہی ہے تا کہ دوسروں کو عبرت ہو کہ انا اور خود پرستی انسانی دماغ کے بدترین دشمن ہیں"۔

جناب مدیر نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔ بشیر بدر کو ادب کا سنجیدہ طالب علم سمجھنا خود آپ کی غلطی ہے نہ کہ بشیر بدر کی۔ وہ مشاعرے کے کامیاب شاعر ہیں اور اُن کی اِسی حیثیت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ بشیر بدر ایک کالج میں استاد ہیں، ادب کے استاد کو ادب کا طالب علم بنا دینا بے ادبی ہی نہیں ناواقفیت کی انتہا بھی ہے۔ حاشیے کا آخری جملہ بھی محلِ نظر ہے۔ انا اور خود پرستی انسانی دماغ کے دشمن ہیں تو ہوں، یہاں معاملہ ایک شاعر کا ہے اور شاعر کے دماغ میں

یہی کچھ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، کسی دوسری چیز کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بشیر بدر نے اپنے خط میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس پر جناب مدیر کو چراغ پا ہونے کی ضرورت ہوتی۔ اُنھوں نے تو نہایت مدلل انداز سے مدیر کے سوال کا جواب دیا ہے۔ سوال کا پہلا حصہ یہ تھا کہ ادیب معاشرے سے بے تعلق ہو گیا ہے۔ بشیر بدر جواب دیتے ہیں کہ اُن کا معاشرے سے بذریعہ ڈاک تعلق قائم ہے اور ہر ماہ اُن کے پاس اُن کے پرستاروں کے بے شمار خطوط آتے رہتے ہیں۔ سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ ادیب اپنی داخلی دنیا کا اسیر ہو گیا ہے۔ بشیر بدر فرماتے ہیں کہ یہ بھی درست نہیں۔ وہ تمام موصولہ خطوں کو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اُن کا ایک ایک لفظ حفظ بھی کر لیتے ہیں۔ اگر بشیر بدر اپنی داخلی دنیا کے اسیر ہوتے تو خارجی دنیا سے آنے والے خطوں کو کیوں پڑھتے اور اُن کے مطالب کو حفظ کیوں کرتے؟

بشیر بدر کا خط ہم پاکستانیوں کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ پاکستان پر منشّیات فروش چھائے ہوئے ہیں، اب پتا چلا کہ اِن چھا جانے والوں میں ایک شاعر بھی شامل ہے۔ چوں کہ شاعری کا اور خاص طور پر بشیر بدر کی شاعری کا شمار بھی منشّیات میں ہوتا ہے، اِس لیے مذکورہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے۔

کوئی کچھ بھی کہے، ہم سمجھتے ہیں کہ بشیر بدر اچھے شاعر ہی نہیں، ایک صاف گو آدمی بھی ہیں۔ حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار میں اُن کا ایک انٹرویو، ہندوستان کے کسی اخبار سے نقل ہوا ہے۔ اِس میں انھوں نے حق گوئی و بے باکی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے جس کی کسی دوسرے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اُن سے پوچھا گیا، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: "میرا معاملہ میر اور غالب سے ہے۔ وہی میرے حریف ہیں اور میں اُنھیں اپنا حریف سمجھتا ہوں"۔ ہمارا خیال ہے کہ بشیر بدر نے انکسار سے کام لیا ہے ورنہ میر و غالب کی کیا حیثیت ہے جو اُن کے منھ آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر جس مقام پر ہیں، وہاں کسی دوسرے شاعر کا پہنچنا تو کیا، وہاں سے واپس آنا بھی ناممکن ہے۔

فرماتے ہیں: "میں لمحۂ موجود میں سوچتا ہوں تو فوراً میرا ذہن تین سو سال پیچھے اور تین سو سال آگے جاتا ہے"۔ ہم نے بشیر بدر کا یہ جملہ استاد لاغر مراد آبادی کو سنایا تو اُنھوں نے کہا: "اِس عزیز کو سوچنا نہیں چاہیے۔ سوچنے کے دوران، ذہن کا دو حصوں میں تقسیم ہو کر ہجرت کر جانا اچھی

میرا ہے کہ میری غزل اُس سفر کا آغاز تھی جس میں غزل فارسی کے آئینہ خانے سے نکل کر آپ کے عہد کی جیتی جاگتی دنیا میں نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ ہندوستان کی کئی بڑی اور اہم زبانوں کی شاعری کی آبرو بن جائے گی"۔

اردو غزل کو نیا موڑ دینے والی بات پر ہمیں فراق گورکھ پوری کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک نئے شاعر نے اُن سے کہا: "میں نے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا ہے"۔ فراق صاحب نے فرمایا: "جی ہاں اِسی لیے تو نئی اردو شاعری خاصی مڑی تڑی نظر آتی ہے"۔

بشیر بدر مزید فرماتے ہیں: "نئے الفاظ کی شمولیت سے مجھ سے پہلے لوگوں نے غزل نہیں ہزل لکھی تھی۔ میں جس غیر غزلیہ لفظ کو چھوتا گیا، اُن میں سے اکثر و بیشتر غزل بنتے گئے۔... میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن گیا ہے"۔ بلاشبہہ بشیر بدر سے پہلے کے شاعر جھک مارتے رہے ہیں اور گھاس کاٹتے رہے ہیں، یعنی غزل کے نام پر ہزل لکھتے رہے ہیں۔ ہزل کو غزل بنا دینا بشیر بدر کا ایسا کارنامہ ہے جس پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے۔ اِس زبان کے پاس فخر کرنے کے لائق کوئی چیز نہیں تھی۔ بشیر بدر نے بڑی خوش اسلوبی سے اِس کمی کو پورا کیا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ بشیر بدر لفظوں کو چھو کر غزل بنا دیتے ہیں۔ لفظوں کے اندر جو معنی ہوتے ہیں، اُنھیں وہ اِس لیے نہیں چھوتے کہ بعض نازک چیزیں صرف چھونے سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ موصوف کی اِسی احتیاط پسندی نے اُنھیں صاحبِ اسلوب غزل گو بنا دیا ہے۔

پچاس سال بعد کے قاری کو مخاطب کرتے ہوئے بشیر بدر لکھتے ہیں: "میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد میں جو غزل رواں دواں ہے اُس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا۔ میں نے نئی لفظیات، نئے رویّوں، نئے استعاروں سے نئی غزل کو اِس قدر عام کر دیا کہ حافظ اور سعدی کی نجیب الطرفین غزل ماضی کا وقار ہو کر رہ گئی۔ میں نے اُسے ہندوستانی شجرۂ حسب و نسب دیا۔ میرا یہ جرم ہے کہ غیر غزلیہ اردو کو نازک غزلیہ احساسات کا نغمہ بنا دیا"۔

بشیر بدر نے جس انکسار سے کام لیا ہے، اُس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو "ناچیز" کہا ہے حالاں کہ وہ بہت بڑی چیز ہیں۔ اُنھوں نے "میں دعویٰ کرتا ہوں" کی جگہ "میں اعتراف کرتا ہوں" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہاں "میرا کارنامہ یہ ہے" کہنے کا محل تھا وہاں "میرا جرم یہ ہے" لکھا ہے۔ اِسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "چیز" کو "ناچیز" "دعوے" کو

"اعتراف" اور "کارنامے" کو "جرم" بنا دینے والے نے اردو غزل کو کیا سے کیا بنا دیا ہو گا۔

بشیر بدر کے خط کا اختتام اِن الفاظ پر ہوتا ہے: "آپ میرے شکر گزار ہیں تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ مجھے معتوب سمجھتے ہیں تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے"۔

پچاس سال بعد کا قاری بشیر بدر کا خط پڑھنے کے بعد اِس لائق کہاں ہو گا کہ وہ کسی کا کچھ بگاڑ سکے۔ وہ بے چارہ تو سخت پریشان ہو گا کہ آخر وہ غزلیں کہاں گئیں جن کا بشیر بدر کے خط میں ذکر ہے۔ لہٰذا بہتر ہو گا کہ بشیر بدر محکمۂ آثار قدیمہ والوں سے مشورہ کر لیں۔ وہ ضرور کوئی ایسا طریقہ بتا دیں گے جس پر عمل کر کے غزلوں کو پچاس برس تک محفوظ رکھا جا سکے۔

(۱۴/ اپریل ۱۹۸۸ء)

ایک اور غالب شکن

منفرد طنز و مزاح نگار محمد خالد اختر نے سترہ اٹھارہ برس پہلے غالب کے انداز میں خطوط کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو کئی ادبی رسالوں میں تقریباً دس برس تک شائع ہوتا رہا۔ غالب کے اندازِ تحریر اور اختر کی آرائشِ بیان کے امتزاج سے وجود میں آنے والے ان خطوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اندازِ تحریر سو برس پہلے کا ہے لیکن خطوں کے مندرجات کا تعلق محمد خالد اختر کے زمانے سے ہے۔ بے شمار ادبی' سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ان خطوں میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مکتوب الیہم میں زیادہ تر وہ ادیب ہیں جن سے خالد کے دوستانہ مراسم ہیں۔ چند خطوط تاریخی' سیاسی اور گمنام شخصیتوں کے نام بھی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ رسائل میں مدفون ان خطوں کو کتابی صورت میں "مکاتیبِ خضر" کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ "خضر" مکتوب نگار کا قلمی نام ہے۔

محمد خالد اختر کے طنز میں تلخی نہیں شگفتگی ہے۔ دیباچہ نگار محمد کاظم نے جو خود بھی ممتاز نثر نگار ہیں' درست لکھا ہے کہ "ان خطوط میں مکتوب الیہ کی شخصیت اور کردار کی مناسبت سے ایک خوش طبع چھیڑ چھاڑ بھی ہے' گلہ و شکوہ بھی ہے' طنز بھی ہے' استہزائے خفی بھی ہے اور عہد کے بدلتے ہوئے سیاسی' سماجی اور ثقافتی حالات پر رائے زنی بھی"۔

"مکاتیبِ خضر" کے بارے میں ہم ایک مفصل کالم لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اتفاق سے خود مرزا غالب نے جن کی تقلید خالد نے کی ہے' ایک خط خالد کے نام لکھا ہے جو ڈاک خانے کی غلطی سے ہمارے پاس آگیا ہے۔ مرزا غالب اور محمد خالد اختر دونوں سے معذرت کے ساتھ' ان کی اجازت کے بغیر' یہ خط ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا غالب نے اپنے خط میں جن آرا کا اظہار کیا ہے' ان سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔

سعادت و اقبال نشان، اختر فلک معنی و بیان، محمد خالد المتخلص بہ اختر کو غالب خستہ کا سلام پہنچے۔ تمھاری کتاب "مکاتیبِ خضر" بہ سبیل ڈاک آئی۔ تمھارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں شایان لطف گردانا۔ یہاں بہت سوں سے تمھارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو، ظرافت میں ید طولیٰ رکھتے ہو، یعنی عجیب و غریب ہو۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تقریظ نویس مسمّی محمد کاظم کون ذات شریف ہے۔ میرے زمانے میں چھاپے کی کتاب پر تقریظ وہ لکھتا تھا جو چار دانگ عالم میں نامور ہوتا تھا۔ اب مدح اور بھٹئی کے منصب کے لیے مادّح اور بھاٹ کا مشہور ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہرحال تقریظ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ تم نے میرے انداز و روش میں نامہ نگاری کی کوشش کی ہے۔ اگر تقریظ میں بالصراحت یہ امر ملحوظ نہ ہوتا تو میرے لیے یہ قیاس کرنا بعید از امکان تھا کہ تم میرے مقلد ہو۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی، مومن و صہبائی کو بھی دکھائی، مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی مشورت کی لیکن یہ سب متفق اللسان ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے جو مشقت کھینچی ہے اور جس طرح جگر خون کیا ہے، اس کا مجھ غریب کی نامہ نگاری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات کو چند مثالوں سے ذہن نشین کرو۔ منشی ابن انشا کے نام کے مکتوب میں تم نے لکھا ہے: "ہاں بھئی رہتے تو تم شہر آشوبِ کراچی میں ہو"۔ میں ناہنجار بھلا ایسا کیوں لکھتا کہ مجھے معلوم ہے شہر آشوب رہنے کی نہیں، پڑھنے اور سننے کی چیز ہے۔ مولانا ماہر القادری کے نام کے خط میں تم نے کئی جگہ "قصہ" کی جمع "قصائص" لکھی ہے۔ لعنت ہو مجھ پر اگر میں "قصہ" کی جمع "قصص" کے سوا کچھ اور سمجھوں۔ "قصائص" ارزوئے لُغت غلط ارزوئے لغویت درست۔ اسی خط میں تم لکھتے ہو: "اصل حال اب مجھ پر باز ہوا"۔ بھائی 'حال' کوئی دروازہ نہیں کہ باز ہو۔ 'باز' کے معنی کھُلنے کے ضرور ہیں لیکن استعمال کا موقع و محل دیکھ لینا چاہیے۔ "حسن پرست" کی جمع تم "حسن پرستگان" لکھتے ہو۔ "کندۂ ناتراش" کی جگہ "ناکندۂ تراش" ارشاد فرماتے ہو۔ حیرت ہے کہ تمھیں کوئی ٹوکتا بھی نہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمٰن کے تم بچپن کے یار ہو۔ دیکھو یہ دونوں کیسی عمدہ اردو لکھتے ہیں مگر بے فیض معلوم ہوتے ہیں کہ تم سے صحیح اردو لکھنے کا راز چھپا کے رکھا۔

عزیزی فیض احمد فیض کے نام کے خط میں تم لکھتے ہو: "خبر تمھارے قلمروئے روس کو مراجعت کی دیکھی"۔ میرے زمانے میں "مراجعت" کے معنی "لوٹنے" کے تھے، تم نے ان معنی کو

لوٹا کر "تشریف لے جانے" کے معنی میں لکھا ہے۔ یہ لغوی تصرف تمھاری زبان دانی پر دال ہے۔ "قلمروِ روس" کی جگہ تم نے "قلمروئے روس" لکھا ہے۔ کسرۂ اضافت کی جگہ یائے مجہول لانا' مجہولانہ فعل ہے۔ اسی خط میں تم نے ایک لفظ "خشمگی" لکھا ہے۔ یہ لفظ تم نے کس لغت میں دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی خودساختہ لغت میں دیکھا ہوگا۔ ایسی بے پر کی تو صاحبِ برہانِ قاطع بھی نہ اُڑاتا تھا۔ کیا "خشم" سے غصے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ یہ ویسے ہی ہے کہ جیسے کوئی "غصّہ" سے "غصّگی" بنالے۔

بھائی! میری ان باتوں پر "غصگی" نہ کرنا۔ تمھاری کتاب کا غلط نامہ تیار کرنا مقصود نہیں۔ یہ چند باتیں محض اس لیے لکھ دی ہیں کہ تمھاری کتاب کے پڑھنے والے تمھارے لغوی تصرفات کو میری تقلید کا نتیجہ نہ گردانیں۔

تمھارے تقریظ نگار نے اطلاع دی ہے کہ تمھیں زبانِ اہلِ فرنگ سے بے حد رغبت ہے اور یہی زبان تمھارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ایسی صورت میں زبان اردو سے تمھاری بے اعتنائی بعید از فہم نہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اردو کی بجائے زبانِ اہلِ فرنگ میں کیوں نہیں لکھتے۔ اس زبان میں لکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تمھاری اردو کی غلطیوں پر کسی کی نظر نہیں جائے گی۔ مگر خدا کے لیے دوسروں کی زبان میں ویسے تصرفات نہ کرنا جیسے اردو میں کرتے ہو۔ صاحبانِ فرنگ کے نزدیک یہ امر نامطبوع قرار پائے گا۔

میں نے تمھاری کتاب ازلوح تاتمت نہیں پڑھی کہ اب زیادہ مشقت کھینچنے اور دکھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تاہم کہیں کہیں سے اسے دیکھا ہے۔ باتیں بکھاننے کا ہنر تم خوب جانتے ہو۔ یہ امر مطبوعِ خاطر ہوا کہ تم نے اہلِ مذہب کا مذاق خوب اڑایا ہے۔ جو کام ہم شعرا کلامِ موزوں کی صورت میں انجام دیتے ہیں' وہی تم نے نثرِ ناموزوں میں کر دکھایا ہے۔ کل ملیح آباد کے جوش ملنے آئے تو سامنے تمھاری کتاب رکھی تھی۔ انھوں نے اسے اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام کے خط پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے' یہ منشی مولویوں کی خبر خوب لیتا ہے۔ لیکن جب اپنے نام کا خط پڑھا تو ارشاد فرمایا: "اس شخص کا کوئی اعتبار نہیں، کبھی سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ"۔

بندۂ روسیاہ عرض کرتا ہے کہ سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنا تو مشکل ہے لیکن بعض لوگوں کے ساتھ تم

نے جو ناملائم سلوک روا رکھا ہے، وہ اخلاق کے منافی ہے۔

بھوگ سنانے میں تمھارا جواب نہیں۔ مثلاً الطاف حسین قریشی کو مشورہ دیتے ہو کہ وہ اپنے رسالے کا نام "زندگی" کی بجائے "درندگی" رکھ لے۔ یہ خوش طبعی نہیں گزاف ہے۔ شایستگی کا اقتضا ہے کہ ظرافت اور پھکڑپن میں امتیاز کیا جائے۔

انتظار حسین کے بارے میں بھی تمھاری رائے کی اصابت مظنون ہے۔ تم اسے مشورہ دیتے ہو کہ لاہور میں رہ کر لکھنؤ کو یاد نہ کرے۔ راوی کے کنارے گومتی کو تصور میں نہ لائے۔ تم کون ہوتے ہو یہ مشورہ دینے والے۔ تمھیں کوئی تمھارے وطن بہاولپور سے زبردستی خارج کردے تو پھر قدرِ عافیت معلوم ہوگی۔ مسلمانوں کو اندلس سے نکلے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ وہ آج تک اس کے لیے روتے ہیں۔ کیا قطب مینار اور تاج محل اور دلّی کی جامع مسجد اور لکھنؤ کے قیصرباغ کے لیے چالیس پچاس برس بھی نہیں رویا جاسکتا؟ میاں! ہوش کے ناخن لو اور ایسی باتیں نہ کرو جن کا کوئی سرپیر نہ ہو۔

اور ہاں، یہ مختار مسعود سے تمھیں کیا پرخاش ہے۔ اس کا گلہ رکھتے ہو کہ اس نویسندۂ بے بدل کی کتابیں سفید چکنے کاغذ پر کیوں چھپتی ہیں اور پھر کیوں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ تم اس بے چارے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو۔ کہتے ہو اس نے مینارِ پاکستان کی جو کہانی لکھی ہے وہ خودنمائی کی داستان ہے۔ مینارِ پاکستان مختار مسعود کی نگرانی میں بنا تھا، کیا اسے حق نہیں کہ وہ اپنے حوالے سے اس کی داستان بیان کرے۔ تم مشورہ دیتے ہو کہ مختار مسعود کو ان مزدوروں کا احوال لکھنا چاہیے تھا جنھوں نے اس مینار کو تعمیر کیا۔ یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شاہ نامہ لکھنے پر فردوسی کی تعریف کرے اور تم کہو فردوسی کا کیا کمال ہے، اصل کام اُن اہلِ حرفہ کا ہے جنھوں نے کاغذ بنایا اور روشنائی بنائی اور خامہ بنایا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو فردوسی شاہ نامہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ تم مُقر ہو کہ تمھاری کتاب "کھویا ہوا افق" مہتممِ مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہوگئی۔ اگر ایسا حادثہ مختار مسعود کی کتاب کو پیش نہیں آیا تو یہ حسد کی نہیں شکر کی جا ہے کہ کوئی نویسندہ تو محبوبِ خلائق ہوا۔ تم کچھ بھی کہو، مختار مسعود کی ادبی حیثیت مبطل نہیں کی جاسکتی۔ میری اس گزارش سے تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے مختار مسعود سے کوئی ذاتی علاقہ ہے۔ نا بھائی! میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟

ہائے ظالم! تو نے میرے مخدوم زادے اور خانوادۂ نواب علاء الدین علائی کے چشم و چراغ مرزا جمیل الدین عالی کو بھی نہ بخشا۔ اس کی نثر نویسی کے بارے میں ایسا زہر اگلا ہے کہ میری طبیعت منغض ہو گئی۔ ایسی حالت تو کبھی خود عالی کی نثر پڑھتے ہوئے بھی نہیں ہوئی۔ میاں! کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو' دل سے مہرو آزرم کو نکالتے ہو۔ شنید ہے کہ تمھاری اس کتاب پر جو مہتمم مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہو گئی تھی' عالی نے گلڈ کا انعام دلوایا تھا۔ اس نیکی کا اجر اُس بے چارے کو خوب ملا۔

اچھا اب اجازت دو۔ کوئی بات بری لگے تو معاف کر دینا مگر خدا کے لیے انتقام کے خیال سے میرے اندازِ تحریر میں کوئی اور کتاب نہ لکھ دینا۔ میری جان! اپنا راستہ الگ نکالو تا کہ تمھارے لکھے کو دیکھ کر لوگ یہ کہیں کہ ابداع اِس کو کہتے ہیں' جدتِ طرز اِس کا نام ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمھاری تحریر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ یہ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے میوہ ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے۔ چراغِ بے نور ہے۔

اپنے کرم فرماؤں سے نجات کا طالب

غالب

(۳/اگست ۱۹۸۹ء)

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

انگریزوں نے غیر منقسم ہندوستان کے باشندوں کو ایک طویل عرصے تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا غلام بنائے رکھا۔ اس کامیابی کا سہرا انڈین سول سروس کے سر جاتا ہے جس کے ارکان کی تعداد ایک وقت میں ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔ یہ ہزار ڈیڑھ ہزار افراد ہندوستان کے کروڑوں عوام کی قسمت کے مالک تھے۔ اس سروس میں زیادہ تر انگریز ہوتے تھے لیکن ایک خاص تعداد میں ہندوستانیوں کو بھی لیا جاتا تھا۔ یہ "کالے انگریز" انگریزوں سے بڑھ کر تاجِ برطانیہ کے وفادار تھے۔ یہی نہیں، وہ اپنے ہندوستانی ہونے اور ہندوستانی ماں باپ کی اولاد ہونے پر بھی نادم رہتے تھے، اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ انھیں اُن کے ماضی کے حوالے سے پہچانا جائے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون "آئی سی ایس" میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کے والد کمرے میں بے تکلفانہ چلے آئے۔ ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے انھیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کرایا: "یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں"۔ والدِ محترم کو غصہ آ گیا، انھوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میں اِن کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں"۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ جو لوگ سول سروس کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، وہ لیاقت و صلاحیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوتے تھے۔ یہ سول سروس برطانیہ اور ہندوستان کے بہترین دماغوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے اور خالی اوقات میں بھی کوئی نہ کوئی مفید کام کرتے رہتے تھے۔ برصغیر کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، آثارِ قدیمہ اور

لسانیات پر جتنا اور جیسا کام انگریز سرکاری ملازموں نے کیا' اتنا اور ایسا کام پھر کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ غیر منقسم ہندوستان کے ماضی کی بازیافت سول سروس کے انگریز اراکین کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ برصغیر کی شاید ہی کوئی زبان ہو گی جس کی لغات اور قواعد کی کتابیں ان لوگوں نے مرتب نہ کی ہوں اور شاید ہی کوئی خطہ یا قوم ہو گی جس کی تاریخ انھوں نے نہ لکھی ہو۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں تھی' یہ کام اِن افسروں نے خود اپنے ذوق و شوق سے انجام دیے۔

آزادی کے بعد سول سروس کا یہی ڈھانچا پاکستان کو ورثے میں ملا۔ جو آئی سی ایس افسر پاکستان کے حصے میں آئے وہ کچھ زیادہ تعداد میں نہیں تھے اور اُن میں بھی تجربہ کار اور کارگزار افسر کم تھے۔ چونکہ ایڈمنسٹریشن کا بُرا بھلا تجربہ صرف انھیں کو تھا' اس لیے نئی حکومت پر یہ افسر اِس طرح چھا گئے کہ سفید و سیاہ کے مالک بن بیٹھے۔ سیاست دان اور فوجی طالع آزما اقتدار میں آتے اور جاتے رہے لیکن اصل اقتدار بیوروکریسی کے ہاتھ میں رہا۔ اس طرح بیوروکریسی بھی ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی۔

انگریزوں کے عہد میں تو بہترین دماغی صلاحیتیں رکھنے والے سول سروس میں شریک ہوتے تھے لیکن پاکستان میں اولاً اوسط درجے کی صلاحیتوں والے سامنے آئے اور پھر معیار ایسا گرا کہ معمولی ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے بھی اس نظام کا جزو بنتے چلے گئے۔ ان لوگوں نے ملک کی خدمت کی بجائے خود اپنی خدمت کے اصول پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان میں اعلیٰ سرکاری ملازموں کا ایک ایسا مراعات یافتہ طبقہ وجود میں آگیا جو ایک طرف تو سیاسی جوڑ توڑ میں ماہر تھا اور دوسری طرف اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ناجائز ذرائع سے دولت کمانے کا گُر جانتا تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جو کچھ دفتری اوقات میں کرتے تھے' وہی کچھ فارغ اوقات میں بھی کیا جاتا تھا' اِس لیے پرانے آئی سی ایس افسروں کی طرح علمی کام کرنے کی روایت قائم نہ رہ سکی۔ شیخ محمد اکرام اور ہادی حسین جیسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے' اور اُنھوں نے بھی جو علمی کام انجام دیے اُنھیں آزادی سے پہلے کی تربیت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

سول سروس والوں کی ایک خوبی اور بھی ہے کہ کوئی شخص ریٹائر نہیں ہونا چاہتا۔ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکانے کی عمر میں بھی کرسی پر ٹانگیں لٹکائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچتے ہی

اُن کی ساری توجہ اِس پر ہوتی ہے کہ ملازمت میں توسیع مل جائے۔ ایک دفعہ نہیں دو دو تین تین مرتبہ۔ اور بعض کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ اپنے عہدے پر بحال رہیں۔ معلوم نہیں یہ لطیفہ ہے یا واقعہ کہ ایک سول سرونٹ کی قبر پر اُس کی وصیت کے مطابق جو کتبہ لگایا گیا تھا اس پر نام اور عہدے کے ساتھ یہ عبارت بھی درج تھی: "اوقاتِ فاتحہ خوانی شام چار تا چھ بجے"۔ گویا مرنے کے بعد بھی خصوصی نظام الاوقات کا اہتمام برقرار رہا۔

آخر دم تک عہدے پر رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ملازمت سے حاصل ہونے والی مراعات سے محرومی کا احساس نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ وہ عام شہریوں جیسی زندگی بسر کریں۔ اسی لیے بیشتر اعلیٰ سرکاری ملازم ریٹائرمنٹ کے بعد نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں اپنے ہم پیشہ لوگوں کی مدد سے داخل ہو جاتے ہیں اور پھر وہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بعض اپنی ہوسِ اقتدار کو پورا کرنے کے لیے کھیلوں کے یا علم و ادب سے متعلق اداروں کا رخ کرتے ہیں اور علمی و ادبی کاموں کو بھی کھیلوں ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق مرحوم کہا کرتے تھے کہ پہلوان، طوائف اور سرکاری افسر کا بڑھاپا بہت خراب ہوتا ہے۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ پہلوانوں اور طوائفوں کے بارے میں تو ہمیں کچھ معلوم نہیں لیکن بعض ریٹائر سرکاری افسروں کو ضرور دیکھا ہے جو اٹھتے بیٹھتے اپنے شان دار ماضی کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اِس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی "سامع" مل جائے تو اُسے اپنے ماضی کے سمن زاروں کی سیر کرائیں۔ لوگ اُن سے کتراتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے اپنے اقتدار کے دنوں میں یہ عام لوگوں سے کتراتے تھے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد خیال آیا کہ ہمارے قارئین ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ آج ہم اپنے معمول کے خلاف ایک غیر ادبی موضوع پر اپنا اور اُن کا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ بات درست ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ آج جس کتاب پر اظہارِ خیال کا ارادہ ہے، وہ سول سروس کے ایک سابق رکن کی تصنیف ہے، اس لیے سوچا کہ پہلے اس گروہ کا تعارف کرا دیا جائے جس سے آیندہ سطور کے ممدوح کا تعلق رہا ہے۔

یہ صاحب ادیب کی حیثیت سے تو زیادہ مشہور نہیں ہیں لیکن ایک موقع شناس سرکاری افسر اور دانشور کی حیثیت سے بے مثال شہرت رکھتے ہیں۔ "بے مثال" اِس لیے کہ اُن کی شہرت کے

ڈانڈے رسوائی سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کی روشنیِ طبع کبھی دوسروں کے لیے بلا تھی لیکن ایک ایسا دور بھی آیا جب خود اُن کے لیے بلائے بے درماں ثابت ہوئی۔ امید ہے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارا اشارہ کس کی طرف ہے۔

الطاف گوہر کے صاحبِ علم و فضل اور ذہین ہونے میں کوئی شبہہ نہیں لیکن اس علم و فضل اور ذہانت کو انھوں نے سرکاری ملازمت اور غیر سرکاری خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ان کا اصل میدان ادب تھا لیکن اسی طرف انھوں نے توجہ کم کی۔ نتیجہ یہ نکلا' نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

موصوف نے ایک جگہ سعادت حسن منٹو کے بارے میں لکھا ہے:

" منٹو کی شخصیت کا سب سے بڑا مطالبہ نام پیدا کرنے کا تھا۔ اِس دھن میں اُس نے رہبرِ قوم اور مصلحِ ملت بننے کی بھی بڑی کوشش کی۔ مگر اِس لیے کہ اُس کے پاس کوئی علمی یا فکری نصب العین یا پیغام نہیں تھا' وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس میں نام تو اُس نے پیدا کر لیا مگر اسے اس بات کا احساس ضرور رہا کہ اس کے اصلاحی عمل کو لوگ صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے"۔

اس اقتباس میں اگر منٹو کے نام کی جگہ خود الطاف گوہر کا نام لکھ دیا جائے تو موصوف کی شخصیت کے المیے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

الطاف گوہر میں ادبی صلاحیتیں کس درجے کی ہیں' اِس کا اندازہ اُن کے مجموعۂ مضامین "تحریریں چند" سے ہوتا ہے جو گزشتہ مہینے شائع ہوا ہے۔ اُن کے اندر ایک بہت اچھا نقاد اور شاعر ہی نہیں' طنز نگار بھی چھپا بیٹھا ہے۔

"تحریریں چند" میں نو تنقیدی مضامین' دو شخصی خاکے (مولانا مودودی اور میرا جی) تین تقریباتی تحریریں' ۲۱ نظمیں غزلیں' دو طنزیہ و مزاحیہ مضمون اور ایک افسانہ یا افسانہ نما تحریر ہے۔ شروع میں طویل اور دلچسپ دیباچہ ہے جس سے مصنّف کے ذہنی ارتقا اور شخصی زوال' دونوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

الطاف گوہر پیشہ ور نقاد ہیں نہ ہمہ وقتی شاعر۔ ادب اُن کی زندگی کی ترجیحات میں بھی شامل نہیں۔ اس کے باوجود اُن کی یہ کتاب ایک اہم ادبی تصنیف ہے اور یہ ہر اُس شخص کی نظر سے گزرنی چاہیے جسے ادب سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ایک ایسا اسلوبِ تحریر نظر آتا ہے جو اردو کتابوں میں عام طور پر نہیں ملتا۔ غلط نویسی کے اس دور میں صحیح

اردو میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نظر آجائے تو اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ الطاف گوہر کے اسلوب میں نہ تو مختار مسعود کے اسلوب کی سی جادوگری ہے جو تصنع، ملمع اور آورد سے مرکب ہے اور نہ قدرت اللہ شہاب کی افسانہ وافسوں سے بھرپور سادگی ہے جو اپنی جانب فوراً متوجہ کرلیتی ہے لیکن قاری کے ذہن پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتی۔ الطاف گوہر کا ذخیرۂ الفاظ کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہر طرح کے خیالات کے اظہار پر قادر ہیں۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، نہایت وضاحت سے کہہ دیتے ہیں اور کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی خیال تشنۂ اظہار رہ گیا یا کوئی پیرایہ اظہارِ خیال کی ترسیل میں ناکام رہا۔ الطاف گوہر کے اسلوب کی الگ سے کوئی شناخت نہیں جیسے محمد حسین آزاد یا ابوالکلام آزاد کا اسلوب۔ لیکن ہم اسے اردو کے بنیادی اسالیب میں شمار کرسکتے ہیں جیسے مولوی عبدالحق یا ڈاکٹر عابد حسین کا اسلوب۔

الطاف گوہر نے جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں، ان میں سے بعض "تقویمِ پارینہ" کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً "نوجوان اسکول کا نظریۂ شعر" یا "نئی شاعری کی موت"۔ ان کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ ان سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایسے مضامین بھی لکھے جاتے تھے۔ بعض مضامین "مشقِ سخن" کے ذیل میں آتے ہیں جیسے "قومی ادب اور سرکاری ادب" اور "پاکستانی ادیب کا مسئلہ"۔ ان میں مفروضات کو مسائل بنا کر بات سے بات نکالی گئی ہے۔ ممکن ہے ربع صدی قبل جب یہ مضامین لکھے گئے تھے، اِن کی کوئی اہمیت ہو، لیکن آج اِن میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی۔ صرف پانچ مضامین ایسے ہیں جن سے الطاف گوہر کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے دو میراجی کے بارے میں ہیں اور ایک منٹو کے متعلق۔ باقی دو "طرز اور صاحبِ طرز" اور "طرز اور تجربہ" ہیں۔ اس مختصر کالم میں ان سب مضامین پر الگ الگ گفتگو کرنا ممکن نہیں لیکن ایک مضمون "ایک اور صنم" کے بارے میں اتنا عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ منٹو پر اب تک جو تنقید لکھی گئی ہے، اس میں یہ مضمون منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ الطاف گوہر کا خیال ہے کہ ہماری تنقید نے منٹو کو ایک بُت بنا کر اُس کی پرستش شروع کردی ہے جب کہ ضرورت اس کی ہے کہ منٹو کے اصل جوہر کو پہچانا جائے۔ الطاف گوہر نے منٹو کی شخصیت اور فن کا گہرا مطالعہ کرکے منٹو کے اصل جوہر کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے ہیں کیوں کہ انھوں نے منٹو کی بعض غیرافسانوی تحریروں کی بنا پر بھی ان کے افسانہ نگاری کے فن کو

پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اس مضمون کی اتنی اہمیت بھی کچھ کم نہیں کہ انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر منٹو پر ایک جداگانہ انداز سے نظر ڈالی ہے۔

اس مجموعے کے تین "تقریباتی" مضامین احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے بارے میں ہیں۔ پہلا مضمون الطاف گوہر کی مہمان نوازی کا آئینہ دار ہے کہ ان کے اردو مرکز (لندن) میں قاسمی صاحب تشریف لے گئے تھے۔ اس مضمون کا آغاز اس دلچسپ جملے سے ہوتا ہے کہ لندن میں موسم گرما میں مولوی اور شاعر مرغابیوں کی طرح اترتے ہیں۔ اگر یہ مضمون اسی جملے پر ختم بھی ہو جاتا تو مضمون کے مجموعی تاثر میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔

فیض کے اعزاز میں بھی لندن میں ایک تقریب ہوئی تھی۔ اس میں الطاف گوہر نے ایک مضمون پڑھا تھا جو اِس کتاب میں شامل ہے۔ کسی کو سامنے بٹھا کر اُس کی تعریف کرنا بہت مشکل کام ہے اور یہ مشکل اس وقت بڑھ جاتی ہے جب تعریف کرنے والا میراجی کے دبستان کی دیوار پر لام الف لکھنے کی مشق کرتا رہا ہو اور تعریف سننے والا فیض احمد فیض ہو۔ الطاف گوہر اِس مرحلے سے بہت آسانی سے گزرے ہیں اور اِس شان سے کہ اپنے بعض سابقہ نظریات کی تردید میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ مثلاً ۱۹۶۳ء میں الطاف گوہر نے فیض کی نظم "صبحِ آزادی" کو "وسوسے ابھارنے والی نظم" کہا تھا اور اِس کے حوالے سے اِس پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ہمارا ادیب آزادی کے نادر تجربے میں تخلیقی طرز پر شامل نہ ہو سکا (صفحہ ۱۷۸) لیکن بیس برس بعد فیض کی موجودگی میں الطاف گوہر نے اعلان کیا کہ اس نظم کے پہلے دو مصرعے :

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

"آزادی کی مکمل تصویر" ہیں اور پوری نظم "شاہ کار" کا درجہ رکھتی ہے۔ (ص ۲۸۸)

یہ تضاد بیانی جالب کی کتاب "حرفِ سرِ دار" کے دیباچے میں کچھ اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب الطاف گوہر بہ بانگِ دہل یہ اعلان کرتے تھے کہ انھیں اس نظریے سے شدید اختلاف ہے کہ شاعر کو ارادی طور پر سماج کی بہتری کی خاطر نظمیں کہنی چاہییں۔ (ص ۴۴) اور اب نوبت بہ ایں جا رسید کہ انھیں حبیب جالب کی شاعری میں منصور حلاج کی آواز گونجتی ہوئی نظر آتی ہے اور اُس کی وقتی اور ہنگامی شاعری بھی آفاقی اور دوامی دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں:

"آج بھی جب جالب یہ کہتا ہے :

ظلم کی بات کو جیل کی رات کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

تو اُس کے اپنے شہر ہی میں نہیں، جوہانس برگ کے زندانوں میں بھی قیدی زنجیر بدست رقص کرنے لگتے ہیں"۔ یہاں جالب سے زیادہ خود الطاف گوہر داد کے مستحق نظر آتے ہیں کہ انھوں نے جالب کے دو مصرعوں کی تعریف کرتے ہوئے خود ایک شعر تخلیق کر ڈالا۔ رقص زنجیر بدست ہو سکتا ہے تو قلم بدست کیوں نہیں ہو سکتا!

فیض اور جالب دونوں کی تعریف میں الطاف گوہر نے یکساں مہارت کا اظہار کیا ہے۔ شاید اس قسم کی تحریروں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ فیض والا مضمون جس تقریب میں پڑھا گیا تھا، اس کی وڈیو فلم ہم نے دیکھی ہے۔ الطاف گوہر جس جوش کے ساتھ اپنا مضمون پڑھ رہے تھے، اس کا کوئی اثر فیض پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی جوش میں الطاف گوہر تلفظ کی کوئی غلطی کرتے تھے تو فیض صاحب مسکرا دیتے تھے لیکن اس میں فیض کا کوئی کمال نہیں، وڈیو فلم دیکھتے ہوئے ہم بھی آٹھ دس مرتبہ مسکرائے تھے۔

اس کتاب کے حصۂ نظم میں قیوم نظر ٹائپ کی نظمیں غزلیں ہیں۔ لیکن چند نظمیں اور غزلیں ایسی بھی ہیں جو الطاف گوہر کے اندر چھپے ہوئے ایک طرح دار شاعر کو ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ الطاف گوہر نے سنجیدگی سے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ "اے پیارے لوگو" "داغ" اور "آخری شعلہ" جیسی نظمیں لکھنے والا شاعر میراجی کی روایت کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ الطاف گوہر کی غزلیں روایتی غزلوں سے مختلف ہیں اور اُن کا ایک اپنا انداز ہے۔ خصوصاً وہ دو غزلیں تو بے مثال ہیں جن کے مطلعے یہ ہیں:

دیارِ یار گیا، انتظارِ یار گیا
گیا وہ یار گیا مدتوں کا پیار گیا

ابھی کلیوں میں چٹک، گل میں مہک باقی ہے
دل میں رونق ابھی آنکھوں میں چمک باقی ہے

یہ دونوں غزلیں الطاف گوہر نے بھٹو کے دور میں جیل میں کہی تھیں۔ افسوس کہ جیل میں قیام کی مدت کم تھی، ورنہ اس قسم کی ۲۰۔۲۵ غزلیں کہنے کا موقع مل جاتا تو آج الطاف گوہر ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے پہچانے جاتے۔

اس مجموعے میں زیادہ تر تحریریں ۳۰۔۴۰ سال پرانی ہیں۔ تازہ ترین تحریر کتاب کا دیباچہ ہے اور یہ بھی آٹھ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اس دیباچے میں الطاف گوہر نے اِس صدی کی چوتھی دہائی کے لاہور کا ادبی منظر نامہ پیش کیا ہے۔ اپنے ذاتی اور خاندانی حالات کی طرف اشارے کیے ہیں۔ سرکاری ملازمت سے متعلق دلچسپ واقعات سنائے ہیں۔ ادبی و سرکاری شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ مرحوم مشرقی پاکستان اور کراچی کے قیام کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ مختلف سرکاری عہدوں پر تعیناتی کا تذکرہ کیا ہے۔ خصوصاً اس کا کہ بقول صدر ایوب انھیں "گردن سے پکڑ کر" محکمۂ اطلاعات و نشریات کا سیکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد خود انھوں نے دوسروں کی گردنوں پر کس کس طرح ہاتھ ڈالا۔

اس دیباچے میں رائٹرز گلڈ کا بھی رقیبانہ انداز میں ذکر ملتا ہے اور اُسے مارشل لا کا حامی بتایا گیا ہے لیکن الطاف گوہر نے اپنے قائم کردہ "تھنکرز فورم" کا ذکر نہیں کیا جو رائٹرز گلڈ کے مقابلے پر زیادہ "ناجائز" تھا اور جس کی تعمیر ہی میں خرابی مضمر تھی۔

صدر ایوب کی ۶۵ء کی جنگ کی مشہور تقریر کے بارے میں الطاف گوہر نے بتایا ہے کہ یہ انھوں نے لکھی تھی۔ صدر ایوب کے دور میں اس تقریر کے لکھے جانے کے علاوہ بھی تقریر نویس نے بہت سے "کام" کیے تھے لیکن ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

دیباچے میں کچھ لطیفے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے دو آپ بھی سن لیجے۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں قیوم نظر اور ظہیر کاشمیری ڈائریکٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بہت تاخیر سے آئے تو قیوم نظر نے ان سے کہا: "حضور میری تو کوئی بات نہیں، وہ صاحب (ظہیر کاشمیری) صبح سے میک اپ لگائے بیٹھے ہیں، ان کی پریشانی کا علاج کیجیے"۔ اس لطیفے سے وہی محظوظ ہو سکتے ہیں جو ظہیر کاشمیری کی وضع قطع سے واقف ہوں۔

جن دنوں فیروز خان نون وزیر اعظم تھے، پروفیسر ایس ایم شریف نے ان سے درخواست کی کہ انھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین بنا دیا جائے۔ نون صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ

آپ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ شریف صاحب کو تاؤ آگیا' فرمایا: اگر آپ صلاحیت کے بغیر وزیر اعظم بن سکتے ہیں تو میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا چیئرمین کیوں نہیں بن سکتا۔

"تحریریں چند" کا دیباچہ بے حد دلچسپ ہے۔ کاش الطاف گوہر اسی انداز سے مفصل آپ بیتی لکھ ڈالیں۔ "شہاب نامہ" کے بعد "الطاف نامہ" ضرور منظر عام پر آنا چاہیے۔ الطاف گوہر نے وزارت اطلاعات و نشریات کا چارج قدرت اللہ شہاب سے لیا تھا۔ لہٰذا شہاب صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آنے والی نسلوں کو "مصدقہ اطلاعات" کی فراہمی ان کا فرض ہے۔ دیکھیے الطاف گوہر اس فرض سے کب سبک دوش ہوتے ہیں۔

آخر میں میراجی کے شخصی خاکے کا ایک اقتباس بلا تبصرہ پیش کیا جاتا ہے: "میں ایک ملازمت کے ایک انٹرویو کے سلسلے میں دلّی گیا۔ ریڈیو اسٹیشن پر میراجی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا' یہ جو سوٹ آپ نے پہن رکھا ہے چوں کہ مانگا ہوا معلوم ہوتا ہے لہٰذا پچاس نمبر تو اسی کے کٹ جائیں گے۔ انٹرویو کے کمرے کے باہر ہم لوگ بیٹھے تھے اور میراجی دن بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہر ایک کو کامیابی کے گُر سمجھاتے رہے۔ اسی موقع پر انھوں نے ضیا جالندھری سے کہا تھا کہ ضیا صاحب' انٹرویو کے دوران آپ عقل استعمال نہ کیجیے بس سیدھے سادے جواب دیتے جایئے"۔

(۱۲و۲۶/ مئی ۱۹۸۸ء)

دامنِ یوسف یا دامنِ تار تار

فیض احمد فیض بلاشبہہ اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں۔ غالب و اقبال کے بعد وہی ایک شاعر ہیں جنھیں برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ فیض کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے شعروں، مصرعوں اور شعری ترکیبوں کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں جیسے یہ مالِ غنیمت ہو۔ فیض کے کلام کو مالِ غنیمت سمجھنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ بلکہ ہم نے تو ہمیشہ خود فیض صاحب کو بھی مال غنیمت سمجھا اور اُن کے بارے میں بیسیوں "سخن گسترانہ" کالم لکھے۔ فیض صاحب سے ہمیں نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ ہمارے بہت سے کرم فرما ہمارے کالموں کے حوالے سے فیض صاحب کے کان بھرتے تھے لیکن مرحوم نے ان باتوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ہمیشہ ہم سے محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے اور یوں ہمیں فیضیات میں مضامینِ نو کے انبار لگانے کے مواقع ملتے رہے۔

فیض کے انتقال کے بعد ہم نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ فیض پر لکھنے کا مزہ تو اُن کی زندگی میں ہی تھا۔ مگر آج ہم اپنی اس روایت کو توڑ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے دوران احساس ہوا جیسے فیض صاحب ہمارے درمیان موجود ہوں اور ہم انھیں چلتے پھرتے ہی نہیں دوسروں کو ٹہلاتے بھی دیکھ رہے ہوں۔ فیض پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آیندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن اس وقت جو کتاب ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کتاب کبھی نہیں لکھی گئی اور شاید آیندہ بھی نہ لکھی جائے۔

اس کتاب کا نام ہے "دامنِ یوسف" اور یہ تالیفِ لطیف ہے محترمہ سرفراز اقبال کی۔ محترمہ نے اپنے نام فیض کے خطوں کو ان کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کی آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئی ہے' ایک ایسی آپ بیتی جسے فیض کی سوانح حیات کا ایک باب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز فیض کے اس معنی خیز شعر سے ہوتا ہے:

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

محترمہ سرفراز اقبال کون ہیں؟ زیرِ نظر کتاب میں شامل خطوں کے حوالے سے عرض ہے کہ وہ ایک ادب نواز خاتون ہیں جن کے ہاں شاعروں فن کاروں اور دوسرے معززین کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ان کا دولت خانہ ادب و فن کا مرکز ہے۔ محترمہ کے ہاں کی محفلوں کا تذکرہ ابن انشا نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اِسی کتاب میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "آپ کو محفل آرائی اور دوست نوازی اور دیگر آرائیوں اور نوازیوں سے فرصت نہیں تھی تاہم' ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے .... آپ کے سول اور ملٹری دوستوں کا کیا احوال ہے۔ افسوس کہ آپ کا گھر چھوٹا ہے لیکن سامنے کا پلاٹ خالی ہے۔ وہاں شامیانے لگوا کر ہر روز صبح کو آپ کو اپنا دربار بھی منعقد کرنا چاہیے اور نذریں وصول کرنی چاہییں اور خلعت و انعام تقسیم کرنے چاہییں۔ حد ہے اتنے دنوں سے وہ جگہ خالی ہے اور آپ لوگوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے کچی آبادی نہیں بنایا جو کبھی نہ کبھی تو مستقل ہوتی"۔

محترمہ نے خود اپنا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے: "بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ دوستی' محبت' عشق' چاہت یہ سب کیا ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکی۔ ممکن ہے بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور سننا اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ کاش کبھی مجسم ہو کر مجھ سے ملنے آئیں' میں انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں اور پھر ان کی باتیں سنوں' سنتی جاؤں' سنتی ہی جاؤں حتیٰ کہ سننے سنانے کے لیے کچھ باقی نہ رہے۔ آوازیں ختم ہو جائیں' کمرہ خالی رہ جائے"۔ (ص ۱۰۷)

وہ بقول خود' اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے فیض کو خط لکھا کرتی تھیں اور اسی خط نگاری کے نتیجے میں زیرِ نظر کتاب وجود میں آئی' اور یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر پڑھی جائے۔

محترمہ پہلی مرتبہ احمد فراز کے ذریعے فیض صاحب سے متعارف ہوئیں۔ فون پر بات چیت ہوئی۔ وہ اس پہلی بات چیت میں فیض سے کہنا چاہتی تھیں: "مرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو" مگر نہ کہہ سکیں۔ (شاید اس لیے کہ کہیں احمد فراز یہ نہ سمجھے کہ روئے سخن اس کی طرف ہے۔) اس غائبانہ ملاقات کا محترمہ پر کیا اثر ہوا' اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیجیے: "فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں یا پھر اُڑتے بادلوں کی نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں"۔ (ص ۲۰)

بادلوں کی نرماہٹ سے دیواروں پر کسی کا نام لکھنا ایک نیا اور اچھوتا خیال ہے۔ بلاشبہ فیض بہت بڑے شاعر تھے لیکن خیال کی ایسی ندرت تو اُن کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔

کچھ عرصے بعد کراچی میں پہلی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری ملاقات پشاور کے ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں احمد فراز محترمہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس ملاقات کا حاصل یہ مصرع تھا جو فیض نے ایک کاغذ پر لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے محترمہ کو پیش کیا :

فراز اوج پہ پہنچے تو سرفراز ہوئے

محترمہ کا بیان ہے کہ: "فراز آج تک اس مصرع کی تاب نہ لا سکا"۔ اس ملاقات کا محترمہ پر جو اثر ہوا' وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے: "اگلے روز میں راولپنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لیے اس روشن ستارے کی مانند تھے' اندھیری رات کے مسافر جس سے رہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی مجھے کوئی مشکل ہو گی میں ان سے ضرور مشورہ کروں گی کیوں کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھے یوں محسوس کر سکتا ہے جیسے میں خود کو محسوس کرتی ہوں"۔ (ص ۲۵)

اس کے بعد خطوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں محترمہ کی باتیں بھی جاری رہتی ہیں۔ کہیں وہ کسی خط کا پس منظر پیش کرتی ہیں، کہیں کسی غیر واضح جملے کی تشریح کرتی ہیں، کبھی فیض صاحب سے اپنی کسی ملاقات کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ اندازِ بیاں اتنا خوب صورت ہے کہ کہیں کہیں تو فیض کی شاعری محترمہ کی نثر کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی ہے۔ محترمہ کی عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ فیض کے بعض سرسری اور بے مزہ خطوں کو بھی اپنی توضیح و تشریح سے ادب پارہ بنا دیتی ہیں۔

اس کتاب میں فیض کے کل ۵۶ خطوط ہیں۔ چند خط محترمہ کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ تین چار کے علاوہ باقی سب خط مختصر ہیں لیکن ان کے اختصار میں ایک جہانِ معنی نظر آتا ہے۔ ابتدائی دو چار خط "عزیزی" سے شروع اور "فقط" پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کے خطوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کی ابتدا سے پہلے اور اختتام کے بعد بھی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے اور بین السطور میں جو کچھ ہے، اس سے استفادہ کرنے کے لیے چشمِ بینا کی نہیں ذہنِ رسا کی ضرورت ہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ ہے، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیجیے:

"جو تم نے لکھا ہے، کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے۔ یعنی جہاں تک بد عادتوں کا تعلق ہے، تمھاری عادت ہمیں بھی کچھ اتنی پڑ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی، صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی، کا مضمون ذہن میں آتا ہے"۔ (ص ۶۱)

"... تمھارے لیے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمھیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں، تم میاں سے مہینے بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آجاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمھیں صحیح و سالم واپس کر دیں گے"۔ (ص ۶۶)

"تم نے ہمیں ٹی وی پر دیکھ لیا لیکن ہم کیسے دیکھیں۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر رکھنی چاہیے اور، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ اس سے زیادہ آرام دہ صورت تو یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ لی جائے، لیکن وہ تو تصویر ہوئی، اس سے بات

کیسے کی جائے یا اس کی آواز کیسے سنی جائے"۔(ص ۸۸)

"تمھارا کہنا غلط ہے کہ تمھیں ملاقات کی ہم سے زیادہ طلب ہے۔ تمھارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سا سامان موجود ہے (خواہ اس سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ کیوں نہ ہوتی رہے) یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے... اسی وجہ سے ہم دامن چھڑا کر اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے نمبر ۱۰۴ اور اب سنا ہے کسی نئے تاج محل میں ہے"۔(ص ۹۱) (محترمہ کے پرانے مکان کا نمبر ۱۰۴ تھا' نئے تاج محل سے مراد نیا مکان ہے)

"ہم نے تمھاری عادتیں بگاڑ دی ہیں تو یہی شکایت یہاں تم سے بھی ہے اور اسی بگاڑ کی وجہ سے اپنا کمرہ اور اپنا بستر زیادہ یاد آتا ہے"۔(ص ۹۵)

"کراچی سے روانگی سے پہلے تمھاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمھارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا۔ ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تاکہ سند رہے اور تم بھاگ نہ سکو"۔(ص ۱۱۴)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فیض کی عادتیں کس حد تک "بگڑ" چکی تھیں اور آخری اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ محترمہ کے خطوط بنام فیض ادبِ عالیہ کا نمونہ تھے۔ افسوس کہ فیض نے نہ جانے کن اندیشہ ہائے دور دراز کی وجہ سے محترمہ کے سارے خطوط ضائع کر دیے اور ایک خط جو بطور سند کے یا محترمہ کو "بھاگنے" سے روکنے کے لیے محفوظ رکھا تھا' وہ بھی معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ کاش محترمہ اپنے خطوں کی نقلیں اپنے پاس رکھ لیتیں تو اُن کی شمولیت سے کتاب دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہوجاتی۔ سہ آتشہ اس لیے کہ ایک آگ پڑھنے والے کے دل میں بھی تو بھڑک اٹھتی!

فیض کی شاعری میں "رشک" کا مضمون ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔ وہ اتنے فراخ دل ہیں کہ رقیب سے مفاہمت کرلیتے ہیں۔ یعنی سانجھے کی ہنڈیا کے چٹخارے لیتے ہیں۔ لیکن ان خطوں میں معاملہ برعکس ہے۔ ذرا دیکھیے غالب کی طرح فیض کس کس انداز سے "رشک" کا مضمون باندھتے ہیں'

رقیبوں پر نظر رکھنے کے لیے جاسوس مقرر کرنے کی سوچتے ہیں :

" تمھیں نیا گھر مبارک ہو۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا... اس میں ہمارا کوئی کمرہ ہو گا۔ خیر کبھی وہ بھی ہو جائے گا لیکن اگر تمھارا ریٹائر ہونے کا ابھی ارادہ نہیں تو اس دوران میں کیا ہو گا۔ خالد سعید بٹ کو لکھتے ہیں کہ جاسوسی کے فرائض انجام دے"۔ (ص ۷۵)

"تم نے ہمارے دوست میر (علی احمد تالپور) صاحب کو بھی دریافت کر لیا۔ بھلا تم سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ لیکن کسی خوب صورت عورت کو میر صاحب کی رکھوالی میں دینا تو گوشت اور بلّی والا معاملہ ہے"۔ (ص ۸۲)

"غلط قسم کے دوست چُننے میں جو تمھیں مہارت حاصل ہے' اس کا کچھ علاج ضرور ہونا چاہیے۔ مسکرا کر خیر مقدم کرنے تک تو ٹھیک ہے' لیکن اگر مسکرانے کا انداز ہی ایسا ہو کہ..... کسی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں تو اِس میں کسی کی کیا خطا۔ اس کے جواب میں تم کہو گی کہ ہم کیا کریں' ہماری صورت ہی ایسی ہے' تو وہ بات بھی ٹھیک ہے"۔ (ص ۱۰۳)

"رشک" کے معاملے میں محترمہ بھی فیض سے کم نہیں۔ فیض نے ایک خط میں کسی خاتون سے ملاقات کا ذکر کیا' اس کی باتیں انھیں پسند آئیں اور اُن باتوں پر ایک گیت لکھ دیا۔ یہ گیت انھوں نے محترمہ کو بھیجا۔ محترمہ نے لکھا: "میں بھی تو باتیں کرتی ہوں"۔ اس کے جواب میں فیض لکھتے ہیں: "تم نے چاہنے والوں کا ذکر کیا ہے' وہ تو ہیں اور اللہ انھیں خوش رکھے' لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے' نہ مل سکتا ہے جو حسن اتفاق سے وہاں میسر آگیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو۔ تم اچھی ضرور لگتی ہو' لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے"۔ (ص ۸۴)

خطوں کی تو نیجی عبارتوں میں محترمہ نے بھی جگہ جگہ شاعری کی ہے۔ مثلاً:

"میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھ سے ملیں تو میں ان کو یہ خط واپس کر دوں... لیکن میں

ایسا نہ کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ حصہ واپس لے لو جو ندی کے پانی کی بجائے اداس ہوا میں تیرتا جارہا ہے"۔ (ص ۲۹)

"فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لیے اس سنگِ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزرتے ہیں"۔

"فیض کو الوداع کر کے .... جہاز کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا، مجھے اپنا وجود جہاز کے پیچھے اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس وقت میرا جی چاہا میں بھی ایک پرندہ ہوتی...." (ص ۵۷)

(یکم مارچ ۱۹۸۹ء)

(۲)

دامنِ یوسف فیض کے سدا بہار خطوں کا مجموعہ ہے۔ فیض شاعری میں نئی طرزِ سخن کے موجد تھے ہی، نثر میں بھی انھوں نے ایک نئے انداز و اسلوب کی بنیاد رکھی ہے۔ کوئی تعجب نہیں، آگے چل کر، غالب کی طرح فیض بھی اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ زیرِ نظر خطوں کے حوالے سے یاد رکھے جائیں۔ فرق یہ ہے کہ غالب:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

پر عامل تھے۔ فیض کا کوئی خط اور خط کا کوئی جملہ بھی بغیر "مطلب" کے نہیں ہے۔ غالب نے خط دل لگا کر لکھے تھے، فیض نے خطوں میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

اوپر کہیں ہم نے عرض کیا ہے کہ اس مجموعے میں محترمہ سرفراز اقبال کے بچوں کے نام فیض کے جو دو چار خط ہیں، ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ ایک بچے نے اپنے خط میں محترمہ کے حوالے سے فیض صاحب کو بے وفائی کا طعنہ دیا۔ ماشاء اللہ کتنا سمجھ دار اور معاملہ فہم بچہ ہے! اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں: "امی سے کہہ دینا یہ بے وفائی نہیں دنیا داری ہے"۔ (ص ۳۲) ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے: "امی کے خط مل گئے ہیں تم جواب میں ہماری طرف سے پیار کر لینا"۔ (ص ۴۴) اسی طرح یہ جملہ بھی بیک وقت خوشی

اور غم کا آئینہ دار ہے: "تم نے امی کا جو حال لکھا ہے' اسے پڑھ کر کچھ اداس بھی ہوں' لیکن دل کچھ خوش بھی ہوا کہ ہمیں کوئی یاد تو کرتا ہے"۔ (ص ۶۰)

فیض بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں اور اُن سے انھیں کی سطح پر آکر باتیں کرتے ہیں: "امی سے تم نے مقابلہ کب سے شروع کیا ہے۔ تم نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی یاد کرکے رو بھی دیا کرتی ہیں لیکن تم نے کتنے آنسو بہائے ہیں"؟ (ص ۶۲)

فیض کے خطوں پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن ابھی ہمیں ابن انشا اور سید سبط حسن کے خطوں کا ذکر بھی کرنا ہے' اس لیے فیض کے خطوں کی صرف ایک اور خصوصیت بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے اور وہ ہے ان کا مزاحیہ انداز۔ ایک مرتبہ محترمہ حج کرکے آئیں تو فیض نے انھیں لکھا: "خوشی کی بات یہ ہے کہ تمھارے نو سو تو پورے ہوگئے۔ اب اگلے نو سو ہونے تک تمھیں کافی لمبی چھٹی ہے"۔ (ص ۱۰۸) اپنی اور محترمہ کی عمروں کے حوالے سے یوں گل افشانی ہے:

"تمھیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو... تمھیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے اور تمھاری یہی صورت رہی تو اُن کی اولادوں کو بھی۔ البتہ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منھ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ بلکہ اب ہم دہلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہوگیا۔ اگرچہ یہ بات تم سے نہیں کرنی چاہیے"۔ (ص ۸۸)

محترمہ جب پہلی مرتبہ نانی اماں بنیں تو فیض صاحب نے جو برسوں پہلے نانا ابا بن چکے تھے' انھیں مبارک باد کا خط لکھا۔ یہ خط نانا نانی کے باہمی ربط کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے:

"..... آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے لیے ایک 'گرینڈ مدر' کا بیج بنوا لو جو بوقتِ ضرورت سامنے لگا لیا کرو لیکن خیر نانی پن سے تم میں کیا فرق آئے گا۔ البتہ اب ہم واقعی ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمھارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا"۔ (ص ۱۰۳)

مختصر یہ کہ فیض کے خط بہت اہم ہیں۔ اردو کے پس ماندہ اور درماندہ محققین کے لیے یہ ایک نیا موضوع ہے' اب وہ برسوں ان خطوں پر تحقیق کرتے رہیں گے۔ خود محترمہ کے نزدیک ان خطوں کی

اہمیت کیا ہے' اس کا اندازہ اُن کے اِن الفاظ سے کیجیے : "میں جب فیض صاحب کے ان خطوں' ان کی باتوں' ان کے لفظوں اور ان کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں یہی میرا زادِ سفر ہو گا اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان ایمان کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب میری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہو گی تو حدِ نظر پر کسی مقدس سمت سے اچانک کوئی خوشبو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی۔ ارے بھئی میرے خط کہاں ہیں؟ وہیں دنیا میں چھوڑ آئی ہو--------- کیا ایسا ممکن ہے؟ کاش ایسا ممکن ہو"۔ (ص ۱۸۸)

فیض کے خطوں کے اس مجموعے میں ابن انشا اور سید سبط حسن کے بھی چند خطوط شامل ہیں۔ ممکن ہے ان دونوں کے اور خطوط بھی ہوں جو الگ الگ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوں۔ زیرِ نظر کتاب میں صرف وہی خطوط ہیں جن کا تعلق فیض صاحب سے ہے۔ پہلے ذرا ابن انشا کی استادانہ نثر کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمایئے :

"فیض صاحب کے واپس آجانے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ' چاند اپنی جگہ' چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لیے ستارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے' چاند بھی ایک ہے اسے کوئی کہاں تک گنے گا"؟ (ص ۳۶)

"اس دورِ الفت میں دیکھنا اپنے ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا۔ یہ ہر قسم کی چوری پر کاٹا جا سکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہییں"۔ (ص ۳۷)

".....اب تو میرا تعارف اس حیثیت سے کرایا جاتا ہے کہ ان سے ملو' یہ معمولی آدمی نہیں ہیں' یہ بیگم سرفراز اقبال کے جاننے والے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب اس شخص کا نام فیض' قدرت اللہ شہاب وغیرہ کی فہرست میں آتا ہے تو یہ بھی کچھ تو ہو گا۔ ایسے ویسے کو تو بیگم اقبال منہ لگانے سے رہیں۔ میں آپ کا Fan ہوں"۔ (ص ۳۹)

ابن انشا تو خیر مزاح نگار تھے' ان سے اس قسم کی باتیں غیر متوقع نہیں لیکن خدا جانے سید سبط حسن جیسے سنجیدہ آدمی کو کیا ہوا کہ انھوں نے فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد اُن کی "متروکاتِ سخن" کو "متروکاتِ منقولہ" سمجھ کر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے فیض کے انتقال پر تعزیت بھی محترمہ ہی سے کی۔ تعزیتی خط کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں: "میرے اچھے دوست! محبت بہت لطیف بہت پاکیزہ جذبہ ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں' قدرت جن کو یہ جذبہ عطا کرتی ہے۔ وہ ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ نہ کسی سے محبت کرپاتے ہیں نہ کوئی ان سے محبت کرتا ہے۔ مگر آپ تو اُن خوش قسمت اور خوش خصلت انسانوں میں سے ہیں جن کو محبت کرنا آتا ہے۔ مجھ کو کبھی کبھی فیض صاحب پر رشک آتا تھا' ان کو کتنا پیار اچاہنے والا ملا ہے۔ مگر وہ تو خود بہت ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ دل داری کی صلاحیت کہاں' لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو جہاں تک ممکن ہو' ہلکا کر دوں یا بانٹ لوں"۔ (ص ۱۲۱)

سید صاحب نے غموں کو ہلکا کرنے یا بانٹنے کی بات محض تکلفاً نہیں لکھی۔ وہ واقعی غم کی تصویر بن گئے: "میری مہربان دوست! خوش رہو۔ مگر تم بتاؤ یہ کوئی دوستی ہوئی کہ نہ خط نہ ٹیلی فون نہ تصویریں جن کا تم نے وعدہ کیا تھا۔ اب میں صبح شام اپنے ڈاک کے ڈبے کھولتا ہوں کہ شاید تمھارا کوئی خط ہو مگر ناکامی ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم فیض صاحب کا احسان کبھی نہ بھولیں گے جن کی بدولت تم سے ملنا نصیب ہوا' ورنہ اتنے بھرے دربار میں اس فقیرِ گوشہ نشین کی رسائی محال تھی۔ کئی دن سے تم بہت یاد آرہی ہو۔ کل جی بہت گھبرایا تو "نسخہ ہائے وفا" کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پھر شعر گنگناتے گنگناتے کچھ مصرعے بننے لگے۔ بس تُک بندی کی ہے اور شاعری کا خون کیا ہے۔ بہرحال جس کی یادوں نے یہ الٹے سیدھے شعر کہلوائے ہیں اسی کی نذر ہیں"۔ (ص ۲۲۴)

سید سبط حسن اور شاعری؟ جی ہاں انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری نظم ایک ادبی "شاہ کار" ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمایئے اور اِس کی داد دیجے کہ سید صاحب نے بارھویں مصرے میں محترمہ کا نام کس خوب صورتی سے استعمال کیا ہے:

میرے محبوب کے ہونٹوں کی مٹھاس
میرے محبوب کے ہونٹوں کی حرارت

لب گویا! تری شیرینیِ گفتار کہاں سے لاؤں؟
تیرا اندازِ تکلم، جس سے خوش بوئے وفا آتی ہے
چاہت کی مہک، پیار کے پھول
الفت و مہر کا مژدہ لائے
عہد و پیمان کا نغمہ جن کو
میرے کانوں نے سنا، میری آہوں نے سنا
اور قلبِ مضطر نے تسلی پائی

میرے غم خانے میں یہ کون آیا
آیا اور درد کا درماں بن کر
مجھ کو سرافراز کیا
خوشبوؤں کا در باز کیا

اور اب یادوں کی سب رنگ دھنک
تجدیدِ ملاقات کا ارماں بن کر
ان کی بانھوں کی طرح
میری فرقت کے شب و روز کو
اپنی آغوشِ محبت میں سکوں بخشتی ہے

فیض صاحب نے اپنے خطوں میں نثر میں شاعری کی ہے۔ سید صاحب نے شاعری میں نثر لکھی ہے۔ پہلے کام کی طرح یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔

سید صاحب نے محترمہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے ایک خط میں بیگم ایلس فیض کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے: "ایلس کی بے رخی کا شکوہ فضول ہے۔ وہ فیض صاحب کی کسی چاہنے والی کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ یہ ان کا احساس کمتری ہے جس کا کوئی علاج ہم

نہیں۔ آپ اپنا دل میلا نہ کریں"۔(ص ۱۲۱)

محترمہ ایلس فیض کی نظر سے جب یہ الفاظ گزریں گے تو انھیں رنج ہو گا کہ فیض کا ایک اتنا قریبی دوست ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا تھا۔ ہماری دلی ہمدردیاں بیگم فیض کے ساتھ ہیں لیکن ہماری ہمدردیوں سے کیا ہوتا ہے! سنا ہے بیگم سرفراز اقبال کے پاس فیض کے کئی اور قریبی دوستوں کے خطوط بھی ہیں۔ جب یہ خطوط شائع ہوں گے تو معلوم ہو گا کہ فیض کیسے کیسے دوستوں کے درمیان زندگی بسر کر گئے!

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام "دامنِ یوسف" کی بجائے "دامنِ تار تار" ہونا چاہیے کیونکہ اس کے ہر صفحے پر "دستِ زلیخا" کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکیِ داماں کی حکایت بیان کی گئی ہے' اس لیے وہی نام درست ہے جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز تو فریقین کا طریقۂ واردات ہے اور پڑھنے والوں کو اسی سے سروکار رکھنا چاہیے۔

ایک قاری نے یہ شکایت کی ہے کہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۲۶ صفحات ہیں اور قیمت ۷۰ روپے ہے۔ ناشر نے زیادہ صفحات کا تاثر دینے کے لیے کتاب کے آخری چار صفحات میں نمبر شمار میں سو کا اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ۱۲۶ صفحات ۲۲۶ ہو گئے ہیں۔ محترم قاری کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کتاب ہرگز مہنگی نہیں ہے۔ ۷۰ روپے دراصل اس تصویر کی قیمت ہے جو کتاب کے عقبی سرورق پر چھاپی گئی ہے جس میں فیض صاحب شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے پلنگ پر نیم دراز ہیں اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے کوئی اور بھی موجود ہے۔ ستر روپے میں یہ تصویر خریدیے' کتاب اس کے ساتھ مفت ملے گی۔

(۸/ مارچ ۱۹۸۹ء)

علّامہ اقبال کے گھوڑے کا شجرۂ نسب

تحقیق ایک خشک اور بے مزہ کام ہے۔ ہم سے تو کسی تحقیقی مقالے کے دو صفحے بھی پڑھے نہیں جاسکتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ محقق حضرات پانچ پانچ سو صفحے کی کتابیں کیسے لکھ دیتے ہیں۔ کسی پرانے شاعر کے دیوان کو پڑھیے تو اُس میں دو چار شعر کام کے ضرور مل جائیں گے، لیکن اُسی شاعر کے بارے میں کوئی تحقیقی مقالہ پڑھا جائے تو معلوم ہو گا کہ شاعر نے کام کے دو چار شعر کہہ کر اپنا وقت ضائع کیا تھا، کیوں کہ وہ تو دنیا میں آیا ہی اِس لیے تھا کہ کسی محقق سے اپنا سالِ وفات متعین کرا سکے۔ یہ شاعر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ شعروں میں ہر بات بیان کر دیتے ہیں، لیکن اپنا سالِ وفات نہیں بتاتے۔ اتنی ذرا سی بات کو چُھپانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محققوں کو اُن کے سال ہائے وفات معلوم کرنے میں اپنی عمریں ضائع کرنی پڑتی ہیں۔

کسی شاعر کا سالِ وفات معلوم کرنا بظاہر سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اِس سادہ سی بات کی تہ تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے تو محقق کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ شاعر کا کوئی سالِ پیدائش بھی ہے کیوں کہ کسی کا سالِ پیدائش معلوم نہ ہو تو اِس کی پیدائش مشکوک ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے جو شخص پیدا ہی نہیں ہو گا اُس کا مرنا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا محققین پہلے کسی شاعر کے پیدا ہونے کے شواہد پیش کرتے ہیں اور پھر اسے کیفرِ کردار تک پہنچاتے ہیں، یعنی اُس کی وفاتِ حسرت آیات کا ذکر کرتے ہیں۔

پیدائش اور وفات کے درمیان بھی بہت سے واقعات تحقیق طلب ہوتے ہیں۔ مثلاً شاعر نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی یا تلمیذ الرحمٰن ہونے پر قناعت کی۔ دہلی سے لکھنؤ تک کا سفر پیادہ پا کیا یا بیل گاڑی سے؟ بیل گاڑی میں اُس کے ساتھ بیلوں کے علاوہ اور کون کون تھا۔ اُس نے اپنے کلام

پر کس سے اصلاح لی۔ کردار کے سلسلے میں اصلاح کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی؟ الغرض اِس قسم کے بے شمار مسائل زیرِ بحث آتے ہیں، تب کہیں جا کر متعلقہ شاعر کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایسے سنجیدہ، بے مزہ اور خشک اسلوب میں ہوتا ہے کہ قاری کو شاعر کی وفات سے زیادہ اُس کی پیدائش پر افسوس ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تحقیق صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو زندگی سے بیزار ہوتے ہیں یا جنھیں مزید تحقیق کرنی ہوتی ہے۔ "مزید تحقیق" سے مراد یہ ہے کہ جب ایک محقق کسی شاعر کی وفات کا سنہ دریافت کرتا ہے تو دوسرا مہینہ بتاتا ہے۔ تیسرا اِس کا کھوج لگاتا ہے کہ اُس مہینے کی کس تاریخ کو یہ سانحہ گزرا تھا۔ چوتھا محقق یہ راز فاش کرتا ہے کہ شاعر کا انتقال کتنے بج کر کتنے منٹ پر ہوا تھا۔ پانچواں محقق پہلے چار محققوں کی تحقیق کو غلط ثابت کر کے از سرِ نو تحقیق کا اہتمام کرتا ہے۔ گویا تحقیق ایک ایسا کام ہے جو ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تحقیق کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو کوئی معقول کام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آج سے دس پندرہ برس پہلے یہ خیال درست ہو لیکن جب سے ڈاکٹر سعید اختر درانی نے ادبی تحقیق سے دلچسپی لینی شروع کی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ باصلاحیت لوگ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر درانی ہمارے ملک کے ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سائنس دان ہیں۔ سائنس کے میدان میں اُن کے تحقیقی کاموں کو ساری دنیا میں سراہا گیا ہے۔ خصوصاً اُس تحقیق کا بڑا چرچا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے "مہتابی مواد" پر کی ہے۔ یہ مواد وہ ہے جو روسی اور امریکی ماہ نورد چاند سے لائے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کئی بین الاقوامی سائنسی اداروں کے تحقیقی منصوبوں سے منسلک ہیں۔ اِس سے اُن کی مصروفیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنی مصروفیات کے باوجود بھی وہ ادبی کاموں کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر ڈاکٹر صاحب ادبی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے یورپ کے بعض اداروں میں اور افراد کے پاس علامہ اقبال سے متعلق غیر مطبوعہ مواد کا سراغ لگایا اور متعدد مضامین لکھ کر اقبال کی زندگی کے بہت سے مخفی پہلوؤں سے نقاب اٹھایا۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ "اقبال یورپ میں" ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے جسے اقبالیات میں اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی سب سے اہم دریافت وہ خطوط ہیں جو علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء اور ۱۹۳۳ء

کے درمیان ایک جرمن خاتون مس ایماویگیناسٹ کے نام لکھے تھے۔ یہ دریافت تو ایک نو مسلم جرمن دانشور ڈاکٹر ہربرٹ امان اللہ ہوبوہم کی تھی لیکن اردو دانوں کو اس کا علم ڈاکٹر درانی کے ذریعے ہوا۔ ڈاکٹر امان اللہ کے پاس علامہ اقبال کے خطوں کے عکس تھے' وہ انھوں نے ڈاکٹر درانی کو دیے کہ ان کا اردو ترجمہ شائع کرادیں۔ اصل خطوں کو ڈاکٹر امان اللہ خود مرتب کر کے شائع کرانا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر درانی نے ان کا متن بھی ڈاکٹر امان اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی کتاب میں شامل کرلیا۔ ممکن ہے ڈاکٹر امان اللہ کو اِس بات سے رنج ہوا ہو' لیکن ہمارا خیال ہے کہ عشق اور تحقیق میں سب جائز ہے۔ ڈاکٹر درانی علامہ کے عاشق بھی ہیں اور محقق بھی' ان کو اظہارِ عشق و تحقیق کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

"اقبال یورپ میں" کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر درانی نے اپنی تحقیق کے دائرے کو وسیع کیا اور ایماویگیناسٹ کو اپنا موضوع بنا کر رسالہ "افکار" میں ایک طویل سلسلۂ مضامین لکھا۔ ان مضامین سے اردو تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال سے ایما ویگیناسٹ کا تعلق یہ تھا کہ وہ علامہ اقبال کے جرمنی میں قیام کے دوران انھیں جرمن زبان پڑھایا کرتی تھیں۔ کوئی اور محقق ہوتا تو وہ ایما کے مختصر حالات لکھنے پر اکتفا کرتا' لیکن ڈاکٹر درانی نے ان محترمہ کی سات پشتوں پر تحقیق کر ڈالی۔ ایما کے اہلِ خاندان' ان کی رہائش گاہوں اور قبروں کے بارے میں وہ تمام تفصیلات پیش کردیں جو اَب تک پردۂ راز میں تھیں۔ یہی نہیں دورانِ تحقیق خود ڈاکٹر صاحب پر جو گزری' اس کی تفصیلات بھی انھوں نے اس طرح قلم بند کی ہیں جیسے یہ سب باتیں بھی علامہ اقبال یا ایماویگیناسٹ کے نامہ ہائے اعمال کا حصہ ہوں۔ مثلاً اسپین میں ڈاکٹر درانی صاحب کا بریف کیس چوری ہوگیا۔ اس واقعے کو انھوں نے نہایت ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس بریف کیس کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کی' پندرہ سو روپے خرچ کر کے اشتہار دیا' بریف کیس کا کھوج لگانے والے کے لیے چار ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ مگر افسوس اس متاعِ گم گشتہ کا سراغ نہ ملا۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ اس بریف کیس کا علامہ اقبال یا ایما ویگیناسٹ سے کیا تعلق ہے؟ عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ دورانِ تحقیق پیش آنے والے ہر واقعے کو تحقیق ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تحقیق میں افسانوی انداز پیدا ہوجاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

روکھی پھیکی تحقیق قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔

دل چسپ واقعات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں منظر نگاری بھی بہت عمدہ ملتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایما ویگیناسٹ کے چچازاد بھائی کی بیٹی پروفیسر کرش ہوف سے ملنے ہائیڈل برگ جارہے تھے تو بس کے ذریعے سفر کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ دیکھا' اسے یوں بیان کیا ہے: "بس دریائے نیکر کے کنارے کنارے خراماں خراماں رواں دواں تھی۔ کنارِ دریا پر بوقلموں درخت' خوش رنگ بوٹے اور سبزۂ بیگانہ بہار دکھا رہے تھے۔ سورج کی نقرئی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آرہی تھیں۔ دریا پر وقفے وقفے سے قدیم پُل بنے تھے۔ فرازِ کوہ پر قلعے کے پُرشکوہ کھنڈر جلوہ آرا تھے اور دریا کے اُس پار حسین حویلیاں اور پرانے برج اور گرجے آپس میں گڈمڈ تھے' جب کہ اِس پار درختوں اور جھاڑیوں میں گھرے ہوئے قدیم مکان ایستادہ تھے"۔

ایم اسلم کے ناولوں جیسی منظر نگاری کو کسی تحقیقی کتاب میں شامل کرنا تحقیقی اجتہاد کا درجہ رکھتا ہے جس کے لیے ڈاکٹر درانی ہی نہیں بس کا ڈرائیور بھی مبارک کا مستحق ہے جو بس کو دریائے نیکر کے کنارے کنارے خراماں خراماں سوئے ہائیڈل برگ لے گیا۔

ڈاکٹر درانی کو فوٹو گرافی سے بھی دلچسپی ہے۔ دورانِ تحقیق جو اہم عمارت یا فرد نظر آتا' وہ اُس کی تصویر اتار لیتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے پروفیسر کرش ہوف کے نواسوں کی بھی تصویریں اتاریں' کیوں کہ اِس کا امکان ہے کہ آیندہ چل کر علامہ اقبال کی استانی کے چچازاد بھائی کی بیٹی کے نواسوں پر بھی تحقیق کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں گہرائی کا اِس سے اندازہ کیجیے کہ علامہ اقبال نے ہائیڈل برگ کے جس مکان میں قیام کیا تھا' اس کے موجودہ مالک سے بھی انھوں نے ملاقات کی اور اُس کے مفصل حالاتِ زندگی قلم بند کیے اور یہ بھی بتایا کہ اس مکان کی تین منزلوں میں اب کون کون رہتا ہے۔ اور ۱۹۰۷ء سے لے کر اب تک اس مکان میں کس قسم کی تعمیراتی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مفید اطلاع بھی فراہم کی ہے کہ مالک مکان کے نواسے کی عمر چار برس اور نواسی کی عمر سات برس ہے۔

ایما ویگیناسٹ پر تحقیق کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اُس کا آبائی قصبہ بھی دیکھا جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس قصبے کی طرف روانہ ہونے سے پہلے کے واقعات یوں بیان فرمائے ہیں: "ہم نے

سوچا کیوں نہ جلدی سے دوپہر کا کھانا کھا لیا جائے ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔ چنانچہ ہم ایک اطالوی ریستوران میں پہنچے اور ایک pizza (اطالوی خمیری روٹی جس پر مچھلی کے قتلے، ٹماٹر، پنیر، بڑی سبز مرچیں وغیرہ پک کر اور پگھل کر چسپاں ہوتی ہیں) کا آرڈر دیا۔ کیوں کہ یہ عموماً غذائے سریع سمجھی جاتی ہے...."

ڈاکٹر صاحب نے pizza کی جو تشریح کی ہے، اسے پڑھ کر منھ میں پانی بھر آتا ہے۔ اردو میں اتنی لذیذ تحقیق کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایماویگیناسٹ کی قبر کی بھی زیارت کی۔ پہلے یہ بتایا ہے کہ قبر پر کس کس رنگ کے پھول کھلے تھے اور پھر یہ لکھا ہے: "قبر دیکھ کر میرے دل پر عجیب تاثر پیدا ہوا۔ میں اس قبر کے سامنے آنکھیں بند کر کے تادیر اُن کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا اور اُن پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرتا رہا جب ایما اور اقبال ایک ساتھ تھے۔ اور ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا اقبال خود اس گھڑی میرے اور ایما کے ساتھ اسی گوشۂ خاک پر موجود ہیں اور خوش ہیں کہ سال ہا سال کے بعد اُن کا ایک قاصد اور ہم راز اُن کا پیامِ شوق لے کر وہاں آیا ہے"۔

یہ بہت اچھی بات ہے کہ علامہ اقبال پر تحقیق کرتے کرتے ڈاکٹر درانی نہ صرف اُن کے قاصد بلکہ ہم راز بھی بن گئے۔ افسوس کہ اس موقع پر کوئی فوٹو گرافر موجود نہیں تھا جو اقبال، ایما اور ڈاکٹر درانی تینوں کی اکٹھی تصویر کھینچ لیتا۔ کیا عمدہ تصویر ہوتی کہ ایما خود اپنی قبر پر علامہ اقبال کے ساتھ کھڑی ہے اور درمیان میں ان دونوں کا رازدان بھی موجود ہے۔ اور جب یہ تصویر ہمارے کالم کے ساتھ چھپتی تو کالم کی معنویت میں گراں قدر اضافہ ہو جاتا۔

ڈاکٹر صاحب ایماویگیناسٹ کا آبائی مکان دیکھنے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اصل مکان کی جگہ ایک نو تعمیر مکان موجود ہے جس کا ایما سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس سے نو تعمیر مکان کی اہمیت کم نہیں ہوتی کیوں کہ اُس کی بنیادیں اُسی زمین پر تھیں، جہاں کبھی ایما کا آبائی مکان تھا۔ اس مکان کے چھجے پر ایک فربہ اندام شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مکان کے ساتھ اس کی تصویر بھی کھینچ لی۔ افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کے حالات نہیں لکھے، کم از کم نام ہی معلوم کر کے لکھ دیتے تو ماہرینِ اقبالیات کو اُس پر تحقیق کرنے میں آسانی ہوتی۔

ایما کے مکان ہی کا نہیں پورے محلّے کا نقشہ بدل چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا کہ کوئی ایسی چیز تلاش کی جائے جو ایما ویگیناسٹ کی ہم عصر ہو۔ مذکورہ مکان کے قریب انھیں ایک مین ہول کور MANHOLE COVER نظر آیا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ پرانے زمانے کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اُس کی تصویر کھینچ لی۔ فرماتے ہیں: "میں نے سوچا چلیے اس مدوّر ڈھکنے ہی کی تصویر لے لی جائے تا کہ کم از کم ایما کی اس مکان میں سکونت کی کسی تو ہم عصر شے کا عکس محفوظ ہو سکے"۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ تصویر اقبال میوزیم لاہور میں جمع کرا دی ہوگی تا کہ پرستارانِ اقبال اس مدوّر ڈھکنے کے حسن سے آنکھیں سینک سکیں۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ ایک ہمارا بھی مسئلہ حل کر دیں۔ موصوف نے اپنی کتاب "اقبال یورپ میں" کے دیباچے میں علامہ اقبال کا ایک نادر خط شائع کیا ہے جو اُنھوں نے اپنے استاد طامس آرنلڈ کی بیٹی فینسی کے نام ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ اس میں علامہ لکھتے ہیں:

"پچھلے کمرے میں میرے سائیس کی سیاہ فام ننھی بچی چلّا رہی ہے اور صبح سے میرے آرام میں خلل ڈال رہی ہے۔ وہ ایک عذابِ جان ہے لیکن مجھے اس کی برداشت کے سوا کوئی چارہ نہیں، کیوں کہ اس کا باپ میرا وفادار خادم ہے"۔

ہم علامہ کے اس وفادار خادم (سائیس) اور اُس کی ننھی سیاہ فام بچی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتے ہیں جس میں اس گھوڑے کے بھی حالات ہوں گے جس کی خدمت پر مذکورہ سائیس مامور تھا۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان تینوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر سکیں تو بے حد کرم ہوگا۔ گھوڑے کا شجرۂ نسب تو ہم مشہور نقاد اور شاعر قمر جمیل سے حاصل کر لیں گے کیوں کہ انھوں نے گھوڑوں پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں، سائیس کا شجرۂ نسب البتہ ڈاکٹر صاحب ہی کو فراہم کرنا ہوگا۔

(۱۱/ جنوری ۱۹۹۰ء)

لِسانیات اور لَسّانیات

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں۔ اُن کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے تنک مزاج نے بھی مانا ہے جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں۔ اپنے بارے میں اِس لیے نہیں سوچتے کہ مسلّمات پر بحث کرنا اُن کی عادت نہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کو ماہرِ لسانیات ہونے کی سند ڈاکٹر گیان چند نے بھی عطا کی ہے جو خود اِس میدان کے شہ سواروں میں سے ہیں اور شہ سوار بھی ایسے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری جیسے جیّد عالم کو اپنے توسنِ لسانیات کی گرد بنا ڈالا تھا اور بعد میں معذرت بھی کی تھی۔ ڈاکٹر نارنگ کے سلسلے میں وہ معذرت کا ارادہ نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر نارنگ لِسانیات ہی کے نہیں لَسّانیات کے بھی ماہر ہیں۔ تقریر ایسی کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ دو تین سال پہلے پاکستان ٹیلی ویژن سے موصوف کا ایک طویل انٹرویو دیکھا اور سنا تھا۔ ہمیں خوشی ہوئی تھی کہ ٹیلی ویژن پر کوئی تو ڈھنگ کا پروگرام دکھائی دیا۔ نارنگ صاحب کی گفتگو بڑی عالمانہ تھی۔ ان کا جو علم گفتگو سے ظاہر نہ ہو سکا' وہ ٹیلی ویژن کیمروں کی تیز روشنی اور گرمی کی وجہ سے پسینہ بن کر پیشانی سے ظاہر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس گفتگو ہی کا فیضان ہے کہ اب ہم بھی اپنا شمار اہلِ علم میں کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں اپنا علم ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ہماری کالم نگاری سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے' ہم اُس پر اِس لیے نادم نہیں ہیں کہ یہ اخفائے علم کا ایک ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کی شخصیت کا ظاہری حُسن بھی بے مثال ہے۔ اگر وہ ادب کی بجائے فلم کی طرف چلے جاتے تو اِس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہ ہوتا۔ ایک ضمنی فائدہ یہ ہوتا کہ وہ دہلی کے

بہت سے اردو کے استادوں کو بہتر روزگار دلوا دیتے۔ ڈاکٹر صاحب اگر دو پونے دو سو سال پہلے دنیا میں تشریف لے آتے تو آج ہمارے پاس میر تقی میر کی غزلوں کے چھ نہیں سات دیوان ہوتے۔ نثار احمد فاروقی ساتویں دیوان میں بہت سا الحاقی کلام شامل کر کے اُسے مرتّب کرتے اور اپنی علمیت کی مزید دھاک بٹھاتے۔

ڈاکٹر نارنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اردو کے بے لوث سپاہی ہیں۔ آج ساری اردو دنیا میں انھیں عزت کی نظر سے اس لیے دیکھا جاتا ہے کہ وہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے علمی و عملی طور پر شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اردو کا کام ہو' یہ وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کراچی کی انجمنِ ساداتِ امروہہ کے مشاعرے میں بھی خطبۂ صدارت پڑھنے میں تامّل نہیں کرتے' حالاں کہ اس مشاعرے میں شرکت کے بعد مصحفی والے اُس "امروہہ پن" سے زندگی بھر چھٹکارا نہیں ہوتا جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اور جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں کیا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ کے علمی و ادبی کارنامے بے شمار ہیں اور اتنے وزنی ہیں کہ ہمارا کالم اس بوجھ کو اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ جس کاغذ پر چھپتا ہے' وہ خاصا کمزور ہے۔ لہٰذا ہم صرف ایک تازہ ترین کارنامے کا ذکر کرتے ہیں جس کا تعلق اردو کی درسی کتابوں سے ہے۔ ہندوستان کی قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیقات نے اردو کی درسی کتابیں تیار کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی ڈاکٹر نارنگ کی سربراہی میں قائم کی تھی۔ اس کمیٹی کی نگرانی میں تین کتابیں شائع ہوئی ہیں جو چھٹی' نویں اور گیارھویں جماعتوں کے لیے ہیں۔ ان کے مرتبین اور مؤلفین میں شمس الرحمان فاروقی' ڈاکٹر ثریا حسین اور خود ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے ادیب شامل ہیں۔ یہ کتابیں اپنے مواد اور پیشکش دونوں کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں اور بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اِس نوعیت کی خوب صورت اور خوب سیرت درسی کتابیں اردو زبان میں پہلی بار شائع ہوئی ہیں۔ ان میں ایسی منتخب تحریریں شامل کی گئی ہیں جن کے مطالعے سے طالب علموں میں زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو گا۔ لفظوں کے معنی بھی وہی لکھے گئے ہیں جو ہونے چاہییں نہ کہ کراچی کے ایک بزرگ کی مرتّبہ درسی کتابوں کی طرح "خلا" کے معنی "آسمان" اور "سراگائے" کے معنی "کوڑیاں" بتائے جائیں۔ مختصر یہ کہ ڈاکٹر نارنگ کی مرتّبہ درسی کتابیں اتنی عمدہ ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ وہ آیندہ تنقید' لسانیات اور

ساختیات وغیرہ کے پھیر میں نہ پڑیں کہ ننانوے کے پھیر کی طرح یہ بھی دوسروں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے' درسی کتابیں ہی مرتب کرتے رہیں کہ یہ کہیں زیادہ بڑی خدمت ہے۔ اس کا ضمنی فائدہ یہ ہوگا کہ پبلک ریلیشننگ کا دائرۂ اثر آنے والی نسلوں تک کا احاطہ کرلے گا۔

ان کتابوں کے چھپتے ہی ہندوستان کے بعض اخبارات میں کچھ لوگوں نے ڈاکٹر نارنگ پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی نصابی کتابوں میں پاکستانی مصنفین کو شامل کرکے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ان کتابوں میں جن چند پاکستانی مصنفین کی تحریریں شامل کی گئی ہیں اُن کے نام یہ ہیں: علامہ اقبال' جوش ملیح آبادی' فیض احمد فیض' مولوی عبدالحق' مشتاق احمد یوسفی اور ناصر کاظمی۔ معترضین کی بصارت اور بصیرت کی داد دینی چاہیے کہ وہ اردو کی درسی کتابوں سے اِن اکابر کو محض اس لیے خارج کرنا چاہتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہیں۔ کل معترضین یہ بھی کہیں گے کہ تاج محل کو دیکھنا ہندوستانی قومیت کے جذبے کے منافی ہے کیوں کہ شاہ جہان نے اُسے ایک پاکستانی کی زیرِ نگرانی تعمیر کرایا تھا جس کا نام احمد معمار لاہوری تھا۔

ڈاکٹر نارنگ کی خدمات کے اعتراف میں حال ہی میں علی گڑھ کے رسالے "الفاظ" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے جسے ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے مرتّب کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر نارنگ کے علمی و ادبی کاموں اور شخصیت پر شمس الرحمٰن فاروقی' ڈاکٹر گیان چند' فضیل جعفری اور مغنی تبسم وغیرہ نے مضامین لکھے ہیں۔

شمس الرحمان فاروقی کے مضمون کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: "پیارے گوپی چند نارنگ' دنیا مجھے اور آپ کو دوست سمجھتی ہے لیکن کچھ لوگ ہمیں رقیب بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چلیے مجھے اِس پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیوں کہ ہم دونوں ہی عروسِ اردو کے عاشق و دلدادہ ہیں اور جب معشوق ایک ہو اور عاشق دو تو رقابت کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔ جب آپ کی کوئی اچھی تحریر دیکھتا ہوں تو رشک آتا ہے کہ کاش یہ میں نے لکھی ہوتی۔ کبھی میری بھی کسی ٹوٹی پھوٹی تحریر کو دیکھ کر آپ کا بھی جی للچاتا ہوگا"۔

یہ پڑھ کر ہمیں ایک واقعہ یاد آگیا۔ بلا تشبیہ عرض ہے۔ ایک مرتبہ حبیب جالب نے ناصر کاظمی مرحوم سے کہا: "جب کبھی آپ کی کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھتا ہوں' دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ غزل میرے نام سے چھپتی"۔ ناصر کاظمی نے شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد

حبیب جالب نے پوچھا: "میری غزل دیکھ کر آپ کا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے"؟ ناصر کاظمی نے کہا:
"خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ غزل آپ ہی کے نام سے چھپی"۔

(۱۸/ جون ۱۹۸۷ء)

اژدر نامۂ ساقی فاروقی

ایک زمانہ تھا کہ اردو کے شاعروں کو اپنا پہلا مجموعۂ کلام جلد از جلد چھپوانے کا شوق ہوتا تھا تا کہ آپ بھی شرمسار ہو سکیں اور پڑھنے والے بھی۔ لیکن اب ان کے شوق کا میدان وسیع ہو گیا ہے' اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے اور کلیات چھپ جائے۔ جسے دیکھیے وہ اپنے کلام کو انگریزی میں منتقل کرانے یا کلیات چھپوانے کی فکر میں ہے۔ غالب اور اقبال کے کلام کا ترجمہ ہوتا ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بڑے شاعر ہیں اور ان کی شاعری اس لائق ہے کہ انگریزی خواں دنیا اس سے استفادہ کرے۔ مگر اُن شاعروں کو اپنے کلام کا ترجمہ کرانے کی کیا ضرورت ہے جن کا کلام اردو میں بھی ایسا نظر آتا ہے جیسے کسی دوسری زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو اور ترجمہ بھی کسی ایسے شخص نے کیا ہو جسے اصل زبان پر دسترس ہو نہ اردو پر۔

خدا بخشے رفیق خاور ہفت زبان عالم تھے۔ اردو' فارسی انگریزی اور پنجابی میں یکساں مہارت سے ترجمہ کرتے تھے۔ فضل کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو لندن سے چھپا۔ غالب کی اردو شاعری کو انگریزی میں اور فارسی شاعری کو اردو نظم میں منتقل کیا۔ اقبال کے "جاوید نامہ" کو اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ ان کے تراجم کی ایسی شہرت ہوئی کہ بہت سے معاصر شعرا بھی اپنا کلام لے کر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ خاور صاحب نے شروع شروع میں ترجمے کا کام مروتاً کیا لیکن بعد میں انھوں نے معاوضہ لینا شروع کر دیا۔ وہ اتنی تیزی سے ترجمہ کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ آج کسی شاعر نے پچاس غزلیں ان کے حوالے کیں اور تیسرے روز ترجمہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ ہم نے ان سے پوچھا کہ وہ یہ کام اتنی تیزی سے کیسے کر لیتے ہیں کہنے لگے: "میں ترجمہ کہاں کرتا ہوں' طبع زاد نظمیں لکھ کر شاعروں کے حوالے کر دیتا ہوں' وہ انھیں اپنے کلام کا ترجمہ

سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں"۔ ہم نے اس خوش فعلی کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا: "اگر آج کل کے اردو شاعروں کا کلام انگریزی میں منتقل کیا جائے تو اردو زبان بدنام ہو جائے گی' انگریزی خواں اس کلام کو پڑھ کر بدمزہ ہوں گے' لہٰذا میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ اردو کے حوالے سے انگریزی میں جو چیز شائع ہو وہ اردو کی بدنامی کا سبب نہ بنے"۔

افسوس کے اب مترجمین میں اردو کا کوئی ہمدرد نہیں جو اپنی طبع زاد نظمیں ترجمے کے نام پر پیش کر سکے۔ آج کل کے مترجم خوب کو خوب تر نہیں بناتے بلکہ اس کے برعکس عمل کرتے ہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری جو خود اردو میں توجہ کی مستحق نہیں ہوتی' انگریزی میں منتقل ہو کر ہمدردی کی مستحق ہو جاتی ہے۔

کلیات کی اشاعت کا آغاز فیض صاحب سے ہوا تھا' ان کی زندگی میں ان کی کلیات پہلے لندن سے اور پھر لاہور سے شائع ہوئی۔ فیض صاحب کی دیکھا دیکھی دوسرے شاعر بھی میدان میں آگئے۔ فیض صاحب نے کلیات شائع کی تھی تو انھیں اس کا حق تھا۔ وہ ستر سال سے اوپر کے ہو چکے تھے اور انھیں جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکے تھے۔ لیکن وہ شاعر جنھوں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اور جو شاعری اور عمر کے اعتبار سے پختگی کی منزل تک نہیں پہنچے' معلوم نہیں انھیں کیوں کلیات چھپوانے کا شوق ہو رہا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ آج کل ایک درجن سے زائد شعرا اپنی اپنی کلیات چھپوانے کی فکر میں ہیں۔ کاش یہ شاعر پہلے "جزئیات" میں کمال حاصل کرتے' صاحبِ کلیات ہونے کے لیے تو ایک عمر پڑی ہے۔

ساقی فاروقی نے بہت اچھا کیا کہ کلیات مرتب نہیں کی' بلکہ ۱۹۸۷ء تک کے اپنے سارے کلام کو یک جا کر دیا ہے۔ ان کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ پیاس کا صحرا' رادار اور بہرام کی واپسی۔ یہ مجموعے اب دست یاب نہیں ہوتے۔ "زندہ پانی سچا" کے نام سے جو نیا مجموعہ چھپا ہے' اس میں ان تینوں مجموعوں کی نظمیں اور غزلیں شامل کی گئیں ہیں اور ساتھ ہی بیس نئی غزلوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ساقی نے ۱۹۸۷ء کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ الگ کتابی صورت میں چھپے گا۔

ساقی دورِ جدید کے دو چار اہم شاعروں میں سے ہیں' فکر اور اسلوب کے اعتبار سے انھوں نے اردو شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نئی کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے: "جب کسی شاعر کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہو تو آپ کو پتا چلے کہ اس شاعر کی ملاقات بنتے بگڑتے' ٹوٹتے

پھوٹتے، جلتے بجھتے، بے تہ اور تہ دار تمام لمحوں سے ہوئی ہے، اور اگر ایسا ہو گا تو اس کے یہاں کسی خیال کی چمک، کسی احساس کا نرالا پن، کسی لفظ کی تازگی، کسی اسلوب کا بانکپن ضرور نظر آئے گا"۔

ہم نے بنتے بگڑتے اور ٹوٹتے پھوٹتے لمحوں سے شاعر کی ملاقات پر تو غور نہیں کیا، تاہم اس ملاقات کے نتیجے میں جو شاعری وجود میں آئی ہے، اسے ضرور پڑھا ہے۔ چونکہ فلیپ کی عبارت عموماً متعلقہ کتاب کے مندرجات کے بارے میں ہوتی ہے، اس لیے یہ مان لینے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں کہ ساقی کی شاعری میں خیال کی چمک، احساس کا نرالا پن، لفظ کی تازگی اور اسلوب کا بانک پن نظر آتا ہے۔ لیکن ساقی کا ایک اور وصف بھی قابلِ ستایش ہے، وہ گزشتہ ۲۵ برسوں سے اپنے معاشرے سے کٹ کر ایک اجنبی معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے اپنی شعری اور ثقافتی روایات سے رشتہ برقرار رکھا ہے اور اجنبی معاشرے کی علمی، ادبی اور ثقافتی قدروں سے استفادہ کر کے اپنی شاعری کا افق وسیع بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام اردو شاعروں کی نسبت ان کے موضوعاتِ سخن میں وسعت بھی ہے اور تنوع بھی۔ اس بنا پر اگر انھیں اردو کے جدید شاعروں میں جدید ترین کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ (اس پیراگراف کو ہم نے دوبارہ پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ساقی فاروقی خود اپنی شان میں رطب اللسان ہوں، بہت غور کرنے کے بعد اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ جس قلم سے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں، وہ ساقی فاروقی ہی نے تحفتہً بھیجا تھا۔ اگلی سطور ہم افتخار عارف کے عطا کردہ قلم سے لکھیں گے)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ساقی کا تازہ مجموعۂ کلام اور ایک تازہ انٹرویو ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں اور ایک ساتھ ہی ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ انٹرویو آصف فرخی نے لیا ہے جو انگریزی جریدے "نیوز لائن" کے تازہ شمارے میں چھپا ہے۔ یہ انٹرویو خاصا سنسنی خیز ہے، اس لیے آیندہ سطور میں اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

ساقی کو جانوروں سے خاصی دلچسپی ہے۔ مجموعۂ کلام کیا ہے، اچھا خاصا چڑیا گھر ہے۔ جس میں جگہ جگہ درندے، پرندے، چرندے اور گزندے نظر آتے ہیں۔ کتے، مینڈک، خرگوش، سور اور بلے پر تو مستقل نظمیں بھی موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نے میر تقی میر کا کلام بہت غور سے پڑھا ہے۔ میر صاحب نے کتوں، بلیوں اور بکریوں وغیرہ پر کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ دو "شکار نامے" بھی تصنیف کیے ہیں جن میں دنیا جہان کے جانوروں کا ذکر ہے۔ ساقی نے سوچا ہو گا کہ میر صاحب کی

عظمت کا راز شاید ان کی "جانور نویسی" میں ہے، لہٰذا انھوں نے بھی اس مخلوق کو نشانۂ ستم بنایا۔

آصف فرخی نے ساقی سے پوچھا کہ آپ کے کلام میں کتوں، بلیوں وغیرہ کا جو زیادہ ذکر آتا ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ ساقی نے جواب دیا: "یہ سب میرے معاصرین ہیں اور معاصرین کے بارے میں لکھنا کوئی غلط بات نہیں"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب دیتے وقت بھی ساقی کے سامنے میر تقی میر کی مثال ہو گی، کیوں کہ انھوں نے بھی اپنے معاصرین کے بارے میں ایک مثنوی لکھی تھی جس کا نام "اژدر نامہ" ہے۔ اس میں میر صاحب نے اپنے آپ کو اژدر کہا ہے اور اپنے معاصرین کو بلیوں، چوہوں اور خرگوشوں وغیرہ کے قالب میں دیکھا ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ ساقی نے اپنے تازہ انٹرویو میں بھی اپنے معاصرین پر خاص عنایت کی ہے۔ دو مشہور و مقبول عوامی شاعروں کے لیے انھوں نے "جاہل" کا لفظ استعمال کیا ہے، حالاں کہ استاد لاغر مراد آبادی کا قول ہے کہ ہر شخص جاہل کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ بیسویں صدی میں جاہل ہونے کے لیے بھی تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اعزاز حاصل کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا۔

ساقی نے اقبال کے بعد کے شاعروں میں سے فیض، راشد اور میراجی کو رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیا ہے اور باقی سب شاعروں کو "چھٹ بھیے" اور "چپڑ قناتی" کہہ کر ان کی عزت افزائی کی ہے۔ ترقی پسند شاعروں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس انفرادی لہجہ نہیں ہے، یہ سب ایک ہی جیسی باتیں ایک ہی جیسے انداز سے کہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اختر الایمان جیسے بزرگ شاعر کے بارے میں بھی ساقی نے خاصی دریدہ دہنی سے کام لیا ہے، ایک تو ان کے اسلوب کو "یتیم" کہا ہے کیوں کہ یہ اسلوب قاری کو بور کرتا ہے، دوسرے یہ فرمایا کہ اختر الایمان پچھلے ۲۵ برسوں سے اچھی نثر کو بُری شاعری میں تبدیل کرنے میں مصروف ہیں۔ اچھی سے اچھی نثر میں جو باتیں لکھی جا چکی ہیں، اختر الایمان انھیں باتوں کو بُری سے بُری نظم میں دہرا رہے ہیں۔ ساقی نے جو کچھ کہا ہے وہ "بازی بازی باریش بابا ہم بازی" کے ذیل میں آتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے سال اختر الایمان کراچی تشریف لائے تھے تو انھوں نے ایک انٹرویو میں ساقی کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کیا تھا۔ اب ساقی نے ان کے بارے میں اپنے "زریں خیالات" کا اظہار کر کے حساب برابر کر دیا۔ آدمی کو اتنا منتقم مزاج بھی نہیں ہونا چاہیے، اگر اختر الایمان نے کچھ "باندازِ دگر" کہہ دیا تھا تو

ان کی بزرگی کے پیش نظر ساقی کو اس کا برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ہماری طرح ہر شخص ہمیشہ اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتا، کبھی کبھی خود ساقی فاروقی کی طرح سچ بولنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

ساقی نے جس طرح اپنے انٹرویو میں اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ بدسلوکی کی ہے، اسی طرح اپنی شاعری میں بے زبان معاصرین کے ساتھ بھی زیادتی کی ہے۔ انھوں نے مینڈک پر جو نظم لکھی ہے، اس میں اس بے چارے کو "میڈک" بنا دیا ہے اور نظم کے حاشیے میں لکھا ہے: "میں نے مینڈک میں سے نون کو نکال دیا ہے کہ شاعروں کو اس قسم کی قطع و برید کی آزادی ہے"۔ مینڈک کا سارا صوتی حسن نون ہی کی وجہ سے ہے۔ جب نون ہی نکال دیا گیا تو باقی کیا رہا؟ معلوم نہیں شاعروں کو اس قسم کی قطع و برید یا بے تکلفی کی آزادی کس نے دی ہے؟ کم از کم ہم نے یا کسی دوسرے سخن فہم نے اس بے راہ روی کی اجازت ہرگز نہیں دی، اگر سخن فہموں میں مینڈک کو شامل نہ کیا جائے تو ہو سکتا ہے، ساقی نے براہ راست اسی سے اجازت لے لی ہو۔

فرعون کو بھی ساقی نے اپنا ہم عصر سمجھا ہے اور اس کے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا ہے حالاں کہ وہ ساقی کا ہم عصر نہیں پیش رو تھا۔ ایک نظم میں پہلے تو انھوں نے "فرعون" کی جمع "فراعین" لکھی ہے اور پھر اس کے ساتھ یہ حاشیہ ٹانکا ہے: "فرعون کی جمع فراعنہ ہے لیکن فرعونوں سے میں ایسا زیادہ خوش نہیں ہوں، اس لیے اس کی جمع بدل دی ہے، فراعین کے مداحین معاف کریں"۔ گویا ساقی کی خوشی اور ناخوشی دونوں خطرے سے خالی نہیں ہیں، خوش ہوئے تو مینڈک کا نون نکال دیا، ناخوش ہوئے تو فرعون کی جمع بدل دی۔

اقبال کے بعد کے شعرا میں ساقی صرف فیض، راشد اور میرا جی کو مانتے ہیں۔ ان کا چوتھا پسندیدہ محبوب شاعر ساقی فاروقی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نے پہلے تین شاعروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا، ورنہ ان کا واحد پسندیدہ شاعر چوتھا شاعر ہی ہوتا۔ بہرحال یہ ان کی وسیع القلبی ہے کہ وہ اپنے ساتھ فیض، راشد اور میرا جی کا نام لینا بھی پسند کرتے ہیں۔ ان تینوں شاعروں کا انتقال ہو چکا ہے، اگر یہ زندہ ہوتے تو ساقی کی وسیع القلبی ہی ان کے جان بحق ہونے کا سبب بن جاتی۔

(۹/ اگست ۱۹۹۰ء)

استفادہ یا سرقہ

اب ٹھیک طرح یاد نہیں کہ یہ قول کسی مشہور مفکر کا ہے یا خود ہمارا کہ نقاد اسے کہتے ہیں جو تین کتابیں پڑھ کر چوتھی کتاب تصنیف کر دیتا ہے۔ یہ قول اس لیے یاد آیا کہ حال ہی میں نظیر صدیقی کی چوتھی تنقیدی کتاب "اردو ادب کے مغربی دریچے" شائع ہوئی ہے جسے پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب چوتھی کتاب تصنیف کرنے کے لیے تین کتابیں پڑھنے کی شرط ضروری نہیں رہی۔ تین سے زیادہ کتابیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں بشرطے کہ ان کا موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو۔

زیرِ نظر کتاب کے ہر صفحے سے مصنف کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے دوسری کتابوں سے بے شمار اقتباسات ہی نقل نہیں کیے پورے کے پورے مضمون بھی اڑا لیے ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں شامل پہلے دو مضمون (اظہار یا ابلاغ۔ اردو ادب اور شعبہ اردو) ہم ایک اور کتاب میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے "میرے خیال میں" اور یہ ۱۹۶۸ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئی تھی۔ یہ محض حُسنِ اتفاق ہے کہ اس دوسری کتاب کے مصنف بھی نظیر صدیقی ہی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی اور ہوتا تو نظیر صدیقی پر سرقے کا الزام لگ جاتا۔ موجودہ صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک نئی کتاب کی تشکیل میں اپنی ایک پرانی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں کیونکہ اپنی کتابوں سے نظیر صاحب ہی بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔

کتاب کے نام کا جواز مصنف نے یہ پیش کیا ہے: "اس کتاب کے مضامین چونکہ مغربی شعر و ادب کے ان مسائل اور موضوعات پر مبنی ہیں جو اردو ادب پر اثر انداز ہیں' اس لیے اس کا نام 'اردو ادب کے مغربی دریچے' رکھا گیا ہے"۔ اس کتاب میں کل چھ مضامین ہیں۔ ان میں سوائے پہلے

مضمون (اظہار یا ابلاغ) کے کسی مضمون کا موضوع ایسا نہیں ہے جو اردو شعر و ادب پر اثر انداز رہا ہو۔ "اردو ادب اور شعبہ اردو" کے عنوان سے جو مضمون ہے' اس میں کیمبرج یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے نصاب کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ دو مضامین میں جدید امریکی اور برطانوی شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں انگریزی کے حرف A کو نو مرتبہ الٹا اور سات مرتبہ سیدھا لکھا گیا ہے۔ اردو میں اس قسم کی شاعری اب تک نہیں ہوئی' یہاں تک کہ انیس ناگی کے ہاں بھی سارے حرف سیدھے ہوتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی معنی میں الٹے سیدھے کا فرق باقی نہیں رہتا۔

ایک مضمون میں کولن ولسن کا تعارف کرایا گیا ہے۔ کولن ولسن اردو ادب پر نظیر صدیقی کے برابر بھی اثر انداز نہیں رہا۔ آخری مضمون سترھویں (۱۷) صدی کے مابعد الطبیعیاتی شاعر جون ڈن کے بارے میں ہے۔ نظیر صدیقی نے خود اعتراف کیا ہے کہ اردو والوں کی جون ڈن سے شناسائی برائے نام ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر اس شاعر کے اردو ادب پر اثر انداز ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس کتاب کا نام گمراہ کن ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کتاب کے متن میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ نظیر صدیقی نے یہ مضامین بڑی محنت سے لکھے ہیں۔ آخری دو مضامین پڑھ کر قاری کی معلومات میں اور باقی چار مضامین پڑھ کر پریشانی میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ نظیر صدیقی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے کولن ولسن اور جون ڈن کو اردو والوں سے متعارف کرایا ہے۔ یہ تعارف اتنا مکمل ہے کہ اب کولن ولسن کی کتابیں اور جون ڈن کی شاعری پڑھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بلکہ ہم تو یہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے کہ ان دونوں کو کتابیں لکھنے اور شاعری کرنے کی ضرورت نہیں تھی تا کہ نظیر صدیقی کو ان دونوں پر مضامین لکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔

پریشانی میں اضافے والی بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ نظیر صدیقی نے بعض اہم ادیبوں پر چوٹیں کی ہیں اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے تو خود اپنے بارے میں دیباچے میں لکھا ہے: "میں نے ان چھ مضامین میں جس طرح کے کام کیے ہیں' ان میں میری اہلیت کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا میری جسارت کو۔ مغربی ادب اور فلسفے میں نہ تو میری باقاعدہ تعلیم ہے نہ باقاعدہ تربیت۔ یہاں جو کچھ ہے' محض شوق اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے میری معلومات ناقص

اور میری فکر گمراہ کن ہو، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ یہ صفحات کسی بہتر کام کا محرک ثابت ہوں"۔

اگر یہی باتیں کوئی اور لکھتا تو معلوم نہیں نظیر صدیقی کا کیا ردِ عمل ہوتا۔ بہرحال نظیر صاحب کے ایک عقیدت مند کی حیثیت سے ہمیں یہ بات پسند نہیں آئی کہ کسی مصنف کی اہلیت و صلاحیت پر شک کیا جائے، اس کی معلومات کو ناقص اور فکر کو گمراہ کن کہا جائے۔ اخباری کالموں میں تو اس قسم کی باتیں وقتی طور پر دلچسپی کا سامان فراہم کر دیتی ہیں لیکن علمی کتابوں کے دیباچوں میں یہ صحافتی انداز اختیار کرنا نامناسب ہے۔ ممکن ہے نظیر صدیقی نے یہ معذرت آمیز پیرایہ از راہِ انکسار اختیار کیا ہو لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ لوگ جہاں سو مرتبہ ان کے خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں وہاں ایک مرتبہ اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔

نظیر صدیقی نے جس قسم کی بے تکلفی اپنے لیے روا رکھی تھی، ویسی ہی بے تکلفی کا اظہار افتخار جالب سے بھی کیا ہے۔ ان کی نثر کے کچھ اقتباسات درج کر کے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے : "اگر افتخار جالب نے نثر نگاری کا یہ اسلوب انفرادیت کی تلاش میں اختیار کیا ہے تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک ایسی انفرادیت ضرور حاصل کر لی ہے جس کی جگہ یا تو طاقِ نسیاں پر ہے یا برٹش میوزیم میں"۔ طاقِ نسیاں کی حد تک تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں کہ جدید ادب کا بڑا حصہ اسی طاق کی زینت ہے لیکن نظیر صدیقی کو معلوم ہونا چاہیے کہ برٹش میوزیم میں کسی چیز کو داخل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ برٹش میوزیم والے سب سے پہلے اس چیز کی اہمیت اور افادیت پر غور کرتے ہیں۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ قمر جمیل کا کالم نظر سے گزرا۔ انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں نظیر صدیقی کی زیرِ تبصرہ کتاب پر طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں :

"..... ایک صاحب کا فون آگیا کہ جناب آپ کو نظیر صدیقی کی کتاب اردو ادب کے مغربی دریچے ملی یا نہیں۔ میں نے کہا مل گئی ہے مگر ایک مضمون تو میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اظہار یا ابلاغ۔ رہ گیا جان ڈن والا مضمون تو وہ ایم اے کے نوٹس کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں بھئی کیا رائے ہوئی تمھاری۔ میں نے کہا ایسا لگتا ہے کہ نظیر صدیقی بھی میری طرح سوچے سمجھے بغیر مضمون لکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا، مگر جناب آپ میں اور اُن میں فرق یہ ہے کہ آپ انگریزی میں لکھ کر پھاڑ دیتے ہیں اور وہ اردو میں لکھ کر ناشر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میں نے کہا، یہ صحیح ہے مگر

کبھی غلط نہیں لکھتے' اور محسوس کر کے بھی نہیں لکھتے"۔

ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ نظیر صدیقی اور قمر جمیل دونوں سوچے سمجھے بغیر مضمون لکھتے ہیں۔ بفرض محال اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر اِن دونوں کی شاعری کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ دونوں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شاعری کرتے ہیں اور شاعری بھی ایسی جس پر مضمون نگاری کا گمان گزرتا ہے۔

یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قمر جمیل اپنے انگریزی مضامین سے ترجیحی سلوک کیوں کرتے ہیں۔ مانا کہ انگریزی بین الاقوامی زبان ہے لیکن اردو کا بھی ہم پر حق ہے کہ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ جو سلوک انگریزی مضامین سے کیا جاتا ہے' اس سے اردو مضامین کو محروم رکھنا سخت ناانصافی ہے۔ ہم اِس ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

ممکن ہے قمر جمیل کا یہ جملہ بعض لوگوں کے نزدیک وضاحت طلب ہو کہ نظیر صدیقی کبھی غلط نہیں لکھتے اور محسوس کر کے بھی نہیں لکھتے۔ بات یہ ہے کہ صدیقی صاحب کسی اخبار میں کالم تو لکھتے نہیں جو محسوس کر کے لکھیں اور اپنے وجود کا دوسروں کو احساس دلائیں۔ رہی غلط نہ لکھنے والی بات تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ زیر بحث کتاب میں کتابت کی متعدد غلطیاں ہیں۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ نظیر صاحب نے اپنی کتاب کی کتابت خود نہیں کی' اس وقت تک یہ دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کبھی غلط نہیں لکھتے۔

بہ حیثیتِ مجموعی نظیر صدیقی کی کتاب خاصی فکر انگیز ہے اور جب اِس کی قیمت پر نظر ڈالی جائے تو یہ تشویش انگیز بھی نظر آتی ہے۔ اتنی مہنگی کتاب وہی لوگ خرید سکتے ہیں جو ناشر یعنی نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے سرکاری ادارے کو خیراتی ادارہ سمجھ کر اُس کی مدد کرنا چاہتے ہوں۔

(۱۳/ اپریل ۱۹۸۴ء)

شخصی خاکے کے یا دوستوں کے غلط نامے

ممتاز مفتی کو خدا سلامت رکھے کہ ہمارے بزرگ ترین ادیب ہیں۔ اس سال ۱۲ ستمبر کو وہ اپنی زندگی کے اکیاسی سال پورے کر کے بیاسیویں میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" ۱۹۳۶ء میں "ادبی دنیا" میں شائع ہوا تھا۔ اس طرح ان کی ادبی عمر بھی نصف صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکی ہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے افسانہ، ناول، طنز و مزاح، ڈراما، سفرنامہ اور شخصی خاکہ نویسی جیسی اصنافِ ادب میں مضامینِ نو کے انبار لگائے ہیں۔ لیکن حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے فن کا کوئی بھرپور تنقیدی تجزیہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ "علی پور کا ایلی" کے بارے میں اکا دکا مضامین تو شائع ہوئے ہیں لیکن ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اردو فکشن پر آل احمد سرور اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مرتبہ کتابوں میں بہت سوں کو عہد ساز، رجحان ساز اور نہ جانے کیا کیا ساز افسانہ نگار ثابت کیا گیا ہے لیکن ممتاز مفتی کا ذکر کسی حاشیے میں بھی نہیں ملتا۔

اس صورتِ حال کا ممتاز مفتی پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا۔ گزشتہ نصف صدی میں انھوں نے مسلسل لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان پر تخلیقی تھکن طاری نہیں ہوئی۔ جہاں نقادوں نے انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، وہیں ممتاز مفتی نے بھی نقادوں کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کے نزدیک یہ لوگ دنیائے ادب کے قانونی شہری نہیں ہیں۔ انھوں نے چور دروازے سے داخل ہو کر ناجائز ذرائع سے اپنے شناختی کارڈ بنوا لیے ہیں۔

مفتی صاحب کے اس ارشاد پر استاد لاغر مراد آبادی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: "جعلی شناختی کارڈ صرف نقادوں ہی کے پاس نہیں، بہت سے ادیبوں نے بھی بنوا رکھے ہیں بلکہ بعض

ادیبوں کے پاس تو سرے سے کوئی کارڈ ہی نہیں۔ جعلی نہ اصلی۔ ایسے ادیبوں کے بارے میں مفتی صاحب کا فتویٰ کیا ہے"؟

ایک مرتبہ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ادب کے تالاب میں نقاد ایک گندی مچھلی کی حیثیت رکھتا ہے، جس قدر جلد ہو اسے باہر نکال دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں بھی استاد مذکور کا تبصرہ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں: "اگر ادب کے تالاب سے اس گندی مچھلی کو نکال دیا گیا تو تالاب خالی ہو جائے گا کیونکہ بیشتر ادیب اسی مچھلی کے طفیلیے (PARASITE) ہیں"۔

ممتاز مفتی کا تازہ ترین کارنامہ ان کی کتاب "اوکھے لوگ" ہے جو شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ابن انشا، اشفاق احمد، ادا جعفری، بانو قدسیہ اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے خاکے ہیں۔ ممتاز مفتی چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، اس لیے وہ سچے واقعات کو بھی افسانہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور کہیں کہیں اس کے برعکس بھی عمل ہوتا ہے۔ یعنی افسانوی باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے یہ سچے واقعات ہوں۔ اس کی بہترین مثال قدرت اللہ شہاب کا خاکہ ہے۔

قدرت اللہ شہاب میں بے شمار خوبیاں تھیں مگر خامیاں صرف تین تھیں۔ ابن انشا، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔ قدرت اللہ شہاب اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، مگر اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ان میں عہدے داروں والی خُوبُو پیدا نہ ہو سکی۔ سول سروس کے اراکین ہمیشہ انھیں آؤٹ سائڈر سمجھتے رہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے ان کی زندگی میں جو مجلسی خلا پیدا ہو اسے انھوں نے ادب سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ ادب ان کی زندگی میں آیا تو اہل ادب سے بھی شناسائی ہوئی۔ یوں تو متعدد ادیبوں سے ان کے تعلقات تھے، لیکن ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور ابن انشا ادب کے راستے ان کی ذاتی زندگی میں بھی داخل ہو گئے۔ ان تینوں کی وجہ سے قدرت اللہ شہاب کی تنہائی ختم ہوئی اور شہاب کی وجہ سے ان تینوں کی بہت سی محرومیوں کا ازالہ ہوا۔ یہ تینوں شہاب صاحب سے ملنے سے پہلے بے روزگار یا "کم روزگار" تھے، بعد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کے جواب میں ان تینوں نے شہاب کو وہ منصب عطا کیا جو صرف برگزیدہ نفوس ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اچھے خاصے بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کو ولی اللہ بنا دیا اور اُن سے ایسے ایسے واقعات منسوب کیے جو صوفیہ اور اولیا کے تذکروں ہی میں پڑھنے میں آتے ہیں۔

یوں تو ممتاز مفتی کا سفرنامہ "لبیک" قدرت اللہ شہاب کے مناقب نامے کی حیثیت سے خاصی

شہرت رکھتا ہے لیکن "اُوکھے لوگ" میں شامل خاکے میں عقیدت کا اظہار بڑے نادر پیرائے میں کیا گیا ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں: "شہاب کی شخصیت میں ایک پُراسرار عنصر موجود ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک پہلو کسی انجانی سمت سے تعلق رکھتا ہے جس کا آپ احاطہ نہیں کرسکتے"۔ مفتی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ شہاب صاحب میں ایک ایسی حس پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ آنے والے واقعات کو پہلے سے محسوس کرلیتے تھے۔

شہاب صاحب کی "بزرگی" اور "رسائی" کے حوالے سے مفتی صاحب نے کچھ واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً شورکوٹ میں ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے جنھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ مفتی صاحب اور شہاب مرحوم میں ذاتی مراسم ہیں۔ انھوں نے بذریعہ کشف اس کا علم حاصل کیا اور بوقت ملاقات مفتی صاحب سے فرمایا: "جن صاحب سے آج کل آپ ملتے رہتے ہیں ان سے ہمارا سلام کہیے۔ یہ شخص دین اور دنیا دونوں ہی کو لوٹ کرلے گیا"۔

جس زمانے میں شہاب صاحب ملک سے باہر تھے، مفتی صاحب یہ چاہتے تھے کہ وہ جلد واپس آئیں۔ شہاب صاحب کی واپسی کا پروگرام انھیں خط لکھ کر معلوم کیا جاسکتا تھا، لیکن مفتی صاحب نے مناسب یہ سمجھا کہ کسی روحانی بزرگ سے مدد کی درخواست کی جائے۔ مفتی صاحب ایک بزرگ کے پاس گئے اور ان سے کہا، یہ بتایئے قدرت اللہ شہاب کب واپس آئیں گے۔ وہ بزرگ مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا اور مفتی صاحب سے کہا: "یہ آپ نے کیا کیا، بکری کو شیر کے سامنے ڈال دیا۔ بھئی میں تو ایک چھوٹا سا آدمی ہوں"۔

مفتی صاحب نے قدرت اللہ شہاب کا جو خاکہ لکھا ہے، وہ عقیدت و محبت کی بے مثال دستاویز ہے۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے: "قدرت اللہ شہاب کے بھید کو جاننے کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ لاہور جاکر خوشاب کے ایڈووکیٹ ملک صاحب سے ملوں۔ بڑی مشکل سے میں نے ان کا مکان تلاش کیا ..... پیشتر اس کے کہ میں قدرت کا ذکر چھیڑتا، انھوں نے خود ہی بات شروع کردی۔ بولے، ایک سال سے مدینہ منورہ سے قدرت اللہ شہاب کی واپسی کی منظوری آچکی ہے، پھر وہ ہالینڈ سے واپس کیوں نہیں آئے ..... میں نے ایڈووکیٹ صاحب سے پوچھا قدرت اللہ کون ہے۔ ملک صاحب مسکرانے لگے، بولے، ہمیں خود پوری طرح علم نہیں۔ چلیے آپ کو ایک بزرگ کے پاس لے چلتے ہیں جو قدرت اللہ شہاب میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر بات میں انھیں سپورٹ

کرتے ہیں۔ میو اسپتال کے سامنے ملک صاحب ایک تنگ گلی میں مڑ گئے۔ گھوم پھر کر وہ گلی ایک مسجد پر ختم ہو گئی۔ مسجد کے صحن میں ایک چبوترے پر چار پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا یہ کن صاحب کا مزار ہے۔ ملک صاحب نے کہا' جب داتا لاہور میں داخل ہو رہے تھے تو ان کا جنازہ جا رہا تھا ..... ارے تو کیا یہ تھے وہ بزرگ' حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ قدرت اللہ میرے روبرو اجنبی بن کر آ کھڑا ہوا۔ قدرت کی شخصیت پر روشنی ڈالنا میرا کام نہیں۔ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے"۔

اب آیئے ذرا یہ دیکھیں کہ اس قسم کی تحریروں پر شہاب صاحب کا کیا ردِ عمل تھا۔ مفتی صاحب کو شہاب صاحب سے جو عقیدت تھی اس کی حقیقت انھوں نے خود ایک جگہ بیان کی ہے۔ "شہاب نامہ" کا ایک باب جو بیگم عفت شہاب کے بارے میں ہے' اس میں میاں بیوی کی یہ گفتگو نظر آتی ہے:

وہ بولی۔ "تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ ممتاز مفتی جو کچھ لکھتے ہیں' اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تمھیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ"۔

میں نے کہا۔ "تم ممتاز مفتی کو جانتی ہو۔ بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر سبز عمامہ باندھ کر اور اُس پر مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے عجیب و غریب پُتلا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ دانستہ عقیدے سے بھاگتا ہے اور عقیدت کا روگ پالتا ہے۔ اس کی کسی بات پر دھیان نہ دو"۔

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ ممتاز مفتی بھی عجیب آدمی ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ثاقب کے ساتھ گھنٹوں بچوں کی طرح کھیلتے ہیں لیکن جب وہ میرے پاس سے تمھاری باتیں کر کے جاتے ہیں تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے میں تمھاری بیوی نہیں بیوہ ہوں"۔

"یہی تو اس کی افسانہ نگاری کا کمال ہے"۔ میں نے کہا۔

"اَوکھے لوگ" میں ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کی شخصیت پر تو عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں لیکن اشفاق احمد کے ساتھ ان کا سلوک ویسا ہی ہے جیسا بادشاہوں کا بادشاہوں کے

ساتھ ہونا چاہیے۔ حالانکہ دونوں بادشاہ نہیں، قدرت اللہ شہاب کی بارگاہ میں خواجہ تاش ہیں۔

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

اشفاق احمد سے پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز مفتی فرماتے ہیں: "ایک روز ایک چٹی سفید، شگفتگی اور تازگی سے بھرپور مٹیار میرے سامنے آکھڑی ہوئی"۔ چلیے یہاں تک تو غنیمت ہے لیکن آگے چل کر یہ مٹیار کسی اور روپ میں نظر آتی ہے: "اشفاق احمد میں توجہ طلبی کی ماری ہوئی ایک طوائف موجود ہے جو اس وقت قابلِ تماشا بن جاتی ہے جب اس میں یہ احساس جاگتا ہے کہ اسے دیکھا نہیں جارہا ہے"۔ ہمارے خیال میں ایک مصلحِ قوم کو ایک ننگِ قوم سے تشبیہ دینا طرفین تشبیہ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے۔ یہ تشبیہ سراسر ناقص ہے کیونکہ جن لوگوں نے اشفاق احمد کو ٹی وی کے پروگراموں میں دیکھا ہے، ان کا تجربہ یہ ہے کہ موصوف تو اس وقت قابلِ تماشا بن جاتے ہیں جب ان میں یہ احساس جاگتا ہے کہ انھیں دیکھا جارہا ہے۔

ممتاز مفتی اور اشفاق احمد میں گہری دوستی اور بے تکلفی ہے اس لیے انھیں حق ہے کہ ایک دوسرے کے بارے میں جو رائے چاہیں قائم کریں لیکن اشفاق احمد کے حوالے سے مفتی جی کی طوائف الملوکی کی حدیں کچھ زیادہ ہی وسیع ہو جاتی ہیں اور وہ دوسرے ادیبوں سے بھی خاصے بے تکلف ہوجاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "ہر فن کار میں ایک طوائف ہوتی ہے، کسی میں ننگی، کسی میں ادھ کھلی، کسی میں مستور مثلاً ابوالاثر حفیظ میں بالکل ننگی تھی۔ محمد طفیل میں مستور، انتظار حسین میں ادھ کھلی ہے۔ اشفاق میں گھونگٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے"۔

اشفاق احمد کے مختصر خاکے میں ممتاز مفتی نے طوائف کا حوالہ اس کثرت سے دیا ہے کہ قاری کو اس سے ہمدردی ہونے لگتی ہے کہ یہ بیچاری اراکینِ سلسلۂ شہابیہ کے درمیان کس مصیبت میں پڑگئی۔ بہرحال ممتاز مفتی، قاری اور طوائف دونوں کے صبر کا امتحان لینے کے بعد فرماتے ہیں:

"اشفاق احمد کی شخصیت میں ہفت رنگی عناصر پیدا ہوچکے ہیں۔ ایک بے نیاز صوفی بابا، رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک دنیادار، خودنمائی سے بھرپور ایک طوائف، پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا، دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کسنے والا ایک تلقین شاہ، اپنی منوانے والا گھر کا ایک مالک، سن کر جذب کرلینے والا ایک عظیم کان، چھوت چھات کا متوالا، ایک کشمیری پنڈت، ایک بچہ، پیسے پیسے پہ جان

دینے والا ایک بنیا' لُٹیا لنڈھا دینے والا مہمان نواز' دے کر نہ بھولنے والی ایک معمر عورت اور نہ جانے کیا کیا"۔

ممتاز مفتی نے اسی پر اکتفا نہیں کی' یہ بھی بتایا ہے کہ اشفاق احمد ایک ایسا شخص ہے جو اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے' دوسروں کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا۔ سخت گیر افسر ہے' جی حضور یا ماتحت ہے' لاہور میں اتنے سال رہنے کے باوجود ایک دوست بھی نہ بنا سکا۔

ممتاز مفتی کو اپنے ممدوح میں اگر کوئی خوبی نظر آئی تو یہ کہ وہ کباب بہت اچھے بناتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں: "کباب بنانے کا شوق پیدا ہوا تو لاہور کے معروف کبابیوں سے کوائف اکٹھے کرتا رہا۔ قیمہ کیسا ہونا چاہیے' مسالہ کیسا ہونا چاہیے' آنچ کیسی ہو' کتنی ہو۔ اس کے بعد اس نے کباب بنانے کی سیخیں خریدیں اور میاں بیوی مل کر کباب سازی کی مشق کرتے رہے۔ اب اشفاق کے ہاتھ کے بنے ہوئے کباب منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اکثر دوستوں کو مدعو کرتا ہے۔ خود کباب بنائے جاتا ہے' دوست کھائے جاتے ہیں"۔

ہمارا خیال تھا کہ اشفاق احمد ٹی وی کے لیے ڈرامے اچھے لکھتے ہیں لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کا اصل میدان دوسرا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اشفاق احمد فن کے جس شعبے میں بھی سرگرمِ عمل ہوں' کامیابی ان کے قدم چومتی رہے۔

ممتاز مفتی دوسروں کی شخصیات کو بے نقاب کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سرفہرست یہ ہے کہ کس نے کتنے معاشقے کیے' کن حالات میں کیے اور کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اس قسم کے واقعات کے بیان میں ممتاز مفتی اس حد تک فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ اپنے پیرو مرشد قدرت اللہ شہاب کو بھی نہیں بخشتے۔ ہاں ان سے یہ رعایت کی ہے کہ ان کے ہر معاشقے کو روحانی رنگ دے دیا ہے۔ مثلاً ابتدائے شباب میں ایک لڑکی سے محبت ہوئی اور اس وقت جب اس لڑکی کو مرے ہوئے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ ایک شادی شدہ خاتون سے شہاب صاحب کے معاشقے کی روداد ممتاز مفتی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: "وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کے گھر نوجوان اور ادھیڑ عمر شوقین مزاجوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بیگم کو عشاق کی بھیڑ لگانے سے دلچسپی تھی۔ قدرت بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا اور ایسا جادو جگایا کہ بھیڑ چھٹ گئی۔ رنگ رلیوں کی جگہ قرآن خوانی ہونے لگی' لیکن محترمہ آگ کو نہ تیاگ سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ کسی صورت

بات نہیں بنتی تو وہ قدرت کو اپنے شعلے سے بھسم کرنے کے لیے آگے بڑھی۔ قدرت اپنے کپڑے بچاتا ہوا بھاگا"۔

آذر زوبی سے چونکہ ممتاز مفتی کا کوئی روحانی تعلق نہیں ہے' اس لیے ان کی عشق پیشگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ خاصی خطرناک ہیں۔ یعنی بے چارے آذر زوبی کا حدود آرڈی ننس کے تحت چالان ہو سکتا ہے۔

اس کتاب میں ایک خاکہ عکسی مفتی کا بھی ہے۔ اس سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں ایک ایسا جوہر قابل بھی ہے جس کے لہجے سے آکسفورڈ کی بُو آتی ہے اور جس کے کمرے میں رات کے پچھلے پہر سورج اترتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے بعد عکسی مفتی ہی وہ خوش قسمت شخص ہے جس کا خاکہ ممتاز مفتی نے بڑی عقیدت و محبت سے لکھا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ شہاب پیرو مرشد تھے اور عکسی مفتی فرزندِ دل بند ہے۔ شاید ہی کسی باپ نے اپنے بیٹے کا ایسا سعادت مندانہ خاکہ لکھا ہو۔

ممتاز مفتی نے "باندی" کے عنوان کے تحت اپنی والدۂ محترمہ کا خاکہ لکھا ہے۔ ممتاز مفتی کا فن اس خاکے میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسی شخصیت کی لفظی تصویر کھینچی ہے جس نے اپنی ساری زندگی دوسروں کی خدمت میں بسر کردی اور اس کے صلے میں کوئی سکھ نہ پایا بلکہ ظلم ہی سہے۔ صبر و شکر کا یہ عالم کہ کبھی کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہ آیا۔ یہ ایک مثالی کردار ہے جس پر رحم آتا ہے' لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ہر دور میں انسانیت ایسے ہی عظیم انسانوں کی وجہ سے زندہ رہتی ہے۔ اس خاکے کو اردو کے بہترین شخصی خاکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۴و۱۱/ دسمبر ۱۹۸۶ء)

۸۱ برس کا جوانِ رعنا

اوپندر ناتھ اشک، چشمِ بددور ۸۱ برس کی عمر میں بھی اپنی حرکات و سکنات سے ایسے نظر آتے ہیں جیسے ۸۱ کے ہندسوں نے اپنی جگہ تبدیل کرلی ہو۔ دیکھنے میں وہ بزرگ ہیں لیکن بات کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸ برس کا کوئی جوانِ رعنا بول رہا ہے۔ تقریر کرتے ہیں تو اچھے اچھے جوانِ رعنا بھی ان کے سامنے گھاس کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گھنٹوں بے تکان تقریر کرتے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے ہیں۔

کراچی میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اشک صاحب کو دیکھنے اور سننے کے لیے دور دور سے اتنے لوگ آئے کہ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ آغاز مختار زمن کے مضمون سے ہوا، انھوں نے اشک صاحب کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مختار زمن ڈیڑھ سال پہلے الہ آباد میں اشک صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس ایک ملاقات کے حوالے سے انھوں نے موصوف کی ایسی تصویر کھینچی، جیسے ان کی آدھی نہیں تو چوتھائی زندگی اشک صاحب ہی کے ساتھ گزری ہو۔ یہ مختار زمن صاحب کی عنایت ہے کہ انھوں نے بیس پچیس صفحے کے مضمون پر اکتفا کی۔ وہ چاہتے تو ایک ملاقات کے حوالے سے پوری کتاب بھی تصنیف فرما سکتے تھے۔ طوالت نویسی اشک صاحب کا وصفِ خاص ہے۔ مختار زمن پر اس کا تھوڑا بہت اثر ہونا ہی چاہیے تھا۔

مختار زمن کے بعد اشک صاحب مائیک پر آئے۔ ہمارے قریب استاد لاغر مراد آبادی بیٹھے تھے۔ اشک صاحب کو دیکھ کر کہنے لگے: "یہ بزرگ تقریر کیا فرمائیں گے ان کا گریہ تو ضعف سے مبدل بہ دم سرد ہوتا نظر آتا ہے"۔ لیکن لاغر صاحب کا خیال غلط نکلا۔ اشک صاحب نے سماں باندھ

دیا۔ ۶۵ برسوں کی اپنی تخلیقی زندگی کے اوراق یوں پلٹے کہ ہماری ادبی تاریخ کا پورا ایک دور آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انھوں نے بہت سے دلچسپ واقعات سنائے۔ بہت سی ادبی شخصیات کا تذکرہ کیا۔ مختصر یہ کہ اپنے تجربات و مشاہدات کا مینا بازار سجا دیا۔ ان کے ایک ایک لفظ کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنا گیا۔

اشک صاحب کی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے ہم عصر ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ہر اہم تحریر اُن کی نظر سے گزری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے میراجی کا وہ خاکہ بھی پڑھ رکھا تھا جو آج سے ۳۷ برس پہلے سحاب قزلباش نے لکھا تھا' اور جس کے لکھے جانے کا علم کم لوگوں کو ہے۔ اشک صاحب نے فرمایا' اردو میں جو چند بہترین شخصی خاکے لکھے گئے ہیں' میراجی کا یہ خاکہ ان میں سے ایک ہے۔ اتفاق سے سحاب بھی اس جلسے میں موجود تھیں۔ وہ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوئیں۔ اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی تعریف سن کر ہم بھی خوش ہوئے کہ ۳۷ برسوں کے بعد انھیں ان کی محنت کی داد ملی۔ ہم نے محترمہ کو مبارک باد دی اور کہا کہ یہ خاکہ ہماری نظر سے نہیں گزرا کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم اسے پڑھ سکیں۔ کہنے لگیں: "میرے شخصی خاکوں کا مجموعہ عنقریب شائع ہو رہا ہے"۔ ہم نے عرض کیا: "یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ نے شاعری چھوڑ کر نثر میں ایک مفید کام انجام دیا"۔ محترمہ نے پہلے تو اس کی تردید کی کہ انھوں نے شاعری ترک کر دی ہے اور پھر فرمایا: "کیا شاعری مفید کام نہیں ہے"؟ ہم نے کہا: "اگر یہ کام مفید ہوتا تو اشک صاحب ۳۷ برس بعد آپ کی شاعری کے حوالے سے بھی آپ کا ذکر کرتے"۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا اردو کے بہترین شخصی خاکوں کا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اشک صاحب نے منٹو کا جو شخصی خاکہ (منٹو میرا دشمن) لکھا ہے وہ بھی اردو کے چند بہترین خاکوں میں شامل ہے۔ اس خاکے کا نمایاں وصف یہ ہے کہ منٹو کی شخصیت کے ساتھ ساتھ خود اشک صاحب کی شخصیت بھی پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جتنی بے باکی کے ساتھ منٹو کے عیب گنوائے ہیں اس سے کہیں زیادہ حق گوئی کا ثبوت اپنے عیوب کے بیان میں دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عام لوگ جنھیں عیب سمجھتے ہیں اشک صاحب کے نزدیک وہ خوبیاں ہیں۔

منٹو اور اشک کے تعلقات عجیب و غریب تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے

اور دشمن بھی۔ محبت بھی کرتے تھے اور نفرت بھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بظاہر دوستانہ لیکن بہ باطن منافقانہ رویہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کو خوش دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اشک نے اپنے ڈراموں کے مجموعے "چرواہے" کا انتساب منٹو کے نام اِن الفاظ سے کیا تھا: "منٹو کے نام جو کبھی مجھے اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا"۔ اشک کے بارے میں منٹو کی رائے بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ اشک سے کہا تھا: "میں تمھیں پسند کرتا ہوں حالاں کہ مجھے تم سے نفرت ہے"۔ منٹو نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت کے زمانے میں اشک کی تذلیل کی۔ اس کے جواب میں اشک نے سازش کر کے منٹو کو ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے اور دہلی سے بمبئی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ منٹو نے بمبئی پہنچ کر اشک کو بھی اصرار کر کے وہیں بلایا۔ بمبئی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے لیے پریشانی کا باعث بنتے رہے۔ یہ صورتِ احوال کچھ ایسی ہے جیسے دونوں (منٹو کے الفاظ میں) ایک دوسرے کے لیے استروں کی مالا بن گئے تھے جس کا پہننا بھی مشکل تھا اور اتارنا بھی۔

اشک صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انھوں نے اوائلِ عمر میں شاعری کی تو اُن کے والد نے اُن کے شعر سن کر کہا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ٹیگور اور شیکسپیر کے کان کاٹے گا۔ اشک جب بڑے ہوئے تو ٹیگور اور شیکسپیر کے کان تو اُن کے ہاتھ نہیں آئے لیکن منٹو کی گردن پر اُن کی نظر رہی جسے وہ کاٹنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ لیکن انھیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ افسانہ نگار منٹو کے سب سے بڑے مداح ہیں۔

بعض محفلوں میں ہم نے اشک صاحب کا کلامِ بلاغت نظام بھی سنا۔ اشک صاحب کی شاعری کے تمام مجموعے ہندی رسم الخط میں چھپے ہیں' اس لیے ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس درجے کے شاعر ہیں۔ وہ پنجابی' ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور جب کسی محفل میں سناتے ہیں تو تینوں زبانوں کا کلام سناتے ہیں۔ بعض لوگ ان کے پنجابی کلام کو ہندی' ہندی کلام کو اردو اور اردو کلام کو پنجابی سمجھ کر داد دیتے رہے۔ اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں تھا' اشک صاحب کو پہلے سے بتا دینا چاہیے تھا کہ کون سی نظم کس زبان میں ہے۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اشک صاحب کا کلام جس زبان میں بھی ہو' داد کے لائق ہوتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان ہی سے اچھا لگتا ہے۔ اس قسم کا کلام اگر کوئی دوسرا شاعر سنائے تو سننے والوں سے اس

کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔

چند برس پہلے اشک صاحب نے الہ آباد میں اپنے گھر کے ایک حصے میں پرچون کی دکان کھولی تھی جو خاصی منافع بخش ثابت ہوئی تھی۔ اس دوکان کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ اخباروں میں کئی مضمون چھپے تھے۔ بی بی سی لندن کے ایک پروگرام میں بھی اس دکان کا تذکرہ آیا تھا۔ اشک صاحب نے دراصل دو دکانیں کھول رکھی ہیں۔ گھر میں پرچون کی اور ادب میں تھوک کی دکان ہے۔ انھوں نے اتنا لکھا ہے کہ برصغیر کے کسی ادیب نے شاید اتنا نہیں لکھا ہو گا۔ پنجابی' اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ہندی میں ستّر اور اردو میں چالیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اردو افسانوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابی صورت میں مدون نہیں ہوئے۔ اشک صاحب نے جتنا لکھا ہے اتنا تو ہمارا عام ادیب اپنی پوری زندگی میں پڑھتا بھی نہیں۔

اشک صاحب کی شخصیت میں بڑی رنگا رنگی ہے۔ وہ بیک وقت شاعر' افسانہ نگار' ناول نویس' نقاد' طنز و مزاح نویس اور ڈراما نگار ہیں۔ یادنگاری میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ اپنی یادوں کے حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ عملی زندگی میں بھی وہ خاصے سرگرم رہے ہیں۔ صحافی' استاد اور ریڈیو پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ فلمی دنیا میں بھی انھوں نے اپنا رنگ جمایا ہے۔ کئی فلموں کی کہانیاں' مکالمے اور گانے لکھے ہیں۔ اور تو اور دو فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ سب کام چھوڑ کر اداکاری ہی کرتے تو اچھے اچھے فلمی ستاروں کے چراغ گل ہو جاتے۔

کوشلیا اشک نے اپنے نامور شوہر کا جو خاکہ لکھا ہے اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اشک اپنے آپ کو "مہان لیکھک" سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ اشک صاحب نے کوشلیا سے اپنی لکھنے پڑھنے کی میز صاف کرنے کے لیے کہا۔ میز کی صفائی کے دوران ایک موٹی سی کتاب کے نیچے ایک پلیٹ اور دو چمچے دبے رکھے تھے۔ یہ چیزیں دیکھ کر کوشلیا نے حیرت سے اشک صاحب کی طرف دیکھا۔ اشک صاحب نے فرمایا: "ارے یہاں آدمی دب جائے تو خبر نہ ہو' تم پلیٹ اور چمچوں کی بات کرتی ہو۔ یہ ایک مہان لیکھک کی میز ہے کسی چپڑ قناتیے کی میز نہیں"۔ اشک صاحب نے صحیح فرمایا۔ مہان لیکھک وہی ہوتا ہے جس کی کتابوں تلے آدمی دب جائیں اور اشک کی کتابیں تو تعداد میں اتنی ہیں کہ آدھا الہ آباد اُن کے نیچے دب جائے تو کسی کو خبر نہ ہو۔

اشک صاحب خوش قسمت ہیں کہ ان کے ہم عصروں نے ہمیشہ ان کی تعریف کی ہے۔ کرشن چندر، بلونت سنگھ اور راجندر سنگھ بیدی نے بڑی محبت سے ان کے بارے میں مضامین لکھے ہیں۔ کرشن چندر نے لکھا ہے کہ اشک کو اپنے آپ کو منوانے کا فن آتا ہے۔ وہ جملوں سے کام نہیں چلاتے۔ عملی مذاق بھی کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو آدمیوں کو لڑوا ہی دیں گے۔ بلونت سنگھ کا خیال ہے کہ اشک کا دل پسند مشغلہ اپنے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا ہے۔ جب یہ غلط فہمیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو پھر اپنے بارے میں وہ خوش فہمیاں پھیلانے لگتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی انھیں "ترک غمزہ زن" کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ لڑنا جھگڑنا ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ ایک مرتبہ اشک اور ان کے پانچ بھائیوں نے مل کر اپنے سارے محلے والوں کو اتنا مارا کہ نوبت اسپتال اور تھانے کچہری تک جا پہنچی۔

راجندر سنگھ بیدی کی یہ بات اگر سچ ہے تو پھر ہمیں یہ کالم یہیں ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ اشک صاحب ہندوستان واپس جاتے ہوئے یہ مژدہ سنا گئے ہیں کہ وہ اگلے سال پھر پاکستان آئیں گے۔ ہمارے قلم سے اگر ایسی ویسی کوئی بات نکل گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے پانچوں بھائیوں کو ساتھ لیتے آئیں۔

(۹/ نومبر ۱۹۸۹ء)

تنقید یا قصیدہ گوئی

ہم ٹی وی نہیں دیکھتے کیونکہ ہمیں وقت ضائع کرنے کے بہتر طریقے معلوم ہیں لیکن پچھلے دنوں اتفاق سے ہمیں ایک پروگرام دیکھنے کا موقع ملا۔ جی خوش ہو گیا۔ پروگرام دیکھ کر نہیں، انتظار حسین کو دیکھ کر۔ یہ عورتوں کا پروگرام تھا جس میں موصوف مہمانِ خصوصی تھے۔ خوشی کے ساتھ ہمیں حیرت بھی ہوئی کہ انتظار حسین تو اپنے ناولوں اور افسانوں میں بھی نسوانی کرداروں کو بادلِ ناخواستہ شامل کرتے ہیں، آج خود اتنی بہت سی خواتین کے درمیان کسی افسانوی کردار کی طرح کیوں کر موجود ہیں!

یہ ایک ادبی پروگرام تھا اور محفل میں شریک خواتین ممتاز ادبی شخصیات تھیں۔ موضوعِ گفتگو وہ مسائل تھے جو ادب تخلیق کرنے والی خواتین کو درپیش ہیں۔ سب سے پہلے پروین شاکر نے یہ شکایت کی کہ جب کوئی خاتون ادبی سفر شروع کرتی ہے تو اُسے اعتبار حاصل نہیں ہوتا، یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے کوئی اور لکھ کر دیتا ہے۔ پروین شاکر نے اپنی مثال دیتے ہوئے کہا: "میرے بارے میں پہلے یہ کہا گیا کہ میرے نانا جان مجھے لکھ کر دیتے ہیں، پھر یہ کہا گیا کہ احمد ندیم قاسمی لکھ کر دیتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی مرد اس قسم کا شعر کیسے لکھ سکتا ہے:

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی"

پروین شاکر بلاشبہہ بہت اچھی شاعرہ ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موجودہ دور میں اردو شاعری کو باثروت بنانے میں ان کا حصہ دوسروں سے کہیں زیادہ ہے لیکن ہمیں ان کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ مذکورہ شعر صرف کوئی خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔ یہ شعر محترمہ کے نانا جان نے یقیناً نہیں

لکھا تھا لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں بہت سے ایسے نانا جان گزرے ہیں جنھوں نے اس قسم کی شاعری کی ہے۔ اس وقت انشاء اللہ خان انشا اور سعادت یار خان رنگین یاد آرہے ہیں جن کے دیوانوں میں اس قسم کے سیکڑوں اشعار ملتے ہیں جو اُن کی نواسیوں سے منسوب ہوتے تو اچھا تھا۔ نمونے کے طور پر دونوں کا ایک ایک شعر ملاحظہ فرمایئے :

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

(انشا)

گرمی کے مارے ناک میں آئی ہے میری جان
باجی اُڑھا دے لا کے کوئی ہلکی اوڑھنی

(رنگین)

ڈیڑھ سو سال پہلے اس قسم کی شاعری کو ریختی کہا جاتا تھا' آج کل اسے خوشبو' خود کلامی اور صد برگ جیسے خوب صورت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

انتظار حسین نے پروین شاکر سے پوچھا: "آپ ہی کے بارے میں لوگوں کو یہ شک کیوں ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا لکھ کر دیتا ہے۔ عصمت چغتائی کے بارے میں کبھی کسی نے ایسی کوئی بات نہیں کی"۔ اس پر کشور ناہید نے پروین شاکر کی وکالت کرتے ہوئے کہا: "ہم بھی جب کالج میں پڑھتے تھے تو سارے بزرگ بغیر کہے OWN کر لیتے تھے کہ ہاں کوئی بات نہیں' لکھ کے دے دیا تھا۔ OWN کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگر بزرگوں کو عزتِ سادات ایسے ملتی ہے تو مل جائے"۔

معلوم نہیں وہ کون بزرگ تھے جو کشور ناہید کی شاعری کے ذریعے عزتِ سادات حاصل کرنا چاہتے تھے' حالاں کہ موصوفہ جس قسم کی شاعری کرتی ہیں اسے OWN کرنے سے عزتِ سادات کا حاصل ہونا تو الگ رہا' بزرگی بھی مشکوک ہو جاتی ہو گی۔ کشور ناہید نے پروین شاکر کی وکالت کے جوش میں ایک بنیادی نکتے کو نظرانداز کر دیا ہے۔ پروین کے بارے میں عام لوگ کہتے تھے کہ وہ دوسروں سے لکھواتی ہیں' جب کہ کشور ناہید کے بارے میں بزرگ خود اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے تھے کہ ہم لکھ کر دیتے ہیں۔ عام لوگوں کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے لیکن بزرگوں کا احترام اجازت نہیں دیتا کہ ہم اُن کو جھوٹا سمجھیں۔

بزرگوں کا احترام کرنا ہم نے کشور ناہید سے سیکھا ہے۔ اور وہ بھی ٹی وی کا زیر تبصرہ پروگرام دیکھنے کے دوران۔ ایک موقع پر انتظار حسین نے کہا کہ عصمت چغتائی کے ہاں اظہار کی جو بے باکی ملتی ہے، وہ آج کل کی لکھنے والیوں میں نظر نہیں آتی۔ اس پر کشور ناہید نے کہا، کسی بزرگ کو غلط ثابت کرنا اچھا نہیں لگتا، تاہم یہ ضرور کہوں گی کہ انتظار حسین نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد کشور ناہید نے کچھ لکھنے والیوں کے نام لیے جن کے ہاں اظہار کی بے باکی پائی جاتی ہے۔ یہ نام سن کر انتظار حسین معنی خیز انداز میں مسکرا دیے جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ میں نے انھیں لکھنے والیوں کی وجہ سے تو پڑھنا چھوڑا ہے۔ ادبی معیار کے بغیر اظہار کی بے باکی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اظہار کی ایسی بے باکی تو طبی کتابوں اور سیاست دانوں کے بیانات میں بھی ملتی ہے۔

کشور ناہید کی وجہ سے انتظار حسین خاصے سہمے سہمے نظر آرہے تھے اور ایک موقع پر انھوں نے کہہ بھی دیا کہ میں کشور ناہید سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس پر کشور ناہید نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "علم کے معاملے میں میری آپ کی لڑائی نہیں ہے"۔ محترمہ نے یہ بڑی عارفانہ بات کہی ہے..... لڑتے ہم اسی وقت ہیں جب کسی چیز کے کھو جانے کا خوف ہو یا کسی چیز کے ہاتھ آنے کی توقع ہو، جو چیز موجود ہی نہ ہو، اس کے لیے لڑنا بے کار ہے۔

اس پروگرام میں نقادوں کی خاصی مذمت بلکہ مرمت کی گئی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ عورت اور مرد میں تفریق کرتے ہیں۔ مردوں پر خوب دل کھول کر صفحے سیاہ کرتے ہیں اور عورتوں کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ انتظار حسین نے اس کی سختی سے تردید کی اور یہ کہا کہ آج تک کسی نقاد نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرۃ العین حیدر کو اس لیے اہمیت نہیں دیں گے کہ وہ عورت ہے یا اس کے کسی ہم عصر ادیب کو اس لیے اہمیت دیں گے کہ وہ مرد ہے۔

افسوس کہ استاد لاغر مراد آبادی کو اس پروگرام میں مدعو نہیں کیا گیا، وہ تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے اور بتاتے کہ ہمارے بعض نقادوں نے تو صرف عورتوں پر ہی لکھنے میں عمریں ضائع کردی ہیں۔ اردو تنقید کی تاریخ میں جو طویل ترین مقالہ لکھا گیا ہے وہ ایک شاعرہ ہی کے بارے میں ہے اور ایک مرد نقاد ہی کا نتیجۂ فکر بلکہ نتیجۂ بے فکری ہے۔ اسی شاعرہ کے پہلے مجموعہ کلام کی تقریب رونمائی کے موقع پر جو مجلہ شائع کیا گیا تھا، اس میں ۳۵ نقادوں کی رائیں شامل تھیں، اور ہر رائے متعلقہ نقاد کے خود رائے ہونے کی دلیل تھی۔ اس مجلے میں قصیدے کے اسلوب میں جو تنقید ملتی

ہے' اس کے چند نمونے یہ ہیں:

"اس کے لہجے میں بیسویں صدی میں سانس لیتی ہوئی ایک ایسی تازگی کا احساس ہوتا ہے جو اپنی نت نئی وارداتوں کے اظہار کے لیے....."۔

"وہ اپنے دور کی ایک حقیقی' منفرد اور دل کش آواز ہے۔ اس آواز کے جادو سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس جادو سے مسخر ہو جانا قارئین کا مقدر تھا"۔

"یہ لڑکی بے پناہ قوتِ نمو کے ساتھ اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گلستان سخن کا ایک ایسا نہالِ سرسبز بن گئی جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر بڑی راحت نصیب ہوتی ہے"۔

"اگر وہ نہ ہوتیں تو اردو شاعری شالامار باغ کی چاندنی سے محروم رہ جاتی"۔

"وہ ایک ایسی ارتقا آشنا شاعرہ ہے جس کے پاؤں دھرتی کے سینے میں پیوست ہیں اور حنائی انگلیاں افلاک کی ردا میں ستارے ٹانک رہی ہیں"۔

"جب اس کی کوئی چیز پڑھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے اردو شاعری کی دلہن زندگی کے سارے خوبصورت جذبے اور خواب دل میں سموئے سچ کے سچے گوٹے سے مڑھا ہوا عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہے"۔

کیا اس قسم کی آرا پڑھنے کے بعد بھی یہ کہنا درست ہو گا کہ ہمارے نقاد لکھنے والیوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں؟

کشور ناہید نے اپنے اسلوبِ خاص میں نقادوں کی خوب خبر لی۔ انھوں نے فرمایا: "ہمارے نقاد سولہ صفحے کا جو مقالہ لکھتے ہیں' اس میں سات سطروں کا ایک پیراگراف عورتوں کے لیے بھی مخصوص کر دیتے ہیں جس میں لکھنے والیوں کو نمبر دیے جاتے ہیں' سب سے پہلے شکل و صورت اور خوب صورتی کے لحاظ سے' پھر شوہر کے عہدے کے لحاظ سے اور آخر میں ادب کے لحاظ سے"۔

کشور ناہید کی شاعری سے زیادہ' ان کی اسی قسم کی باتوں سے ان کی بے باکی اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ کشور کی اس رائے پر ہم اتنا اضافہ کریں گے کہ ہمارے نقاد صرف عورتوں ہی سے خصوصی سلوک روا نہیں رکھتے بلکہ مردوں کے بارے میں بھی لکھنے سے پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ان کا عہدہ کتنا بڑا ہے' وہ دوسروں کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں' کسی ادبی انعام کے جج بنتے ہیں یا نہیں۔

اس پروگرام میں تعلیمی نصاب پر بھی گفتگو کی گئی۔ ایک محترمہ کو شکایت تھی کہ نصاب میں ایسی غزلیں ہوتی ہیں جو عشقیہ نہیں ہوتیں۔ دوسری محترمہ نے لقمہ دیا' حالاں کہ عشق تو انسان کی تہذیب کرتا ہے۔ تیسری محترمہ نے تجویز پیش کی کہ اگر میٹرک کے طالب علم کو محبوب کے حوالے سے صحت مندانہ جذبات کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے تو اِس میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ مغربی ملکوں میں تو اسکولوں میں جنسی تعلیم بھی نصاب کا حصہ ہے۔ آخر میں ایک صاحبہ نے شکوہ کیا کہ نصاب بناتے وقت استادوں سے تو مشورہ کیا جاتا ہے مگر ادیبوں سے رائے نہیں لی جاتی۔

جس وقت ہم یہ پروگرام دیکھ رہے تھے' اتفاق سے اس وقت وہاں محکمۂ تعلیم کے ایک عہدے دار بھی تشریف رکھتے تھے' ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ نصاب بناتے وقت ادیبوں سے مشورہ کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے جواب دیا: "ہم تعلیمی نصاب مرتب کرتے ہیں اس لیے ماہرینِ تعلیم سے مشورہ کیا جاتا ہے' جب کبھی عشق و عاشقی کا نصاب مرتب کرنا ہوگا تو ادیبوں کو ضرور زحمت دی جائے گی"۔

(۳۱/ مئی ۱۹۹۰ء)

طبع زاد تراجم کا خالق

انیس ناگی کی جب کوئی کتاب چھپتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تازہ ہوا کا جھونکا آگیا ہو۔ قطع نظر اِس سے کہ وہ کیا لکھتے ہیں اور کیوں لکھتے ہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اپنے ذہن سے لکھتے ہیں اور اپنے انداز میں لکھتے ہیں۔ وہ کسی کے مقلد نہیں نہ کسی کو رہنما مانتے ہیں۔ گویا وہ اپنی خوبیوں کے ذمہ دار اور خامیوں کے ماخذ بہ نفسِ نفیس خود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ جنھیں وہ اپنی خوبیاں سمجھتے ہیں، وہ دوسروں کے نزدیک خامیاں ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غالب کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا۔ ان کی خوبیوں کو خامیاں قرار دیا گیا تھا۔ غالب کے وہ معاصرین جو انھیں مہمل گو کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے آج اگر زندہ ہوتے تو انھیں خود اپنی مہمل گوئی پر نادم ہونا پڑتا۔

انیس ناگی شاعر ہیں، ناول نگار ہیں، نقاد ہیں اور گاہے گاہے ترجمے کا کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی طبع زاد تحریروں کی طرح ان کے تراجم میں بھی تخلیقی شان پائی جاتی ہے۔ اسی لیے بعض اوقات ان کی طبع زاد تحریروں پر ترجمے کا اور ترجموں پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

شاعر کی حیثیت سے انیس ناگی کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۰ء میں بقول خود انھوں نے نئی شاعری کی بنیاد رکھی تھی جسے لسانی تشکیلات کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ یاد کرنے والے بھی خود انیس ناگی ہیں کیونکہ ان کے "شریکِ شاعری" افتخار جالب، ایک عرصے سے ادبی منظر سے غائب ہیں۔ حالانکہ نئی شاعری کی بنیاد رکھنا کوئی ایسا غلط کام نہیں تھا کہ ادب سے کنارہ کشی کی ضرورت پڑتی۔ بہرحال اب ۱۹۶۰ء والی نئی شاعری کی تحریک کے واحد علم بردار انیس ناگی ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اس تحریک نے صرف شاعری ہی کو نہیں، نثر کو بھی متاثر کیا ہے۔ افسانے میں انور سجاد

اور انتظار حسین کی جو کایا کلپ ہوئی، وہ اسی نئی تحریک کے زیرِ اثر تھی۔ انور سجاد کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم نے ان کے افسانے نہیں پڑھے، ٹی وی ڈراموں میں ان کی اداکاری ضرور دیکھی ہے اور اُس پر نئی شاعری کی بے معنویت کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے، لیکن انتظار حسین کو نئی شاعری سے متاثر قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فیض احمد فیض نے حاجی لق لق کے اخباری کالموں کے زیرِ اثر اپنی شاعری کا رخ متعین کیا۔

نقاد کی حیثیت سے انیس ناگی اپنی آرا کے اظہار میں نہایت بے باک ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی ادبی شخصیت سے، یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ اس خوبی کا بھرپور اندازہ ناگی کے تازہ تنقیدی مجموعے "مکالمات" سے ہوتا ہے۔ یہ دلچسپ اور فکر انگیز کتاب ہے۔ دلچسپ اس لیے کہ ناگی نے بڑی مزے مزے کی باتیں کی ہیں۔ فکر انگیز اس لیے کہ پڑھنے والا فکر و تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ تنقید ہے یا عہدِ حاضر کے پاکستانی ادیبوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔

اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "پاکستانی ادیب کو اپنی شناخت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ خوف اور طمع کا اسیر ہے۔ خوف نے اسے حقیقت سے دور کر دیا ہے اور دنیاوی فوائد کی طمع نے اسے اہلِ اقتدار کا مقرب بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی شناخت کا قرینہ محو کر کے اپنی آزادی سے دست برداری کا اعلان کر دیا ہے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی صورتِ حال کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے۔ وہ جن باتوں کی وجہ سے پاکستانی ادیب کو بے شناخت بتا رہے ہیں، دراصل وہی باتیں تو اُس کی شناخت ہیں۔ اہلِ اقتدار کے قریب جانے سے ادیب کی آزادی کو کوئی خطرہ نہیں، ہاں اہلِ اقتدار ادیب کی قربت کی وجہ سے کسی مشکل میں پڑ جائیں تو اور بات ہے۔

ادیب کی شناخت کے مسئلے پر لکھتے ہوئے انیس ناگی نے یہ بھی کہا کہ: "پاکستانی ادیب کی تحریریں جن مسائل اور تجربات کو پیش کرتی ہیں، ان کا تعلق پاکستان کی دس فی صد آبادی سے بھی نہیں۔ چناں چہ یہ تحریریں نہ تو کسی طور پاکستانی معاشرے کی اونچ نیچ کو پیش کرتی ہیں اور نہ ہی کسی نئے انسانی عہد کا یقین دلاتی ہیں"۔ یہاں انیس ناگی نے قدرے مروت یا رعایت سے کام لیا ہے۔ پاکستانی ادیبوں کی تحریروں کا ملک کی دس فی صد تو کیا، ایک فی صد آبادی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

آبادی تو ایک طرف رہی، اب ادیبوں کی تحریروں کا ادب سے بھی کوئی تعلق نہیں رہا، اور خود ادب کا یہ حال کہ وہ انیس ناگی کی کتابوں کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا اور انیس ناگی کی کتابوں کا یہ حال ہے کہ چھپنے کے بعد کہیں نظر نہیں آتیں۔ گودام میں مقید رہتی ہیں کہ کہیں زمانے کی ہوا نہ لگ جائے۔

"مکالمات" کا ایک اور اہم مضمون "ادیب کی سماجی ذمہ داری" ہے۔ اس میں بھی انیس ناگی نے مزے مزے کی باتیں کی ہیں۔ پہلے تو یہ بتایا ہے کہ قدرت اللہ شہاب نے رائٹرز گلڈ بنا کر پاکستانی ادیبوں کو غلط راستے پر لگایا اور پھر یہ لکھا ہے کہ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ اکادمی ادبیات نے پوری کر دی۔ وہ لکھتے ہیں: "اکادمی میں ایسے ادیبوں کی آؤ بھگت کی جانے لگی جن کی ادبی حیثیتیں مشکوک تھیں۔ ادیبوں کے خاص گروہ کو غیر ملکی ادبی کانفرنسوں اور وفود میں بھیجا جانے لگا جو اکادمی کے اربابِ حل و عقد کی اخبارات میں آہ واہ کرتے تھے ..... سالانہ ادبی ..... خطیر رقوم کے انعامات انھیں ادیبوں اور شاعروں کو دیے گئے جو منظورِ نظر تھے"۔

ہمارے خیال میں اکادمی کا یہ اقدام قابلِ تعریف ہے کہ وہ اپنے منظورِ نظر یعنی مشکوک ادیبوں کو نوازتی ہے۔ اگر وہ سچے ادیبوں کو بھی انعامات کے نشے کا عادی بنا دیتی یا انھیں وفود میں شامل کر کے غیر ملکوں کو روانہ کر دیتی تو ادب تخلیق کرنے کا کام کون کرتا۔ انیس ناگی کو چاہیے کہ وہ اکادمی کو اِس پر مبارک باد دیں کہ اس نے سچے ادیبوں کو اُن کے حال پر چھوڑ رکھا ہے اور مشکوک ادیبوں کو اکادمی کے مال پر چھوڑ رکھا ہے۔

انیس ناگی کا خیال ہے کہ پاکستان کی ادبی صورت حال کو خراب سے خراب تر کرنے میں اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "دیارِ غیر میں رہنے والے معمولی ہنر کے شوقین افراد کو ادبی ایڈیشنوں میں اہم ادیبوں اور شاعروں کے طور پر نمایاں کیا گیا۔ ان کی رقوم سے ان کی کتابوں کی اشاعت پر بڑے ادبی جلسے کرنے کا رواج ہوا۔ اس کے معاوضے کے طور پر غیر اہم شاعروں یا غیر شاعروں کے ایک گروہ کو دیارِ غیر میں مشاعروں میں مدعو کیا جاتا"۔

ہمیں تو اِس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کے حوالے سے شاعر بن گئے اور مشاعروں میں شرکت کے لیے بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی برائی نہیں کہ غیر ملکوں میں رہنے والے بعض آسودہ حال افراد اپنی محنت سے کمایا ہوا زرِ مبادلہ خرچ

کر کے صاحب دیوان شاعر بن جاتے ہیں۔ ہاں، اگر وہ کسی دوسرے کے خرچ پر صاحبِ دیوان بنتے تو یہ اعتراض کی بات تھی۔ ناگی صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اخبارات کے ادبی ایڈیشن مرتب کرنے والوں کو بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ آخر انھیں بھی زندہ رہنا ہے۔ اگر وہ غیر ملکوں میں مقیم آسودہ حال ادب دوستوں کو شہرت کی کھونٹی پر اُلٹا لٹکا کر، ان سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں تو ایسا کرنے کا انھیں حق ہے۔ یہ روزگار کا مسئلہ ہے، ادب کا نہیں۔

خیر یہ تو عام ادیبوں کے مسائل تھے، خود انیس ناگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے نئی شاعری کی جو تحریک چلائی تھی اسے اردو ادب کی ایک اہم تحریک سمجھا جائے اور ۱۹۶۰ء کے بعد کے سارے ادب کو اس تحریک کا خوشہ چیں ثابت کیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مخالفوں کا بھی ذکر کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں: "جو لوگ خشوع و خضوع کے ساتھ نئے شعرا پر ہزار لعنت بھیج رہے تھے، ان میں انتظار حسین پیش پیش تھے۔ وہ ہر شاعر پر پھبتی کستے اور نئے شعرا میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ انھیں غصہ یہ تھا کہ نئے شعرا نے ان کے مقابلے میں انور سجاد کی پشت پناہی کر کے اسے نئے افسانے کے اکھاڑے میں بھیجا تھا"۔ انیس ناگی نے "خشوع و خضوع" کو جس طرح استعمال کیا ہے اس کی داد تو اہلِ لغت دیں گے، فی الحال ہمیں انتظار حسین کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بروقت مناسب کارروائی کر کے اردو شاعری کو گمراہ ہونے سے بچالیا۔ انور سجاد سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ انھیں جن شاعروں نے اردو افسانے کے اکھاڑے میں دھکیلا تھا، وہ انھیں اکیلا چھوڑ کر خود جانے کہاں چلے گئے۔ انور سجاد کو اکھاڑے میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا، لہٰذا وہ مسلسل ورزش کیے جا رہے ہیں جس کا کوئی مثبت نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہوا۔

انیس ناگی نے اپنے مجموعۂ مضامین میں کئی ادیبوں کے بارے میں اپنے عجیب و غریب خیالات پیش کیے ہیں۔ فیض احمد فیض ہوں یا قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں یا انتظار حسین، وہ کسی سے مطمئن نظر نہیں آتے حالانکہ ان ادیبوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انیس ناگی کو مطمئن کرنے کے لیے ادب تخلیق کر رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر اور ان کے ناول "گردشِ رنگِ چمن" کے بارے میں انیس ناگی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کی شہرت اور مقبولیت سے وہ اتنے خائف ہیں کہ انھیں اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے، حالاں کہ

قرۃ العین حیدر کو انیس ناگی کے مستقبل سے تو کیا، ماضی و حال سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ موصوف کو شکایت ہے کہ اس سال کے شروع میں جب قرۃ العین حیدر لاہور آئیں تو وہ کسی پاکستانی ادیب سے تعارف کی خواہش مند نہیں تھیں۔ اس شکایت کی بنا پر انھوں نے قرۃ العین حیدر کے ناول کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے بارے میں بھی ایسی باتیں لکھ دیں جن سے خود انیس ناگی کی شخصیت کا کوئی اچھا تصور قائم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرۃ العین حیدر نے پاکستانی ادیبوں سے نہ مل کر احتیاط پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب انیس ناگی کی تنقیدی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی مزاج کی بھی آئینہ دار ہے۔ وہ ایک بڑے محقق کی حیثیت سے پہلی مرتبہ سامنے آئے ہیں۔ فیض احمد فیض پر انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں یوں دادِ تحقیق دی ہے: "وہ ۵۲ سال تک شعر و سخن کی دنیا آباد کرتے رہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے نقش فریادی میں ۲۲ نظمیں، ۱۲ غزلیں اور ایک قطعہ، دوسرے شعری مجموعے دست صبا میں ۱۹ نظمیں، ۱۲ غزلیں اور ۶ قطعات ہیں ....."۔

اسی انداز سے انیس ناگی نے فیض کے تمام مجموعوں کی صنف شماری کی ہے۔ اس بے مثال تحقیقی کام میں انھوں نے جو محنت کی ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اگر انیس ناگی تمام اہم شاعروں کے بارے میں اس قسم کے گوشوارے مرتب فرمادیں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس شغل کا ضمنی فائدہ یہ ہوگا کہ انیس ناگی کا وقت زیادہ مفید کام میں صرف ہوگا۔

مختصر یہ کہ مکالماتِ افلاطون کے بعد مکالماتِ انیس ناگی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(یکم دسمبر ۱۹۸۸ء)

شعری مجموعہ یا فرس نامہ

قمر جمیل ایک فرد کا نہیں، دبستان کا نام ہے۔ موصوف اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں اور انجمن بھی ایسی جو انجمن ترقیِ معکوس پسند مصنفین سے زیادہ بااثر ہے۔ قمر جمیل کے گرد ہر وقت نوجوان لکھنے والوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ یہ نوجوان بہت کچھ حاصل کرنے کی توقع میں آتے ہیں اور سب کچھ گنوا کر اٹھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قمر جمیل ہر ادبی ابجد خواں کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ بہت بڑا فنکار ہے، اپنے عہد کا ہومر ہے، شیکسپیر ہے، دانتے ہے۔ وہ بے چارہ اس کو سچ سمجھ لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ہومر، شیکسپیر اور دانتے تو کیا ابجد خواں بھی نہیں رہتا۔ ہم ایسے کئی نوجوانوں کو جانتے ہیں جنھیں قمر جمیل نے غلط فہمی کی سیڑھی کے ذریعے ادب کے قطب مینار کی چوٹی پر چڑھا دیا اور پھر نیچے سے سیڑھی کھینچ لی۔ قمر جمیل کے پاس ایک اور سیڑھی بھی ہے جس کا نام مجلسی تنقید ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے عہد کے بڑے بڑے ادیبوں کو ان کی عظمت کے مینار سے نیچے اتار کر اپنی ادب گاہ کے ابجد خوانوں کی صف میں بٹھا دیتے ہیں اور پھر اس قسم کی نثری نظمیں لکھتے ہیں :

میں اپنے گھر میں دیے کی طرح جلنا چاہتا تھا
مگر اب ایک فلیٹ میں
بلب کی صورت جل رہا ہوں

ممکن ہے بعض حسد پیشہ کوتاہ اندیش اس بلب کو زیرو پاور کا بلب قرار دے دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر جمیل ہزار کینڈل پاور سے کم نہیں ہیں۔ وہ ایک ایسا چراغِ انجمن افروز ہیں جس سے لوگوں کے ذہن کسبِ نور کرتے ہیں اور پھر بھی ماؤف نہیں ہوتے۔

مجلسی سطح پر قمر جمیل کی جو حیثیت ہے اس سے کہیں زیادہ حیثیت ان کی تخلیقی سطح پر ہے۔ وہ

بے مثال غزل گو ہیں۔ انھوں نے پابند نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد بھی۔ اور اب وہ ایک عرصے سے نثری نظمیں لکھ رہے ہیں جنھیں بعض لوگ مادر پدر آزاد شاعری کا نام دیتے ہیں۔ اس قسم کی انتہا پسندانہ رائے ہمیں قطعاً پسند نہیں۔ جس صنفِ ادب کے بانی انیس ناگی ہوں' اسے مادر پدر آزاد کہنا' آزادیِ اظہار کا ناجائز استعمال ہے۔ جس ملک میں لوگوں کو آزادیِ اظہار کے جائز استعمال کا بھی تجربہ نہ ہو وہاں ناجائز استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہم نے انیس ناگی کو نثری نظم کا بانی کہا ہے۔ ممکن ہے قمر جمیل کو ہماری یہ بات ناگوار گزرے کیوں کہ انھیں بھی نثری نظم کا بانی ہونے کا دعویٰ ہے لیکن حقائق سے انیس ناگی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ نثری نظم کیا' ہر ادبی فساد کے بانی وہی رہے ہیں۔

ہاں تو گفتگو ہو رہی تھی قمر جمیل کی شاعری کی۔ یہ ذکر اس لیے آیا کہ حال ہی میں ان کا مجموعۂ کلام "چہار خواب" شائع ہوا ہے جس کو دیکھنے سے آنکھیں اور پڑھنے سے ذہن روشن ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اس مجموعے کا سرورق قمر جمیل نے خود بنایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں۔ یہ سرورق اتنا زیادہ جاذب نظر ہے کہ قاری اسی میں محو ہو جاتا ہے اور اُسے کتاب کے باطن میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر اس کتاب پر صرف سرورق ہوتا اور اندر کے اوراق خالی ہوتے تو بھی یہ مجموعہ ہماشما کے مجموعوں پر بھاری ہوتا۔ خالی اوراق' مطبوعہ اوراق کے مقابلے پر اس لیے بہتر ہوتے ہیں کہ وہ کتاب خریدنے والے کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالتے۔

ہم نے قمر جمیل کو بہترین غزل گو کہا ہے۔ اس سے پہلے کہ پیشہ ور نقاد ہمارے اس دعوے کو رد کردیں اور ہم ان سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی رائے تبدیل کرلیں' یہ مناسب ہوگا کہ قمر جمیل کے کچھ خوب صورت اشعار پیش کردیے جائیں :

ہم بادِ بہاری ہیں کبھی آ کے ترے پاس
اے دوست تجھے نیند سے بیدار کریں گے

اجنبی ملکوں' اجنبی لوگوں میں آکر معلوم ہوا
دیکھنا سارے ظلم وطن میں لیکن ہجرت مت کرنا

کیسا عالم ہے کہ تنہائی بھی
در و دیوار سے ٹکراتی ہے

میں سوچ رہا ہوں کہ تری یاد سے پوچھوں
یہ پھول یہ شاخوں پہ دیے کس نے جلائے

ایک پتھر کہ دست یار میں ہے
پھول بننے کے انتظار میں ہے
اپنی ناکامیوں پہ آخرِ کار
مسکرانا تو اختیار میں ہے

یہ اشعار اردو غزل کی بہترین روایات کے نہ صرف آئینہ دار ہیں بلکہ ان کی توسیع بھی ہیں۔ اگر کوئی اس قسم کے دو چار شعر بھی کہہ لے تو اُسے اردو غزل کی تاریخ کے متن میں نہ سہی غلط نامے میں ضرور جگہ مل جائے گی۔ قمر جمیل نے اس قسم کے بیسیوں شعر کہے ہیں' اس لیے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز مقام کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اگر ہمارا یہ کالم ان کی نظر سے گزرے تو وہ ہماری سفارش نوٹ کرلیں۔ ڈاکٹر جالبی کے ہم پرانے نیاز مند ہیں لیکن ان کے شیخ الجامعہ ہونے کا فائدہ ہم نے کبھی نہیں اٹھایا' کبھی کسی کی سفارش نہیں کی کہ وہ اسے یونیورسٹی میں ملازمت یا داخلہ دلا دیں۔ حد تو یہ ہے کہ کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ ہمیں بی اے یا ایم کے اعزازی سند دلا دیجے۔ جب جعلی اسناد بازار میں سستے داموں مل جاتی ہیں تو ہم ڈاکٹر کا احسان کیوں لیں۔ یہ کون دیکھتا ہے کہ سند اعزازی ہے یا جعلی یا اصلی کیوں کہ ہر طرح کی سند رکھنے والے استعداد میں یکساں ہوتے ہیں۔

تاریخِ ادب میں داخلہ دلانے کی سفارش ہم محض اس لیے کر رہے ہیں کہ قمر جمیل کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ تاریخِ ادب لکھنے والوں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر ناانصافی ہو ہی جاتی ہے۔ جیسے مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں مومن کا ذکر

نہیں کیا تھا اور ذوق پر صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیے تھے۔ اسی طرح کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخِ ادب میں عبدالعزیز خالد پر صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیں اور قمر جمیل کا ذکر تک نہ آئے۔ صفحوں کی سیاہی کا کچھ حصہ انھیں بھی ملنا چاہیے۔

خوب صورت غزلیں لکھنے والے قمر جمیل نثری نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے ہمارا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ قمر جمیل کی نثری نظمیں معیاری نہیں ہوتیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے قاری اپنے آپ کو غیر معیاری سمجھنے لگتا ہے۔ اس صورت حال کے باوجود قمر جمیل کی نثری نظموں میں ہم جیسے عقیدت مندوں کے لیے تفریحِ طبع کا خاصا سامان موجود ہے۔ مثلاً ان کی نظم "آسمان سیاہ ہو چکا ہے" ہمیں بے حد پسند ہے۔ آپ بھی یہ نظم ملاحظہ کیجیے :

ہم ایک اطالوی گاؤں میں آ گئے ہیں
جہاں آسماں سیاہ ہو چکا ہے
میسولینی کی تقریریں اخروٹوں
کی شکل میں بک رہی ہیں

اس نظم کو پڑھ کر استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا : "اگر میسولینی کی تقریریں اخروٹوں کی صورت اختیار کر سکتی ہیں تو پھر ایک دن قمر جمیل کی نثری نظمیں مونگ پھلی کی شکل میں دست یاب ہوں گی"۔

ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ مونگ پھلی خاصے مہنگے داموں ملتی ہے۔ نثری نظم کی طرح مفت میں یا راستے میں پڑی ہوئی نہیں مل جاتی۔

قمر جمیل چونکہ نقاد بھی ہیں، اس لیے بعض نظموں پر تنقیدی مقالوں کا گمان گزرتا ہے، مثلاً نظم "سرو کے ایک درخت کا خواب" میں فرماتے ہیں:

"ناول بنیادی طور پر اپنے عہد کی زندگی کو پیش کرتا ہے اور شاعری دو غیر مماثل چیزوں میں مشابہت تلاش کرنے کا کام ہے۔ دو غیر مماثل چیزوں میں مشابہت پیدا کرنے سے ہمیں اتنی خوشی کیوں ملتی ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کے دو ہی طریقے ممکن ہیں۔ ایک تو کائنات میں وحدت تلاش کرنا، دوسرے اِس میں اور اِس کے خالق میں وحدت کی تلاش۔ یا پھر

اسے مالک اور اپنے کو غلام سمجھنا۔ شاعری ان دونوں نقاطِ نظر کا کام ہے۔ شاعری کا شعلہ ان دونوں نقاطِ نظر کے اتصال سے بھڑکتا ہے"۔

یہ کیسی نثری نظم ہے کہ جس میں مربوط جملے اور بامعنی عبارت ملتی ہے۔ قمر جمیل کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین بھی "چہار خواب" میں شامل کر دیتے۔ اس سے کم از کم ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعری کے دھوکے میں لوگ ان کے تنقیدی مضامین کو بھی پڑھ لیتے۔

قمر جمیل کی غزلوں میں "آئینہ" کلیدی لفظ ہے اور نثری نظموں میں "گھوڑا"۔ غزلوں میں آئینے کے حوالے سے اس قسم کے خوب صورت شعر ملتے ہیں :

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے

میں نے کچھ لوگوں کی تصویر اتاری ہے جمیل
اور کچھ لوگ چھپا رکھے ہیں آئینے میں

رات دریا آئینے میں اس طرح آیا کہ میں
یہ سمجھ کر سو گیا دریا نہیں اک خواب ہے

نثری نظموں میں گھوڑے کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے کہ پڑھنے والوں کو ہر طرف سے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اگر مثالیں پیش کی جائیں تو ہمارا کالم 'کالم نہیں رہے گا اصطبل بن جائے گا۔ لہٰذا صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے :

ہم گھڑ سواری سے واقف ہیں
گھوڑوں کی تربیت کرنا جانتے ہیں.....
سڑک پر زمستاں کی رات گھوڑا گاڑی
کے نیچے سوئی ہوئی ملتی ہے

گھوڑے اصطبلوں، سڑکوں اور گھڑ دوڑ کے میدانوں میں تو ہوتے ہی ہیں لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے، شاہ نامہ فردوسی کے بعد "چہار خواب" ہی میں انھیں اس کثرت سے کلیلیں کرتے دیکھا

جا سکتا ہے۔ گھوڑوں کے بارے میں ایک کتاب سعادت یار خان رنگین نے بھی لکھی تھی جس کا نام "فرس نامۂ رنگین" ہے۔ "چہار خواب" کو فرس نامۂ قمر جمیل سمجھنا چاہیے۔

اب آخر میں قمر جمیل کا ایک مزے دار شعر سنیے :

ہم تمھاری ہر ادا کے ناز برداروں میں ہیں
جی میں آتا ہے تو ہم کو بھی اٹھا کر بیچ دو

قمر جمیل کی اس خوش فہمی پر جی خوش ہوا۔ آج کل شاعر کا مجموعۂ کلام تو کوئی خریدتا نہیں، شاعر کو کون خریدے گا۔

(۱۰/ اپریل ۱۹۸۶ء)

دھان پان طنز و مزاح

خوشی کی بات ہے کہ مشہور ہندوستانی طنز و مزاح نگار یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین آج کل کراچی میں ہیں۔ یہ خوشی اس وقت دو آتشہ ہو گئی جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ قدم رنجہ کی ترکیب کا رنج و افسوس سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ عرض کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان جیسی دھان پان خاتون کا بھوپال سے کراچی آنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کے دھان پان ہونے کی بنا پر ہی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا حال بہت پتلا ہے۔ یہ درست نہیں۔ جس ملک میں یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور شفیقہ فرحت جیسے لکھنے والے موجود ہوں وہاں پڑھنے والوں کا حال تو پتلا ہو سکتا ہے، خود طنز و مزاح کا نہیں۔ ان تینوں نے اپنے اپنے انداز میں طنز و مزاح کو اتنا مقبول بنا دیا ہے کہ اب ہر اچھی تحریر پر طنزیہ یا مزاحیہ ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اس صورت حال کا اردو کے نقادوں کو خاص طور پر فائدہ پہنچا ہے۔ اب ان کی تنقیدوں کو پہلے سے زیادہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

محترمہ شفیقہ فرحت بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ پی ایچ ڈی کرنے والوں کا عام طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ جب کسی پرانے شاعر پر ری سرچ کرتے ہیں تو اس کا مُردہ خراب کرتے ہیں لیکن شفیقہ فرحت نے ایسا نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ خاتون ہونے کے سبب ان کے وسائل محدود ہیں۔ ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ بھوپال سے آگرے جاتیں، نظیر اکبر آبادی کا مُردہ تلاش کرتیں، اور پھر تحقیقی کام انجام دیتیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے محدود وسائل کے اندر رہ کر نہایت عمدہ تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نظیر کو انھوں نے از سرِ نو زندہ کیا ہے۔ گویا ان کی تحقیق مسیحائی کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ

الگ بات ہے کہ اہلِ تحقیق کسی کو زندہ کرتے ہی اس لیے ہیں کہ اسے دوبارہ مار سکیں۔

یہ مقالہ ابھی شائع نہیں ہوا اور ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس مقالے کی تعریف نہ کریں۔ ہم خدا کے فضل سے فلیپ نگاری اور دیباچہ نویسی میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ صرف مصنف اور کتاب کا نام سن کر موضوع کا حق ادا کردیتے ہیں۔ شفیقہ فرحت صاحبہ کا مقالہ چھپے گا تو ان شاء اللہ ہماری مذکورہ رائے حرف بحرف درست ثابت ہوگی۔ اگر خدانخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہونے کا امکان ہوا تو ہم محترمہ سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنا مقالہ شائع نہ کرائیں تاکہ ہماری تنقیدی بصیرت کا بھرم رہ جائے۔

شفیقہ فرحت صاحبہ بھوپال کے ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔ اگرچہ اس شغل اور تحقیق و تنقید کے شوق کے بعد طنز و مزاح لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن محترمہ نے اس شعبے میں بھی بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان کے دو مجموعے "لو آج ہم بھی" اور "رانگ نمبر" شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "گول مال" زیرِ طبع ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی کے شاہد علی خان صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کتاب کو بہت جلد شائع کردیں گے اور محترمہ کے پاکستان قیام کے دوران ان کے پاکستانی پتے پر بھجوادیں گے۔ شاہد علی خان صاحب سے گزارش ہے کہ وہ شوق سے وعدہ پورا کریں لیکن کتاب کا پورا ایڈیشن یہاں نہ بھجوائیں، کچھ نسخے ہندوستانی مستحقین میں تقسیم کے لیے بھی روک لیں، ورنہ ہندوستان کے ادب دوستوں کو شکایت ہوگی کہ ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ پاکستان کے ادب دوست بھی خوش ہو جائیں گے کہ انھیں پورے ایڈیشن کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ محترمہ کی یہ زیرِ طبع کتاب اچھی ہوگی۔ اردو کی ہر کتاب اس وقت تک اچھی ہی ہوتی ہے جب تک وہ زیرِ طبع رہتی ہے۔ اسی لیے تو بعض کتابیں سال ہا سال زیرِ طبع رہتی ہیں اور اسی حالت میں زیرِ خاک چلی جاتی ہیں۔

محترمہ صحیح معنوں میں شگفتہ نگار ہیں۔ ان کے طنز میں گہرائی اور مزاح میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایسے جملے جابجا ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے پطرس کی روح ان میں سما گئی ہو۔ ممکن ہے یہ جملہ پڑھ کر بعض لوگ کہیں کہ ان دھان پان خاتون کے جسم میں خود ان کی اپنی روح مشکل سے سمائی ہوگی تو پطرس کی روح کیسے سما سکتی ہے؟ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم یہ کالم اردو زبان میں لکھ رہے ہیں اور اردو میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں کی روح

فلاں کے جسم میں آگئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ روح نے واقعی نقل مکانی کی ہے بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک کی خصوصیات دوسرے میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا پطرس کی روح سے معافی چاہتے ہوئے عرض ہے کہ ہماری اس رائے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ پطرس کی تحریروں کی بہت سی خصوصیات شفیقہ فرحت کی تحریروں میں نظر آتی ہیں، مثلاً برجستگی، ذہانت اور لطافت وغیرہ۔ لفظ "وغیرہ" ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ہمیں خود بھی پطرس کی تحریروں کی بقیہ خصوصیات کا علم نہیں ہے۔ جن قارئین کو علم ہو، وہ لفظ "وغیرہ" کی جگہ ان خصوصیات کا تصور کرلیں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ عادتاً یہ اعتراض کریں کہ ہم نے جس طرح محترمہ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ پڑھے بغیر اپنی "گراں قدر" رائے ظاہر کی ہے، اسی طرح ہم نے محترمہ کی طنزیہ و مزاحیہ کتابیں پڑھے بغیر اوپر کا پیراگراف لکھا ہے۔ یہ اعتراض درست نہیں۔ ہم بقید ہوش و حواس عرض کرتے ہیں کہ ہم نے محترمہ کی دو کتابیں "لو آج ہم بھی" اور "رانگ نمبر" لفظاً لفظاً پڑھی ہیں۔ البتہ یہ یاد نہیں کہ پڑھنے کے دوران ہم بقید ہوش و حواس تھے یا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محترمہ کی تحریر میں ایسا جادو ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ سے بھی غافل ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب کی خوبی ہے، ہماری نہیں۔ ہماری خوبی صرف اتنی ہے کہ مذکورہ کتابیں پڑھتے ہوئے ہم اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم بقیدِ حیات ہیں اور یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

ہماری ایک عادت ہے کہ جب کسی لکھنے والے کی کوئی تحریر پسند آجائے تو اُس سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ محترمہ کی تو پوری دو عدد تصانیف ہماری پسندیدہ کتابوں میں شامل ہیں، لہٰذا جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کراچی تشریف لائی ہیں تو ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ نہایت نستعلیق، خوش گفتار اور پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ وہ ہمارا کالم باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ فرمانے لگیں: "دو تین مہینے قبل آپ نے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو طنز و مزاح نگار ہیں، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین، آپ نے تو ہمارا پتا ہی کاٹ دیا"۔ ہم نے اپنی جہالت اور نادانی پر معذرت پیش کرنے کے ساتھ عرض کیا: "دروغ گو را حافظہ نباشد کے مصداق ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ ہمیں بالکل یاد نہیں رہتا۔ آپ فرما رہی ہیں تو ضرور ہم نے یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے گُن گائے ہوں گے، ہم اس غلطی پر نادم ہیں"۔

کہنے لگیں: "اس غلطی پر جب وہ دونوں نادم نہیں ہیں تو آپ کو نادم ہونے کی کیا ضرورت ہے، بہرحال آپ کو سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے"۔ اس کے جواب میں ہم نے کہا: "آج کل کون سوچ سمجھ کر لکھتا ہے، آپ ہم پر یہ غیر ضروری پابندی کیوں لگانا چاہتی ہیں"؟ انھوں نے حکم دیا: "بہرحال کچھ بھی ہو، آپ کو اپنی غلطی کی تلافی کرنی چاہیے"۔

ہم نے اس کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا: "ہم جب آپ پر کالم لکھیں گے تو یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین دونوں کا پتّا کاٹ دیں گے"۔ محترمہ اس بات سے خوش ہو کر کہنے لگیں: "میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ اِن دونوں کو بالکل نظرانداز کردیں، لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کو انصاف سے کام لینا چاہیے۔ ہندوستان میں طنز و مزاح لکھنے والے اور بھی ہیں، آپ کو اُن سب پر نظر رکھنی چاہیے"۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا: "ہندوستان کی تو آدھی آبادی کا یہی شغل ہے۔ ہم کہاں تک ہر ایک پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ہر وقت ہندوستانی مزاح نگاروں کی نگہ داشت کرتے رہیں"۔

محترمہ ہمارے اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گئیں۔ معلوم نہیں ہمارے اس کالم سے بھی وہ مطمئن ہوں گی یا نہیں۔ ہم نے حسبِ وعدہ اِس کالم کی حد تک یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کا پتّا کاٹ دیا ہے تا کہ اِن کٹے ہوئے پتّوں کو معلوم ہو کہ ہندوستان میں طنز و مزاح لکھنے والے اور بھی ہیں۔

(۹/ جون ۱۹۸۸ء)

شاعری یا عذابِ الٰہی

ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ منیر نیازی شاعری اچھی کرتے ہیں یا باتیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف قوس قزح کے رنگ برس رہے ہوں اور ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے وہ خود برس رہے ہوں۔ وہ غصے میں آجاتے ہیں تو اچھے اچھوں کی، یہاں تک کہ خود اپنی بھی پروا نہیں کرتے۔ اشخاص ہوں یا ادارے، ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیتے، جو جی میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں۔

گفتگو کے دوران ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ وہ نغز گو شاعر کی بجائے، شاعر کے اندر رہنے والا معصوم بچہ بن جاتے ہیں۔ ایک ایسا بچہ جو ہر کھلونے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ منیر نیازی کا پسندیدہ کھلونا رائٹرز گلڈ کا ادبی انعام ہے۔ ان کے جتنے انٹرویو بھی چھپے ہیں ان میں وہ رائٹرز گلڈ کے انعامات کی تقسیم میں بدعنوانیوں کا ذکر ضرور کرتے ہیں، حالاں کہ اب زمانہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ خود رائٹرز گلڈ کا شمار بھی بدعنوانیوں میں ہوتا ہے۔

منیر نیازی کی معصومیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فیض احمد فیض کے انتقال کے بعد اُن سے کسی نے پوچھا: "فیض کی موت سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنے کے لیے آپ کس کا نام پیش کریں گے"؟ انھوں نے فرمایا: "یہ بات میرے سوچنے کی نہیں، آپ لوگوں کے سوچنے کی ہے"۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ فیض اپنے پیچھے بے مثال کلام کے کئی مجموعے چھوڑ گئے ہیں، اب معلوم ہوا کہ خلا ہی خلا ہے جسے منیر نیازی پُر کریں گے۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا تھا کہ ہندوستان میں منیر نیازی کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ بات منیر نیازی کو اتنی پسند آئی کہ وہ ایک عرصے تک ہر جگہ اس کا حوالہ دیتے رہے۔ ایک دن کسی

ستم ظریف نے ان سے کہا: "ہندوستان میں تو گائے اور پتھر پوجے جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی کیوں پوجے گا"۔ منیر نیازی نے جواب دیا: "آپ سنی سنائی بات کر رہے ہیں' نارنگ نے آنکھوں دیکھی بیان کی ہے"۔ ستم ظریف نے گرہ لگائی: "نارنگ مذاق بھی تو کر سکتے ہیں"۔ منیر نیازی نے یہ کہہ کر اُن صاحب کا منھ بند کر دیا: "نارنگ صرف تنقیدی مضامین میں مذاق کرتے ہیں' گفتگو میں وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں"۔

منیر نیازی کا تازہ ترین انٹرویو جو حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار میں شائع ہوا ہے' ان کے پچھلے تمام انٹرویوز سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں غصہ بھی اپنے عروج پر ہے اور معصومیت بھی۔

منیر نیازی سے سوال کیا گیا: "کیا مشاعروں سے شاعری کو فائدہ پہنچ سکتا ہے"۔ منیر نیازی نے جواب دیا: "ہاں پہنچتا ہے ... ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں شعرا پیدا ہوئے ہیں جو سوسائٹی میں ادب کا شوق پیدا کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف نقص یہ ہے کہ وہ جو مضامین نظم بند کر رہے ہیں ان میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ایک ہی بات کو رگڑے جا رہے ہیں۔ حرف کی تکرار سے انھوں نے ذہنوں کو بوجھل کر دیا ہے۔ پریشان کر دیا ہے قاری کو"۔

منیر نیازی ایک طرف تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری قوم میں شاعر پیدا ہوئے ہیں' دوسری طرف انھیں شکایت ہے کہ شعرائے کرام قاری کو پریشان کر رہے ہیں۔ منیر نیازی کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس رفتار سے شعرائے کرام پیدا ہو رہے ہیں' اس کے مقابلے پر قارئین کی شرحِ پیدائش بہت کم ہے' اور اس کا امکان ہے کہ آگے چل کر یہ جنس بالکل معدوم ہو جائے۔ ایسی صورت میں قاری کی پریشانی کا تذکرہ غیر ضروری ہے' شعرائے کرام کی پیدائش پر شکر ادا کرتے رہنا ہی کافی ہے۔ نیز اُس عذابِ الٰہی سے ڈرتے رہنا چاہیے جو شاعروں کی صورت میں قوموں پر مسلط کیا جاتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا: "نئی نسل کے شعرا نے آپ کو اپنا آئیڈیل بنایا اور پچھلی دو دہائیوں کے شعرا نے آپ کی شاعری کو سامنے رکھ کر اپنا اسلوب بنانے کی کوشش کی۔ یہ سب لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں' آپ کے سامنے ہے۔ آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ پُر امید ہیں"۔

اس کا یہ جواب عطا ہوا: "یہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنا آئیڈیل بناتے ہیں اور پھر اُن کی اپنی خودی بیدار ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں ہم پر کسی کا سایہ نہیں .... ان لوگوں میں بیشتر کا بڑا

چرچا رہا۔ پانچ دس برس بعد ان کا پتا ہی نہیں ملتا"۔

ہمیں ان شاعروں سے دلی ہمدردی ہے جنھوں نے منیر نیازی کو اپنا آئیڈیل بنایا اور پانچ دس برسوں ہی میں بے نام و نشان ہو گئے۔ ہمیں منیر نیازی سے بھی ہمدردی ہے کہ انھیں وہی شاعر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں جن کی خودی بہت جلد بلکہ وقت سے پہلے بیدار ہو جاتی ہے۔ دراصل اس معاملے میں ان شاعروں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ سارا قصور علامہ اقبال کا ہے جنھوں نے قوم کو خودی کی بیداری کا سبق پڑھایا۔ قوم نے تو اس تلقین کا کوئی اثر نہ لیا' شاعر چونکہ حساس ہوتے ہیں' اس لیے وہ فوراً علامہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ اور یوں منیر نیازی کو اپنا آئیڈیل بنانے والے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی تھا: "جب نئی نسل نے آپ کو آئیڈیل بنایا تو کیا آپ خود بھی سمجھتے ہیں کہ آپ نے آئیڈیل شاعری کی ہے"۔ منیر نیازی نے اس کے جواب میں کہا: "میں نے تو اپنے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ یہ تو تم لوگ ہی مجھے آکر بتاتے ہو کہ آپ بڑے منفرد شاعر ہیں۔ آپ تو آئیڈیل ہیں ہمارے۔ میں کچھ دیر تو اس مزے میں رہتا ہوں لیکن پھر میں اس مزے اور چارم سے آزاد ہو جاتا ہوں"۔

یہ عجیب قصہ ہے کہ آئیڈیل بنانے والے منیر نیازی کے اثرات سے اور خود منیر نیازی آئیڈیل بننے کے مزے اور چارم سے بہت جلد آزاد ہو جاتے ہیں۔ آزادی اچھی چیز ہے مگر ایسی بھی کیا آزادی جس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو!

منیر نیازی نقادوں سے سخت بیزار ہیں۔ فرماتے ہیں: "عبادت بریلوی اور اپنے تمام سینئر نقادوں کو میں نے پڑھا ہے اور دیکھا بھی۔ وہ ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور ظلم یہ ہوا کہ تنقید کا سارا علم جو انھوں نے حاصل کیا' اس کو کسی غلط آدمی پر صرف کر دیا۔ غلط آدمی کی گواہی دینا بڑا خطرناک کام ہے ... یہ سب کچھ کام چلانے کے لیے ہو رہا ہے۔ کہیں محکمانہ ترقی کے لیے' کہیں نوکری کے لیے' کہیں گروہ بندی کے لیے' انھیں یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک چکر ہے جو چلتا رہتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی خلوص نہیں ہے۔ سب دکانیں چمکا رہے ہیں۔ اگر یہ نقاد بھرے پیٹ کے لوگ ہوتے تو شاید ایسا نہ ہوتا اور اگر ان کے پاؤں کے نیچے زمین ہوتی تو شاید یہ لوگ ایسی بات نہ کرتے"۔

منیر نیازی کا یہ کہنا کہ انھوں نے عبادت بریلوی وغیرہ کو پڑھا ہے' ایک ناقابل یقین دعویٰ ہے۔ اس قسم کے نقادوں کو پڑھنے کے بعد شاعری تو کیا' روز مرہ اخلاق کا معیار برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ منیر نیازی نے اگر ان نقادوں کو پڑھا ہوتا تو وہ ہرگز اتنے اچھے شاعر نہ ہوتے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منیر نیازی' تنقید تو کیا' کوئی چیز بھی پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ٹی وی کے ایک مذاکرے میں حصہ لیا اور شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ مذاکرے کے آخر میں سراج منیر نے منیر نیازی سے کہا: "آپ کی خاموشی ہماری گویائی پر حاوی ہو گئی"۔ انھوں نے جواب دیا: "مجھے کتابی گفتگو میں داخل ہونے کا دروازہ نہیں ملتا"۔ یہ واقعہ خود منیر نیازی نے زیر تبصرہ انٹرویو میں بیان کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ منیر نیازی کو کتابی گفتگو اور کتاب' دونوں ہی کا دروازہ نہیں ملتا۔

ایک سوال یہ تھا: "آپ کو اپنے ہم عصروں میں کوئی ایسا شاعر بھی نظر آیا جسے شاعری کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جا سکے"؟ جواب یہ تھا: "میرا تو جی چاہتا ہے سبھی کو اعلیٰ مقام پر فائز کر دوں تا کہ یہ آپس میں جھگڑنا بند کر دیں۔ میرا بس چلے تو ایک منسٹری بناؤں جس میں سب کو وزیر کر دوں"۔

مطلب یہ کہ منیر نیازی کا جی تو چاہتا ہے کہ سبھی شاعروں کو اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا جائے لیکن ان میں کوئی اس منصب کا اہل ہی نہیں۔ منسٹری والی بات بھی مزے کی ہے۔ پہلے تو منیر نیازی اقتدار کے اس درجے پر فائز ہوں گے جہاں منسٹری قائم کرنا ان کے اختیار میں ہوگا اور پھر ایک ہی منسٹری میں بہت سے شاعروں کو وزیر بنا دیا جائے گا تا کہ انھیں جھگڑنے کے مواقع پہلے سے زیادہ ملیں۔

سوال کرنے والے نے ایک موقع پر مبارک احمد کو نثری نظم کا بانی قرار دیا تو منیر نیازی نے کہا: "بھئی مجھے تو وہ بانی نہیں لگتا۔ بلکہ مجھے آپ کا قمر جمیل زیادہ بانی لگتا ہے۔ ایک بار مجھے سراج منیر نے بتایا کہ یہاں (لاہور) سو فٹ کنواں کھود کر پانی نکلتا ہے تو کراچی میں قمر جمیل نے ایک ایک فٹ کے سو کنویں کھود دیے ہیں۔ ان کی پینٹنگ سے وابستگی' آرٹ سے دلچسپی' شاعری سے وابستگی' تنقید سے دلچسپی ایک ایک فٹ کے کنویں کھودنے والی بات ہے"۔

ہم نے تو یہ سنا تھا کہ بعض لوگ نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ اب معلوم ہوا کہ شاعری' مصوری اور تنقید وغیرہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے کنویں کھودنے پڑتے ہیں۔

(۵/ فروری ۱۹۸۷ء)

دنیادار صوفی

پچھلے دنوں انیس ناگی نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں اشفاق احمد کو "کامیاب ادیب" کہا تھا۔ اس کے جواب میں اشفاق احمد نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا ہے کہ انیس ناگی کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اشفاق احمد کو اگر انیس ناگی کی شاعری سمجھ میں نہ آئے تو اِس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کی سخن گوئی اور دوسرے کی سخن فہمی "عالمِ بالا" سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن انیس ناگی کی ایک سیدھی سادی بات جس میں کوئی ابہام ہے نہ تجریدیت' اس کا اشفاق احمد جیسے ذہین شخص کی سمجھ میں نہ آنا تعجب کی بات ہے۔ حالاں کہ اشفاق احمد نے مذکورہ انٹرویو میں انیس ناگی کے خیال کو بڑے فخر کے ساتھ ان لفظوں میں واضح کیا ہے: "میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ بڑا چالاک آدمی ہے۔ حکومت بدلتی ہے تو ساتھ ہی بدل جاتا ہے"۔ اس کی مزید توضیح عطاء الحق قاسمی نے کی جو انٹرویو لے رہے تھے۔ انھوں نے اشفاق احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "آپ نے ایوب خان کی حمایت کی تھی' اور اب جنرل ضیا کی حمایت کر رہے ہیں"۔

ہمیں شبہہ ہے کہ اشفاق احمد بقول خود چالاک آدمی ہیں۔ چالاک تو وہ حکومتیں ہیں جو اشفاق احمد کی خوشنودی کے لیے سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ حکومت کرنے والے یکے بعد دیگرے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ اشفاق احمد جہاں تھے وہیں ہیں۔ نہ کہیں سے آئے نہ کہیں گئے۔ اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے اور اسی لیے انیس ناگی نے انھیں "کامیاب ادیب" کہا ہے۔ انیس ناگی چاہتے تو انھیں "کامیاب انسان" بھی کہہ سکتے تھے لیکن "ادیب" کہہ کہ انھوں نے واضح کر دیا کہ ادب دنیاداری ہی کا دوسرا نام ہے۔

دنیاداری والی بات عطاء الحق قاسمی نے بھی کہی ہے۔ انھوں نے سوال کیا: "غالباً منیر نیازی یا

انتظار حسین نے آپ کے حوالے سے کہا تھا کہ اشفاق ایسا صوفی ہے جو کمر کمر تک دنیا میں دھنسا ہوا ہے۔ اس پر آپ کے کیا خیالات ہیں"؟ اشفاق احمد نے جواب دیا: چونکہ منیر کو مجھ سے محبت ہے اور انتظار کو بھی۔ دراصل وہ گلے گلے تک کہنا چاہتے تھے۔ میں ترمیم کر دیتا ہوں۔ بخدا میری صرف تھوتھنی باہر ہے جس سے میں سانس لے رہا ہوں ورنہ دنیا تو میرے ساتھ ایسی چمٹی ہوئی ہے یا میں چمٹا ہوا ہوں کہ میرے ساتھیوں میں تو غالباً ایک دو ہی ایسے ہوں گے"۔

غالباً ایک دو بھی ایسے نہیں ہوں گے۔ اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ ان کی ایک ہتھیلی پر تصوف ہے اور دوسری پر دنیا۔ وہ یاد نہیں رکھتے کہ کس ہتھیلی پر کیا ہے۔ لہٰذا تصوف سے کاروبارِ دنیا کو اور دنیاوی سوجھ بوجھ سے مسائلِ تصوف کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا لیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔ رہا مشاہدہ تو اُس کا تعلق ان سے نہیں ہم جیسے نیازمندوں سے ہے کہ اشفاق احمد اور ان کے تصوف کو حیرت کی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

اشفاق احمد کے جس انٹرویو سے اس وقت استفادہ کیا جا رہا ہے وہ اخبار "نوائے وقت" لاہور میں شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشہ ایک کرم فرما نے بھیجا ہے اور ساتھ ہی اپنے خط میں یہ لکھا ہے کہ: "اسے پڑھیے اور عبرت حاصل کیجیے"۔ ہم نے اسے پڑھا ضرور ہے لیکن عبرت حاصل نہیں کی' کیوں کہ اس کے حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ اشفاق احمد کی تصانیف ہیں جن سے ہم اکثر استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ اشفاق احمد سے پوچھا گیا: "منٹو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"؟ انھوں نے فرمایا: "منٹو عمر میں مجھ سے تھوڑا سا چھوٹا ہونے کے باوجود بڑا اچھا دوست تھا۔ مجھے بہت ہی پیارا تھا۔ منٹو کے بارے میں مجھے ایک خدشہ تھا کہ یہ بہت جلد ادبی طور پر مرجائے گا' تو ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنے زمانے میں نہایت اچھی چیزیں لکھیں۔ مزے دار بھی تھیں۔ صحافیانہ بھی تھیں۔ صحافیانہ چیزیں صحافت میں یا فائلوں میں تو محفوظ رہ سکتی ہیں لیکن ادب میں نہیں"۔

منٹو کے بارے میں اشفاق احمد کی اس رائے پر ممکن ہے بعض لوگوں کو تعجب ہو لیکن ہمیں تعجب نہیں ہوا۔ اشفاق احمد اگر اِس کے برعکس رائے دیتے تو مقامِ تعجب تھا۔ اشفاق احمد کا یہ کہنا کہ منٹو انھیں بہت پیارا تھا' اگرچہ منٹو کے ادبی طور پر مرجانے کی معقول وجہ ہو سکتی ہے' لیکن اشفاق احمد نے اسی پر اکتفا نہیں کی' یہ بھی کہا ہے کہ منٹو نے جو کچھ لکھا ہے' وہ صحافیانہ ہے۔ اگر وہ یہ بھی بتا دیتے کہ منٹو کے افسانے کن اخباروں میں بطور اداریہ شائع ہوا کرتے تھے تو اُن کی بات

میں وزن پیدا ہو جاتا۔ اِن اخباروں کے حوالے سے اُن نقادوں اور ادب دوستوں کی بے بصیرتی پر افسوس کیا جا سکتا ہے جنھوں نے منٹو کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مشہور کر رکھا ہے۔

ہمیں اشفاق احمد سے ایک نیاز مندانہ شکایت ہے کہ انھوں نے منٹو کی ادبی موت کا اعلان خاصی تاخیر سے کیا ہے۔ اگر وہ یہ فریضہ ۲۰۔۲۵ سال پہلے انجام دے دیتے تو آج بجائے منٹو کے کسی ایسے شخص کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار تسلیم کر لیا جاتا جس کی تحریریں صحافت کی سطح سے بلند ہیں۔ اتنی بلند کہ ٹیلی ویژن کی سطح تک پہنچ جاتی ہیں۔

ٹیلی ویژن کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی سن لیجے کہ اشفاق احمد کا خیال ہے کہ انھوں نے ٹیلی ویژن کے لیے جو کچھ لکھا ہے اُس کا درجہ اُن کی اُن تحریروں سے بہت بلند ہے جنھیں ادبی تخلیقات کہا جاتا ہے۔ گویا منٹو ادب تخلیق کریں تو وہ صحافت ہے اور اشفاق احمد صحافت سے بھی کم درجے کی چیزیں لکھیں تو وہ ادبی تخلیقات سے بہتر ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

اشفاق احمد نے منٹو سے جو سلوک کیا ہے، ممکن ہے اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ موصوف اپنے سامنے کسی کا چراغ جلتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ایسا سوچنا اشفاق احمد کے ساتھ بڑی زیادتی ہو گی۔ وہ تو اتنے منکسر المزاج ہیں کہ جہاں کہیں کوئی اپنے سے بہتر نظر آتا ہے (وہ ان کے گھر کا کوئی فرد ہی کیوں نہ ہو) اس کی برتری کا اور اپنی کمتری کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً اشفاق احمد کی بیگم، بانو قدسیہ کا ذکر چلا تو انھوں نے فرمایا: "ابتدا میں بانو قدسیہ ایک درمیانے درجے کی لکھنے والی تھی لیکن اب ان سے ڈرتا ہوں۔ ان کی کہانیاں پڑھتا ہوں۔ راجہ گدھ بھی آدھی پڑھ لی ہے۔ ڈرامے بھی دیکھتا ہوں تو خوف سا آنے لگتا ہے۔ وہ ان سارے معاملات میں مجھ سے آگے ہے"۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اشفاق احمد نے بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" آدھا پڑھ لیا ہے۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ باقی آدھا نہ پڑھیں، ورنہ انھیں بانو قدسیہ کے ڈراموں کی طرح ان کے ناول سے بھی خوف آنے لگے گا۔ اور ہاں اس ناول پر اشفاق احمد نے فلیپ بھی لکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ انھوں نے ناول پڑھ کر لکھا ہو گا، اب معلوم ہوا کہ یہ تو آدھا ناول پڑھنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

(یکم مئی ۱۹۸۶ء)

عذرِ شاعری بدتر از شاعری

ایک زمانہ تھا کہ نقادوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا لیکن جب سے ہمارے ادیبوں نے سر اور آنکھوں سے کام لینا چھوڑ دیا ہے تب سے نقادوں کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ نقاد کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، وہ تخلیق کار نہیں ادبی طفیلیہ (PARASITE) ہے جس کا وجود تخلیقی ادیبوں کی نگارشات کا مرہونِ منت ہے۔ وہ بزعمِ خود ادبی تخلیقات کو پرکھ کر اچھے برے کا فیصلہ کرتا ہے، جب کہ کسی ادبی تخلیق کو کوئی ایسا شخص پرکھنے کا حق اور صلاحیت نہیں رکھتا جو خود تخلیق کار نہ ہو۔ مطلب یہ کہ جسے غزل کہنے کا یا افسانہ لکھنے کا تجربہ نہ ہو، اسے کیا معلوم غزل کیا ہوتی ہے اور افسانہ کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا غزل کا نقاد وہی ہے جو غزل لکھتا ہے۔ افسانے کو پرکھنے کی صلاحیت اسی میں ہوگی جو افسانہ لکھتا ہے۔

ہم نے جب اس معاملے میں ایک نقاد دوست سے راہ نمائی طلب کی تو اُنھوں نے اس انتہاپسندانہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا: "اگر موجودہ دور کے غزل گو شاعروں اور افسانہ نگاروں میں تنقیدی بصیرت ہوتی اور وہ اچھے برے میں تمیز کرنا جانتے تو آج کے ننانوے فی صد غزل گو اور افسانہ نگار ادب کو خیرباد کہہ کے کوئی آبرومندانہ پیشہ اختیار کرتے۔ ہر غزل گو اپنی غزل کو اور ہر افسانہ نگار اپنے افسانے کو اعلیٰ درجے کی تخلیق سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق ہی مٹ گیا ہے"۔

موصوف نے یہ بھی کہا: "نقادوں کے خلاف جو عام فضا پیدا ہوئی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ادیب یہ چاہتا ہے کہ نقاد اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہیں۔ نقاد کبھی کبھار مروت میں آکر تو جھوٹی تعریف کر سکتے ہیں لیکن ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ

جھوٹ کا کاروبار کرتے رہیں۔ جھوٹی غزلیں اور جھوٹے افسانے لکھنے والے چاہتے ہیں کہ نقاد بھی دروغ کے فروغ میں حصہ لیں"۔

ہم نے عرض کیا: "اگر نقاد حق پر ہیں اور تنقید نگاری ایک باعزت کام ہے تو پھر مشہور نقاد ڈاکٹر شمیم حنفی نے یہ کیوں کہا ہے کہ مجھے اس بات سے خوف آتا ہے کہ قیامت کے دن مجھے نقادوں میں سے اٹھایا جائے"۔

اس کے جواب میں موصوف نے فرمایا: "شمیم حنفی کا معاملہ انفرادی ہے۔ وارث علوی نے ان کی کتاب 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پر جو تبصرہ لکھا تھا وہ تبصرہ نہیں تھا چارج شیٹ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حشر کے دن شمیم حنفی کے نامۂ اعمال کے ساتھ وارث علوی کا تبصرہ دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس خوف کی وجہ سے شمیم حنفی کی خواہش ہے کہ قیامت کے دن انھیں نقادوں میں سے نہ اٹھایا جائے"۔

ہم نے ڈاکٹر شمیم حنفی کے حوالے سے اس بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ ہمیں معلوم ہے، حنفی صاحب صفِ اول کے تخلیق کار بھی ہیں، اس بنا پر تنقید اُن کے لیے ذریعۂ عزت نہیں ہے بلکہ وارث علوی کے تبصرے کے بعد ذریعۂ رسوائی بنی ہے۔ لہٰذا ہم نے اپنے نقاد دوست سے ایک دوسرے معاملے میں رہنمائی چاہی اور یہ سوال کیا: "یہ کہاں تک درست ہے نقاد چونکہ تخلیق کار نہیں ہوتے، اس لیے وہ کسی ادبی تخلیق کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہیں کر سکتے"؟

انھوں نے فرمایا: "آپ سے کس نے کہہ دیا کہ نقاد تخلیق کار نہیں ہوتے۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، احتشام حسین اور کلیم الدین احمد شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام رسالوں میں چھپتا رہا ہے۔ کلیم الدین احمد کی شاعری کے تو دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں"۔

ہم نے عرض کیا: "ان نقادوں کی شاعری ہماری نظر سے گزر چکی ہے۔ اس کے بعد ہی سے ہم ضعفِ بصارت کا شکار ہوئے ہیں۔ نیاز، مجنوں اور احتشام حسین کی شاعری کسی لائق ہوتی تو وہ اپنے مجموعے ضرور چھپواتے۔ انھیں احساس تھا کہ وہ اچھے شاعر نہیں ہیں۔ البتہ کلیم الدین احمد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ وہ اچھے شاعر ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے مجموعے چھپوا دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس بات کا انھیں احساس نہیں تھا دوسروں کو ہو گیا۔ کلیم الدین احمد نے دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے شاعری کے اعلیٰ معیاروں کو سامنے رکھا لیکن جب خود شاعری کی تو ان

سارے معیاروں کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو بڑا شاعر منوانے کے لیے اپنے دونوں مجموعوں پر اپنے دو شاگردوں سے الگ الگ تنقیدی کتابیں لکھوائیں مگر ان کی شاعری تنقیدی قصیدوں کے زور پر بھی نہ چل سکی"۔

نقاد دوست نے ہماری الٹی سیدھی باتیں نہایت صبر و تحمل سے سنیں اور اُن کے جواب میں صرف اتنا کہا: "آپ کلیم الدین احمد سے زیادتی کر رہے ہیں۔ وہ اقبال کی صف کے شاعر ہیں"۔ ہم نے کہا: "بشرطے کہ اقبال کو شاعروں کی آخری صف میں کھڑا کر دیا جائے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلیم الدین احمد اور اقبال کے کلام میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اقبال کی نظم 'ہمالہ' کا ایک شعر ہے:

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

کلیم الدین احمد ایک نظم میں فرماتے ہیں:

دور دور نظروں سے
کوہ سر اٹھاتے ہیں
آسماں کو چھوتے ہیں
ان کی برف کی دستار
زرق برق کیسی ہے

کلیم الدین احمد اور اقبال کی شاعری میں یہ مماثلت بھی ہے کہ کلیم الدین احمد نے اپنے مجموعے 'بانگ درا' کے سائز میں چھپوائے ہیں"۔

ہمارے نقاد دوست بہت خوش ہوئے کہ ہم نے کلیم الدین احمد اور اقبال میں دو مماثلتیں ہاتھ کے ہاتھ دریافت کر لیں۔ اسی خوشی میں انھوں نے فرمایا: "ڈاکٹر محمد حسن کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے"؟ ہم نے جواب دیا: "بلاشبہہ ان کی تنقید جملہ شاعرانہ محاسن کی حامل ہے اور اس اعتبار سے وہ اچھے شاعر ہیں"۔ وہ کہنے لگے: "اُس شاعری کی بات نہیں جو وہ تنقید میں کرتے ہیں بلکہ ان کی سچ مچ کی شاعری کے بارے میں آپ کی رائے طلب کی ہے"۔ ہم نے جب ڈاکٹر محمد حسن کے باقاعدہ شاعر ہونے سے لاعلمی کا اظہار کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب بہت

بلند پایہ شاعر ہیں اور اُن کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔ اس گفتگو کے چند روز بعد انھوں نے یہ مجموعہ عنایت فرمایا اور ہم نے اس سے استفادہ کیا۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مجموعۂ کلام کا نام "زنجیرِ نغمہ" ہے حالاں کہ مطالب کے اعتبار سے یہ اس لائق ہے کہ اس کا نام "فیلِ بے زنجیر" ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب نے شاعری کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو فیلِ بے زنجیر اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز سے کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے شاعری کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے لیکن ان کی نظمیں سیاسی نہیں ہیں بلکہ ایک "وسیع فلسفیانہ نظام" کی آئینہ دار ہیں۔ اس فلسفیانہ نظام کی آئینہ داری کی ایک آدھ مثال بھی پیش کر دی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک نظم ہے "لکھنؤ"۔ فرماتے ہیں:

لکھنؤ تیری سڑکوں پہ وہ چلنے والے کدھر مڑ گئے
جن کے ہونٹوں پہ تھا پھول سا قہقہہ
جن کی باتوں میں تھا دوستی کا نشہ
جن کی سانسوں میں تھی گومتی کے کناروں کی سوندھی مہک
تو نے شاید انھیں دربدر کر دیا
اور اُن کے لبادوں سے الفت، شرافت، کرم، دوستی اور
مروت کے سب لعل، سارے گہر
نوچ کر
زندگی کی جہنم کو لوٹا دیا

ہمیں تو اس نظم میں سرمایہ داری کے خلاف کوئی بات یا کسی قسم کے "فلسفیانہ نظام" کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ جو کچھ نظر آیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لکھنؤ کے دوست پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب ان میں شرافت اور مروت نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔ یہ بالکل ذاتی قسم کی نظم ہے اور ذاتی وجوہ کی بنا پر ہی لفظ "جہنم" کو مؤنث لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کی کتاب پر دو دیباچے لکھے ہیں۔ ایک شروع میں ہے اور ایک آخر میں۔ ہم نے یہ تو دیکھا ہے کہ ریلوے کی مال گاڑی کے آگے اور پیچھے دو انجن لگا دیے جاتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھا کہ کسی خالی گاڑی کے آگے بھی انجن ہو اور پیچھے بھی۔ ان دونوں دیباچوں میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کے محاسن اسی طرح بیان کیے ہیں جس طرح "مدرّس نقاد" یا ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کے الفاظ میں "منشیانِ تنقید" کلام غالب کے محاسن بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے شاعر ہونے کا یہ جواز بھی پیش کیا ہے کہ وہ نت نئے وسائلِ اظہار کی تلاش میں رہتے ہیں اور شاعری بھی ان کا ایک وسیلۂ اظہار ہے۔ یہ جواز "عذرِ شاعری بد تر از شاعری" کی بہترین مثال ہے۔

دیباچۂ اول میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ شاعری کے لیے وزن اور بحر ضروری نہیں ہیں۔ اگر آجائیں تو ان سے اجتناب بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات اس لیے کہی ہے کہ انھوں نے بعض نظمیں وزن اور بحر میں لکھنی شروع کیں مگر بات نہ بنی تو وزن اور بحر کو بالائے طاق رکھ کر بعجلتِ ممکنہ نظموں کو مکمل کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عجلت میں ڈاکٹر صاحب نے بیشتر نظموں کے مفاہیم و مطالب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں۔

دیباچۂ ثانی میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ موجودہ دور انسان کے قادرِ مطلق ہونے کا دور ہے۔ ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ جس دور میں انسان الفاظ کے استعمال پر بھی قادر نہ ہو اُسے "قادرِ مطلق" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والے کو "قادرِ مطلق" کے معنی بھی معلوم نہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے ہماری ایک الجھن دور ہو گئی۔ ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے رسالے "عصری ادب" کا پاکستان نمبر شائع کیا تھا۔ اس میں پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات کا انتخاب بھی تھا۔ "ایک نغمہ پاکستان کے لیے" کے عنوان سے ایک نظم اس انتخاب میں شامل تھی جس میں پاکستانی عوام کی محبت میں مگرمچھ کے آنسو بہائے گئے تھے۔ نظم پر مصنف کا نام درج نہیں تھا۔ لیکن ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ یہ نظم کسی پاکستانی شاعر کی ہے جو بوجوہ اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ اُسی زمانے میں "عصری ادب" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ یہ نظم کسی پاکستانی

شاعر کی تخلیق نہیں ہو سکتی کیوں کہ پاکستان کا خراب سے خراب شاعر بھی ایسی خراب نظم نہیں لکھ سکتا۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ نظم ڈاکٹر محمد حسن کے زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے اس نظم کے خالق کا نام بتا کر "گم نام" پاکستانی شاعر کو بدنام ہونے سے بچالیا۔

(۱۹/ اپریل ۱۹۹۰ء)

بزرگی بہ سال گرہ

آج کل اخباروں اور رسالوں پر ڈاکٹر انور سدید اُسی طرح چھائے ہوئے ہیں جیسے وہ سارا سال دبستانِ سرگودھا کے بدخواہوں کے سروں پر آسیب کی طرح کھیلتے رہتے ہیں۔ ہر طرف اُن کی ساٹھویں سالگرہ کی دھوم ہے اور اِس مناسبت سے اُن کے بارے میں مضامین چھپ رہے ہیں، خبریں گڑھی جارہی ہیں اور انٹرویو لیے جارہے ہیں۔ یہ دھوم دھڑکا صرف کراچی اور لاہور تک محدود نہیں، ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں بھی اُن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ رسالہ "کتاب نما" دہلی کے تازہ شمارے میں اُن کے بارے میں ایک گوشہ شائع ہوا ہے۔ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد ڈاکٹر انور سدید تیسرے ادیب ہیں جن کی سالگرہ اِس بڑے پیمانے پر منائی جارہی ہے۔

سالگرہ منانے کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہی کہ متعلّقہ شخص کے پیدا ہونے میں اگر کوئی شبہہ ہو تو رفع ہو جاتا ہے اور سو سال بعد غالب کے استاد ملّا عبدالصمد جیسا حال نہیں ہوتا۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ملّا عبدالصمد کا کوئی خارجی وجود نہیں تھا۔ غالب نے محض اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ملّائے موصوف کے نام کا ایک فرضی کردار تخلیق کیا اور کہا، میں بے استاد نہیں ہوں، میں نے اِس زبردست ایرانی عالم سے قدیم فارسی زبان پڑھی تھی۔ مگر کسی نے اِس دعوے کو تسلیم نہ کیا۔ اگر غالب ایک آدھ مرتبہ اپنے استاد کی سالگرہ نہ سہی برسی ہی منا لیتے تو کوئی اُن کے دعوے کو غلط قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ملّا عبدالصمد کی مثال سامنے رکھ کر سو سال بعد بعض بدخواہ یہ کہہ سکتے تھے کہ انور سدید ایک فرضی کردار ہے جسے ڈاکٹر وزیر آغا نے حریفوں کو ڈرانے دھمکانے اور ٹھکانے لگانے کے لیے تخلیق کیا تھا، مگر اب سال گرہ منائے جانے کی بنیاد پر کسی کو اِس دریدہ دہنی کا موقع نہیں ملے گا۔

سال گرہ منانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تقریب میں شرکت کرنے والے کچھ دیر کے لیے خوش ہو لیتے ہیں۔ اِس خوشی کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کی تھی۔ سال گرہ کا کیک اُس شاعر کے کلام سے زیادہ مزے دار تھا۔

ہم ڈاکٹر انور سدید کو اُن کی ساٹھویں سال گرہ پر تہِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ تادیر سلامت رہیں اور زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ البتہ ایک بات پر ہمیں بے حد حیرت ہے کہ وہ کم عمری ہی میں ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا، لیکن دبستانِ سرگودھا کے دفاع میں اُن کی تحریروں کو ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔ اِن تحریروں کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ نوجوان ہوں گے۔ ویسے ہی نوجوان جس کے حوالے سے میر حسن کا یہ مصرع مشہور ہے: جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔ افسوس کہ ہمارے ذہن میں انور سدید نام کا جو جوانِ رعنا تھا وہ چشم زدن میں پیرِ فرتوت بن گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ پیری یا بزرگی صرف "بہ سال" نہیں "بہ علم" بھی ہے۔ موصوف پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اُنھوں نے پڑھا زیادہ ہے یا لکھا۔ شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہو اور شاید ہی کوئی موضوع ہو جسے ان کے اشہبِ جہندۂ قلم نے پامال نہ کیا ہو۔

ساٹھویں سال گرہ کی مناسبت سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں، اُن میں سے دو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو خود ڈاکٹر صاحب نے "من آنم" کے عنوان سے لکھا ہے اور دوسرا میرزا ادیب کی شوخیِ تحریر کا نمونہ ہے، جس کا عنوان ہے "اردو ادب کا جمال آفریں مستری"۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جو ہمیں معلوم نہیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فلمی رسالوں سے کیا تھا جن میں اُن کے افسانے چھپتے تھے۔ اِن افسانوں کی بنا پر اُنھیں "مصورِ جذبات" کا خطاب دیا گیا تھا۔ حیرت ہے کہ اتنا خوبصورت خطاب ڈاکٹر صاحب نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ممکن ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ جب تحریکِ آزادی کے زمانے میں بہت سے خان بہادروں نے اپنے خطاب واپس کیے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے بھی جذبات کی رو میں اپنا خطاب واپس کر دیا ہو۔ ایسا کر کے اُنھوں نے اچھا نہیں کیا۔ "ڈاکٹر انور سدید" کی بجائے اگر وہ "مصورِ جذبات انور سدید" کے نام سے مشہور ہوتے تو بہتر تھا۔ بہرحال اب بھی اگر وہ اِس خطاب کو استعمال فرمائیں تو کوئی حرج نہیں۔ خصوصاً دبستانِ فنون کے خلاف اُن کے جو مضامین شائع ہوتے

ہیں، اُن کے ساتھ تو اِس خطاب کا استعمال مضامین کی معنویت میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔

اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: "میں نے ایم اے اوّل بدرجۂ اوّل پاس کیا۔..... میرا ریکارڈ خارجی طلبہ میں اب بھی قائم ہے۔ اُس دور میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایم اے میں میرے ساتھ شریک ہوئے لیکن مجھ سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکے۔ امجد اسلام امجد تو ایک پرچے میں بمشکل پاس ہوئے۔ وقار عظیم صاحب نے اُن کی بہت معاونت کی"۔ ڈاکٹر صاحب کو داد دیجیے کہ انھوں نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے بڑی خوبی سے امجد اسلام امجد کے حالاتِ زندگی بھی بیان کر دیے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا اِسی کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طرف تو اپنا ریکارڈ قائم کرنے کی دھاک بٹھادی اور دوسری طرف دبستانِ فنون کے ایک اہم رکن کا ریکارڈ یہ کہہ کر خراب کر دیا کہ اگر وقار عظیم اُن کی مدد نہ کرتے تو وہ کم از کم ایک پرچے میں ضرور فیل ہو جاتے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ امجد اسلام امجد جس پرچے میں فیل ہونے سے بال بال بچے، وہ شاعری یا ڈرامے کا تھا، تاہم اہلِ نظر پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج شاعر اور ڈراما نگار امجد اسلام امجد کو ادب میں جو منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے، اُس کا سبب کمزور تعلیمی پس منظر ہے۔

ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دبستانِ فنون کے نامی گرامی ارکان امجد و عطا اور دبستانِ سرگودھا کے سپہ سالار ڈاکٹر انور سدید کے درمیان "خوش گوار" تعلقات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اُنھوں نے پہلے تو ایم اے کا امتحان ایک ساتھ دیا اور پھر ادبی زندگی کے امتحانوں اور آزمائشوں میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں تینوں کے ساتھ ہیں۔ ہم دبستانوں کے جھگڑے میں غیر جانب دار ہیں۔ ہمیں اِس سے غرض نہیں کہ کون غلط ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ ہم تو بس اِس سے خوش ہیں کہ اِن لوگوں کی وجہ سے ادبی دنیا میں رونق رہتی ہے۔

مذکورہ تینوں افراد ہم جماعت تھے، اِس لیے یقیناً ہم عمر بھی ہوں گے۔ معلوم نہیں امجد و عطا نے اپنی ساٹھویں سال گرہ منانے کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ بہرحال ہم اُن کی خدمت میں بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی اِسی ذوق و شوق اور لگن سے ادب کی خدمت یعنی دبستانِ سرگودھا کی بیخ کنی کرتے رہیں جس طرح اُنھوں نے گزشتہ ساٹھ برسوں میں کی ہے۔

میرزا ادیب نے ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے، اُس میں اُنھوں نے خاصی

کاری گری یا ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ پہلے تو اُنھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف چند نامعلوم لوگوں کے انتہائی سخت جملے درج کیے ہیں (توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک آدھ بے ضرر سا جملہ تعریف میں بھی ہے) اِس کے بعد لکھا ہے: "انور سدید اردو ادب کی ایک متنازعہ شخصیت ہیں... کیا ایک ایسی شخصیت جس کے متعلق لوگوں کی رائیں متضاد نوعیت کی ہوں' ایک اہم شخصیت نہیں ہوتی؟ ہر شخص تو ادب کی ایسی شخصیت نہیں بن جاتا۔ لوگ عام شریف آدمی کے بارے میں سوچنا بھی مناسب نہیں سمجھتے مگر ایک متنازعہ آدمی کے بارے میں ضرور سوچا جاتا ہے اور ایسے آدمی کے بارے میں رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے جو متضاد رویّوں کا محور بن گیا ہو"۔

میرزا ادیب کی کاری گری یہ ہے کہ اُنھوں نے "متنازعہ آدمی" کو "شریف آدمی" کی ضد بتایا ہے۔ گویا متنازعہ آدمی شریف آدمی نہیں ہوتا۔ ہم اِس اندازِ فکر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور میرزا ادیب سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی بزرگی کا نہ سہی' انور سدید صاحب کی بزرگی کا تو خیال کریں جو اِس مہینے کی چوتھی تاریخ کو ساٹھ برس پورے کر چکے ہیں۔

آگے چل کر میرزا صاحب فرماتے ہیں: "انور سدید کو متنازعہ شخصیت کہہ کر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپ کو یہ بھی اعتراف کرنا ہو گا کہ اِس آدمی کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ اہمیت نہ ہوتی تو ہمارے نقادوں کے لیے ایک مسئلہ کیوں بن جاتا"؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے' انور سدید آج تک نقادوں کے لیے مسئلہ نہیں بنے بلکہ اِس کے برعکس اُنھوں نے ہمیشہ نقادوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ مثلاً وہ ہر سال اردو ادب کا جائزہ لکھتے ہیں۔ اِس جائزے کو سامنے رکھ کر نقاد فکر انگیز تنقیدی مقالے قلم بند فرماتے ہیں۔ جو شخص نقادوں کو مقالہ نویسی کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہو' وہ نقادوں کا محسن ہے۔ ایسے شخص کو نقادوں کے لیے مسئلہ قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ میرزا ادیب فرماتے ہیں: "انور سدید کی مخالفت کرنے والوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ مختلف ناموں سے کراچی کے اخباروں میں مخالف گروپ کے لوگوں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ سچی بات کہوں گا کہ سدید صاحب کے اِس رویّے پر مجھے بھی اعتراض ہے... کوئی نقاب چہرے پر ڈال کر لکھنا میرے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے۔ کوئی شخص کچھ لکھتا ہے تو اُسے سامنے آکر اپنی تحریر کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرنی چاہیے' چھپنا نہیں چاہیے"۔

میرزا صاحب نے انور سدید پر جو اعتراض کیا ہے' اُس کے بارے میں پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ اُن

کے مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں: "اس روّیے پر مجھے بھی اعتراض ہے"۔ گویا میرزا صاحب خود بھی انور سدید کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ میرزا صاحب کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قلمی ناموں سے لکھنا غلط کام ہے۔ اگر یہ کام غلط ہوتا تو پھر احمد شاہ بخاری "پطرس" کے نام سے اورنگ زیب خان "قتیل شفائی" کے نام سے اور دلاور حسین "میرزا ادیب" کے نام سے لکھنے کی غلطی نہ کرتے۔ میرزا صاحب خدا کے فضل و کرم سے تین درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن میں سے ایک کتاب بھی دلاور حسین کے اصلی نام سے شائع نہیں ہوئی۔ اگر چہرے پر نقاب ڈالنا کوئی غلط کام ہوتا تو میرزا صاحب کم از کم ایک بار تو بے نقاب نظر آتے۔

میرزا صاحب نے اپنے مضمون میں انور سدید کا ایک قول بھی نقل کیا ہے جو یہ ہے: "روزِ قیامت میرے اعمال کی پُرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کر دوں گا کہ یہی میرا اعمال نامہ ہے"۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انور سدید خود اپنے لکھے پر پکڑے جائیں گے۔ اُنھیں غالب کی طرح یہ شکوہ نہیں ہوگا:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

(۲۲/دسمبر ۱۹۸۸ء)

خراجِ تحسین یا اخراجِ تحسین

فیض کے بعد حبیب جالب دوسرے اردو شاعر ہیں جن کی کلیات لندن سے چھپی ہے۔ یہ اِن دونوں شاعروں کی عظمت کی دلیل ہے۔ فیض کی عظمت کی تو کئی اور دلیلیں بھی ہو سکتی ہیں، لیکن جالب کی عظمت کے لیے فی الحال یہی ایک دلیل دست یاب ہوئی ہے جو خاصی وزنی ہے۔ جالب کی کلیات بھی خاصی وزنی ہے۔ بڑے سائز میں دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔ تین کلو سے کم کیا ہوگی۔ اگر کلام کا وزن بھی شامل کر لیا جائے تو کلیات کے وزن میں ۱۰۔۱۵ گرام کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اِس کلیات کی اشاعت کی خوشی میں یا کسی فوری اشتعال کے بغیر ہی جنوری کے آخری ہفتے میں لاہور والوں نے حبیب جالب کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا جس میں اُن کی ادبی و سیاسی خدمات پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پیپلز پارٹی کے دور کے سابق وزیر اعلیٰ پنجاب ملک معراج خالد نے کی۔ مقررین میں زیادہ تر سیاسی لوگ تھے، یا پھر اخباری کالم نگار، اِس لیے جلسہ ادبی کم تھا، اور سیاسی زیادہ، گویا جلسے میں اور جالب کی شاعری میں خاصی معنوی مطابقت پائی جاتی تھی۔

اخبارات میں اِس جلسے کی جو رپورٹیں چھپی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیب جالب کو نہایت انوکھے انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مثلاً ایم آر ڈی کے سیکرٹری جنرل ملک محمد قاسم نے اِس قسم کی باتیں کیں: "آج اِس اجلاس میں مارکسزم اور سوشلزم کی باتیں ہوئیں تو بڑی تالیاں پیٹی گئیں۔ تقریروں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ ہم نہ سرخ ہیں نہ سبز، ہم سب منافق ہیں۔ آج جو لوگ اسمبلی میں بیٹھے ہیں، وہ کل اسمبلی میں نہیں ہوں گے۔ کل ایوب خان کے ساتھ تھے، آج ایوب خان کو گالی دیتے ہیں۔ یہ لوگ پیپلز پارٹی کے دور میں وزیر تھے۔ آج اُسے گالیاں دیتے ہیں۔ ملک کو

بچانے کے لیے جلد از جلد الیکشن کرانے ہوں گے اور اب حبیب جالب حزبِ اختلاف میں نہیں بیٹھے گا۔ اگر حبیب جالب میں سیاسی عقل ہوتی تو وہ ۱۹۷۰ء میں پیپلزپارٹی چھوڑ کر نیپ کا ٹکٹ حاصل نہ کرتا"۔

معلوم نہیں یہ خراجِ تحسین ہے یا اخراجِ تحسین۔ ملک قاسم نے جلسے میں موجود ہر شخص کو منافقوں کی صف میں شامل کر کے کم از کم اُس شخص کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے جس کے اعزاز میں یہ جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ ملک قاسم نے حبیب جالب کے ساتھ یہ امتیازی سلوک بھی کیا کہ اُنھیں سیاسی عقل سے محروم قرار دے ڈالا۔ خدا کا شکر ہے کہ ملک صاحب نے صرف سیاسی عقل کی بات کی، عام عقل کی نہیں، ورنہ حبیب جالب کے ہم جیسے نیازمندوں کے لیے شاعری اور نیپ کے ٹکٹ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔

ملک قاسم مُلک کو بچانے کے لیے جلد از جلد الیکشن کرانا چاہتے ہیں اور الیکشن بھی ایسے جن کے نتیجے میں حبیب جالب حزبِ اختلاف میں نہیں، حزبِ اقتدار میں ہو گا۔ مُلک کو بچانے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے سیاست دان گزشتہ چالیس برسوں سے یہی ایک کام مستقل مزاجی سے کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن حبیب جالب کو اہلِ اقتدار کی صف میں بٹھانے والی بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ جالب کی شاعری احتجاج کی شاعری ہے۔ یہ شاعری اُسی وقت پنپ سکتی ہے جب جالب اہلِ اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہو۔ اگر ہمارا شاعرِ انقلاب و احتجاج اہلِ اقتدار سے جا ملا تو پھر احتجاج کی شاعری کون کرے گا۔ قمر جمیل تو نہیں کر سکتے کہ اُنھیں نثری نظمیں لکھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ لہٰذا ملک قاسم سے درخواست ہے کہ وہ الیکشن ضرور کرائیں لیکن حبیب جالب کو اُسی جگہ رہنے دیں جہاں "میں نہیں مانتا" کا نعرۂ بآواز بلند لگایا جا سکے۔

پیپلزپارٹی کے ایک اور رہنما ملک مختار اعوان نے کہا کہ حبیب جالب کی جدوجہد سوشلسٹ معاشرے کے قیام کے لیے ہے، اِس لیے ضروری ہے کہ اُن کی فکر کو عام کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اِس جہت میں اُس وقت تک قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں جب تک خود حبیب جالب کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اُن کی فکر کیا ہے، نیز یہ کہ سوشلسٹ معاشرہ کیا ہوتا ہے۔ حبیب جالب سیدھے سادے معصوم قسم کے عوامی شاعر ہیں جو اِس قسم کی باتیں کرتے ہیں :

ایسے دستور کو

صبحِ بے نور کو
میں نہیں جانتا
میں نہیں مانتا

اِس قسم کی شاعری میں کسی فکر یا نظریے کو تلاش کرنا' اندھیرے کمرے میں کالی بلی کو ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔ یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے پولیس والے پہلے تو کسی بے گناہ شہری کو قتل کے الزام میں پکڑ لیتے ہیں اور پھر اِس کی جیب سے آلۂ قتل بھی بر آمد کر لیتے ہیں۔

صفدر میر نے بھی حبیب جالب کی شان میں ایک نثری قصیدہ پڑھا اور یہ کہا کہ وہ شاعر بھی اچھا ہے اور گاتا بھی خوب ہے۔ شاعری اور گانے کی ایک ہی جیسی تعریف کرنا' حبیب جالب کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حبیب جالب اچھا شاعر ہے' لیکن وہ جس مہارت سے ساتھ گاتا ہے اُس کی مثال شاعروں میں تو کیا' گانے والوں میں بھی نہیں ملتی۔ گانے والوں پر حبیب جالب کو اِس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ وہ دوسروں کی لکھی ہوئی چیزیں گاتے ہیں' لیکن حبیب جالب صرف اپنا کلام سناتا ہے۔ شاعر گانے والوں کی بدولت مشہور ہوتے ہیں' جالب کے سامنے گانے والوں کی شہرت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

اِس جلسے میں سب سے عمدہ تقریر خود حبیب جالب کی تھی۔ اُنھوں نے فرمایا: "بڑے بڑے وزیر اور صدر مال روڈ پر مارے مارے پھرتے ہیں' کوئی اُن سے ہاتھ ملانے والا نہیں ہوتا' لیکن میں ایک انٹرنیشنل شاعر بن چکا ہوں"۔ جملے کی ساخت اِس قسم کی ہے جیسے بڑے بڑے وزیروں کے مال روڈ پر مارے مارے پھرنے کی وجہ سے جالب انٹرنیشنل شاعر بن گیا ہو۔ حالانکہ جالب کو یہ مقام خود اُس کے اپنے گھومنے پھرنے کی وجہ سے ملا ہے۔ وہ کئی مرتبہ دوبئی' امریکہ اور انگلستان جا کر وہاں کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا چکا ہے۔ شعرائے کرام کراچی سے ٹھٹھہ تک جائیں تو رستے ہی میں انٹرنیشنل شاعر بن جاتے ہیں اور حبیب جالب تو اِس سے کہیں آگے تک کا سفر کر چکا ہے' اِس لیے اُس کے شاعر ہونے میں تو بعض کوتاہ بینوں کو شبہہ ہو سکتا ہے' لیکن انٹرنیشنل ہونے میں نہیں۔

حبیب جالب نے یہ بھی کہا: "میں نے امریکہ میں صدر ریگن کے خلاف نظم پڑھی۔ میں نے سوچا اگر اُس نے مجھے امریکہ سے نکالا تو کہوں گا تم بھی پاکستان سے نکل جاؤ جہاں چالیس سال سے بیٹھے ہو"۔ صدر ریگن نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا کہ جالب کی نظم سن کر خاموش رہا' ورنہ

بیچارے کی بڑی رسوائی ہوتی' حبیب جالب پہلے تو ریگن کو پاکستان سے نکالتے اور اگر غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا تو پھر اُسے امریکہ سے بھی نکالنے کا حکم صادر فرما دیتے۔ خوشی کی بات ہے کہ صدر ریگن کی خاموشی اور تحمل کی وجہ سے امریکہ ایک بڑے سیاسی بحران سے بچ گیا۔

حبیب جالب نے مزید فرمایا: "میں نے حکومت سے مراعات حاصل نہیں کیں۔ البتہ دوستوں کی جیبوں میں ہاتھ ضرور ڈالا ہے۔ فیض احمد فیض کو بھی معاف نہیں کیا۔ جب فیض کو لینن انعام ملا تو میں نے اُن سے پوچھا آپ کو رقم مل گئی؟ اُنھوں نے کہا' نہیں۔ میں نے کہا' رقم ملے نہ ملے مجھے دو سو روپے دو۔ فیض نے کہا چائے پی لو۔ میں نے کہا' دو سو روپے نکالو۔ بالآخر روپے لے کر اُن کی جان چھوڑی"۔

یہ بہت اچھی بات ہے کہ جالب نے فیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا' احمد فراز کی طرح اُن کے رنگِ سخن پر ہاتھ صاف نہیں کیا۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ فیض جیسے کفایت شعار شخص کا جالب کو اکٹھے دو سو روپے دے دینا ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن ہمیں اِس سے اتفاق نہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے والا گریبان پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اس لیے عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے آدمی دو سو روپے تو کیا' دو لاکھ روپے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

حبیب جالب نے انکشاف کیا: "جو لوگ آج بھٹو کا نام لیتے نہیں تھکتے' اُنھوں نے کبھی اُس کے ساتھ پانی بھی نہیں پیا۔ لیکن میں نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر نہ جانے کیا کیا پی لیا۔ میری اُس کی دوستی رات کے آٹھ بجے کے بعد کی تھی"۔

بھٹو سے اتنی قربت تو مولانا کوثر نیازی کی بھی نہیں تھی۔ اِسی لیے تو اُنھوں نے رات کے آٹھ بجے کے بعد والی اِس قسم کی شاعری نہیں کی:

لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو

(۱۹/ فروری ۱۹۸۷ء)

رجحان ساز یا کتاب ساز

عورتوں کی شاعری پر لکھنے کا حق اگرچہ نظیر صدیقی کا ہے، لیکن ہمیں بھی تو کالم کا پیٹ بھرنا ہے، اس لیے نظیر صدیقی کی قلمرو کی سیر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ بھی تو ہمارے معاملات میں دخل دیتے رہتے ہیں۔ یعنی جن موضوعات پر ہمیں کالم لکھنے چاہییں، ان پر وہ تنقیدی مقالے لکھ دیتے ہیں۔ کالم پڑھ کر لوگ ہم سے بدظن ہو جاتے ہیں جب کہ نظیر صدیقی کے مقالے پڑھ کر ادب سے بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ نظیر صدیقی کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔

نظیر صدیقی کی پیروی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس ہفتے "یک نہ شد سہ شد" کے مصداق شاعرات کے اکٹھے تین مجموعے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ صرف نظر ہی سے نہیں گزرے سر سے بھی گزرے ہیں۔ یعنی ہم نے ان کا مطالعہ کیا ہے جس سے ہماری شرحِ خواندگی و درماندگی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ خیریت گزری کہ کشور ناہید کی کلیات ابھی ہم تک نہیں پہنچی ورنہ "یک نہ شد سہ شد" کی بجائے چودہ طبق روشن ہو جانے والا محاورہ استعمال کرنا پڑتا۔

جو تین مجموعے ہماری نظر سے گزرے ہیں وہ یہ ہیں (۱) آنکھیں، سارا شگفتہ (۲) کنج پیلے پھولوں کا، عشرت آفریں (۳) خود کلامی، پروین شاکر۔ ان تینوں مجموعوں کو پڑھنے کے بعد ہمارا مجموعی تاثر یہ ہے کہ لکھنے والیوں کا وقت ضائع ہوا ہو تو اور بات ہے، ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔ کیوں کہ ان مجموعوں میں صرف شاعری ہی نہیں اور بھی بہت کچھ بھی ہے۔ مثلاً دیباچے اور فلیپ کی عبارتیں وغیرہ۔

سب سے عمدہ فلیپ مبارک احمد نے لکھا ہے جو سارا شگفتہ کی کتاب پر ہے۔ وہ فرماتے ہیں : "پاکستان میں شاعرات شاعری کے میدان میں شعری معیار و مقدار کے اعتبار سے شاعروں

سے کہیں آگے نکل گئی ہیں جس کی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں کسی بھی عہد کے حوالے سے نہیں ملے گی۔ ان شاعرات میں جو جدید تر شاعری سے متعلق ہیں.... سارا شگفتہ' ان سب میں سرفہرست ہے۔ بطور سپر پوئٹس اور کوئین آف پوئنکس وہ معجزے سے کم نہیں..... اس ارفع سطح کی شاعری مغرب میں بھی نہیں ہو رہی..... جدید تر شاعری نے غالب کے پوئنک بیریر کو کراس کرتے ہوئے نئی شعری روایات کو جنم دیا ہے جو اس صدی کا قابلِ قدر کارنامہ ہے اور سارا شگفتہ اس کی بہترین مثال ہیں"۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ سارا شگفتہ مرحومہ ایک اچھی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے زندگی سے جو گوناگوں اور تلخ تجربے حاصل کیے' انھیں غیر روایتی اور موثر انداز میں بیان کر دیا لیکن انھیں "سپر پوئٹس" اور "کوئین آف پوئنکس" کہنا مبارک احمد ہی کا حوصلہ ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا' انھوں نے یہ فرمان بھی جاری کیا ہے کہ اس ارفع سطح کی شاعری مغرب میں بھی نہیں ہو رہی۔ "مغرب" سے مراد اگر سابقہ مغربی پاکستان یعنی موجودہ پاکستان ہے تو مبارک احمد کی بات ان کی خوشنودی کی خاطر مانی جا سکتی ہے بصورتِ دیگر مبارک احمد کو ہماری خوشنودی کی خاطر یہ ماننا پڑے گا کہ مغرب کی تمام زبانوں کا جدید ادب وہ اسی طرح باقاعدگی سے پڑھتے ہیں جس طرح بعض ادیب اپنے علم میں اضافے کے لیے خود اپنی ہی تصانیف پڑھتے رہتے ہیں۔

مبارک احمد نے یہ دل خوش کن اطلاع بھی دی ہے کہ آج کی جدید تر شاعری نے غالب کے پوئنک بیریر کو کراس کرتے ہوئے نئی شعری روایت کو جنم دیا ہے۔ ہمیں اس نئی شعری روایت کا جنم دن معلوم نہیں' ورنہ ہم اس کی سالگرہ پر نثری قصیدہ پیش کرتے۔ فی الحال مبارک احمد ہی کا قصیدہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اردو لکھتے ہوئے انھیں انگریزی زبان پر زبردست قدرت حاصل ہے۔ جدید تر شاعری سے غالب کے پوئنک بیریر کو انھوں نے اس طرح کراس کرایا ہے جیسے وہ خود انگلش چینل کو کراس کر رہے ہوں۔

مبارک احمد نے "جدید شاعری" کے حوالے سے بہت سی شاعرات کے نام گنوائے ہیں۔ اس فہرست میں پروین شاکر اور عشرت آفریں کے نام شامل نہیں ہیں۔ معلوم نہیں وہ "جدید شاعری" کسے کہتے ہیں۔ اگر ان کی مراد کلامِ ناموزوں یعنی نثری نظم سے ہے تو اس کی بہت سی اچھی مثالیں مذکورہ دونوں شاعرات کے ہاں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔ بہرحال ہمیں افسوس ہے کہ مغرب تو کیا' دنیا

کے کسی بھی ملک اور کسی بھی عہد کی شاعری سے واقفیت رکھنے والا نابغہ پروین شاکر اور عشرت آفریں کے ناموں سے واقف نہیں' حالاں کہ ابھی پچھلے دنوں ان دونوں کے مجموعوں کی رونمائیاں بڑے پیمانے پر ہو چکی ہیں اور رنگین تصویروں کے ساتھ خبریں اخباروں کی زینت بن چکی ہیں۔ مبارک احمد کو چاہیے کہ ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اخبارات کے مطالعے کے لیے بھی وقت نکال لیا کریں۔

عشرت آفریں کے مجموعے کا دیباچہ سردار جعفری نے لکھا ہے جو ۳۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اگر اس دیباچے کی کتابت بھی اس جلی خط میں ہوتی جس میں عشرت کا کلام ہے تو دیباچہ کلام کی ضخامت سے بڑھ جاتا۔ یا اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا یعنی کلام دیباچے والے باریک خط میں لکھا جاتا تو عشرت کی شاعری سردار جعفری کے دیباچے کا ضمیمہ نظر آتی۔ دیباچے کی جامعیت کا اس سے اندازہ کیجیے کہ جعفری صاحب نے عشرت آفریں کا تین چوتھائی کلام بطور مثال درج کر دیا ہے۔ اگر وہ باقی ایک چوتھائی کلام کو بھی استعمال میں لے آتے تو مجموعہ چھاپنے کی ضرورت ہی نہ تھی' دیباچہ کافی تھا۔

دیباچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی اپنے بے پایاں اور لافانی حسن کے کسی ان دیکھے گوشے کو یکایک بے نقاب کر دیتی ہے اور انسان حیران رہ جاتا ہے"۔ یہ جملہ پڑھ کر ہمیں بجنوری کا "مقدمۂ دیوانِ غالب" یاد آگیا۔ یہی فلسفیانہ انداز اور شکوہ وہاں بھی ہے۔ اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں: "۵ مئی ۱۹۸۴ء کی رات کو جب کراچی میں ایک شعری نشست کے بعد ڈاکٹر بلقیس منظور نے ایک نوعمر لڑکی عشرت آفریں کا تعارف اس طرح کرایا کہ یہ بھی گلشن اقبال میں رہتی ہیں' انھیں گھر پہنچا دیجے گا تو ایک نیا اور بے ساختہ لمحہ میرے سامنے تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس لمحے کی روح میں شاعری کا ایک حسین آبشار تڑپ رہا ہے"۔

"گھر پہنچا دیجے" کی فرمائش' نئے اور بے ساختہ لمحے کی آمد اور اس کی روح میں شاعری کے ایک حسین آبشار کا تڑپنا' ایسا خوبصورت اندازِ بیاں ہے جس کی روح میں بذاتِ خود شاعری کا ایک حسین آبشار تڑپ بلکہ سسک رہا ہے۔ "گھر پہنچا دینے" والی بات بہت دور تک جاتی ہے جس کے نتیجے میں حال ہی میں عشرت آفریں دیباچہ نگار کی بہو بن چکی ہیں۔ ہم دولھا دلھن کو پُر مسرت زندگی کی دعا دیتے ہوئے جعفری صاحب کے دیباچے کا دوسرا پیراگراف نقل کرتے ہیں: "راستے میں

گفتگو کے دوران عشرت نے مجھ سے اپنے مجموعے پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کردی۔ میں اس کے کلام سے ناواقف تھا اور اس کے علاوہ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے میں نے مشورہ دیا کہ پہلے مجموعے کی اشاعت میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اس پر میرے بھتیجے سجاد نے کہا جو گاڑی چلا رہا تھا کہ عشرت ۵، ۶ سو نظمیں اور غزلیں کہہ چکی ہیں۔ مجھے اس کی شاعری کے معیار کے بارے میں اور بھی شبہہ پیدا ہو گیا۔ لیکن مجھے جلد ہی اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ جب میں نے کراچی کی دوسری نجی محفلوں میں عشرت کا کلام سنا۔ اس کا رنگ و آہنگ نیا تھا، انداز بے تکلف تھا"۔

۵ مئی ۱۹۸۴ء کو پہلی ملاقات میں عشرت آفریں نے دیباچے کی فرمائش کی۔ ٹھیک ایک مہینے بعد وہ دیباچے کی یاددہانی کرانے بمبئی پہنچ گئیں۔ اس واقعے کی یاد میں انھوں نے ایک غزل لکھی جو ان کے مجموعے کی آخری غزل ہے۔ اس غزل کے آخر میں ۷ جون ۱۹۸۴ء کی تاریخ کے ساتھ سردار جعفری کی بمبئی کی قیام گاہ کا پتا لکھا ہے۔ گویا یہ غزل جعفری صاحب ہی کے گھر پر لکھی گئی۔ ۱۴/ اگست ۱۹۸۴ء کو سردار جعفری نے دیباچہ لکھ دیا۔ ۵ مئی سے ۱۴/ اگست تک تقریباً ایک سو ایک دن کی مختصر مدت میں جناب جعفری نے عشرت کی شاعری کا جس توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا، اس کا دیباچے سے بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عشرت کی شاعری کی خصوصیات کو نہایت عمدگی سے واضح کیا ہے۔ اگر کبھی عشرت کی شاعری نصاب میں شامل ہو گئی تو جعفری صاحب کا دیباچہ پڑھ کر طلبہ سو میں سے ایک سو ایک نمبر حاصل کرلیں گے۔

جعفری صاحب نے روایتی انداز کا دیباچہ نہیں لکھا۔ انھوں نے اس دیباچے پر اُتنی ہی محنت کی ہے جتنی عشرت آفریں نے ۵، ۶ سو نظمیں اور غزلیں لکھنے میں کی تھی۔ جعفری صاحب کی محنت کا اس سے اندازہ کیجیے کہ کتاب کے نام میں پیلے پھولوں کا ذکر ہے، انھوں نے پیلے رنگ کی اہمیت و افادیت پر کئی صفحے نیلے پیلے کیے ہیں اور پھر یہ بتایا ہے کہ اس رنگ میں بڑی تہ داریاں ہیں اور اس رنگ کا ہماری تہذیبی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو گا کہ جس کتاب کے نام کے ایک لفظ میں اتنی تہ داریاں ہوں تو اُس کتاب میں بکھرے ہوئے ہزاروں الفاظ میں کیا کچھ نہ ہو گا۔ مختصر یہ کہ دیباچے کے شروع میں جعفری صاحب کو عشرت کی شاعری کے معیار کے بارے میں جو شبہہ ہوا تھا، وہ دیباچے کے آخر میں اس یقین میں تبدیل ہو گیا کہ عشرت کا نام میرا بائی اور قرۃ العین طاہرہ کے ناموں کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ میرا بائی اور قرۃ العین طاہرہ

کا انتقال ہو چکا ہے ورنہ وہ اس عزت افزائی پر جعفری صاحب کا شکریہ ضرور ادا کرتیں۔

لیکن پروین شاکر بڑے ناموں کے ساتھ اپنے نام کی وابستگی کے لیے کسی دیباچہ نگار کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ خود فرماتی ہیں :

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروین اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

پروین کے مجموعے میں صرف دو آدمیوں کی رائیں ہیں۔ دائیں ہاتھ کا فلیپ ساقی فاروقی نے لکھا ہے اور بائیں ہاتھ کا محمد علی صدیقی نے۔ دائیں بائیں کے اس بامعنی امتیاز سے قطع نظر دونوں رائے دہندگان نے ایمان داری سے کام لیا ہے۔ جعلی ووٹ بھگتانے کی کوشش نہیں کی۔ ساقی نے ۲۱ سطریں لکھی ہیں جن میں سے ۱۳ سطروں کا پروین کی شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد کی پانچ سطروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پروین کا نام آیا ہے اور بس۔ آخری تین سطریں یہ ہیں:
"اگر یہ رومانیت سے اظہاریت کی طرف سفر جاری رکھ سکیں تو ان میں بہت آگے جانے کے بہت امکانات ہیں"۔

ساقی فاروقی لندن میں بیٹھ کر پاکستان کی ادبی صورت حال سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ اب پروین شاکر کی شاعری میں آگے جانے کے نہیں، واپس آنے کے امکانات پیدا ہو چکے ہیں جس کا بیّن ثبوت ان کا زیر نظر مجموعہ ہے۔

محمد علی صدیقی نے ساقی فاروقی کے برعکس بڑی فراخ دلی سے پروین شاکر کی شاعری کو سراہا ہے اور اپنی رائے ان الفاظ پر ختم کی ہے : "پروین شاکر کم عمری ہی میں رجحان ساز شاعر کا روپ دھارتی نظر آ رہی ہیں"۔ "رجحان ساز" کی ترکیب کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ محمد علی صدیقی نے "کتاب ساز" لکھا ہو گا جس سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ کم عمری میں تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۷/جون ۱۹۸۵ء)

انشائیہ اور سنگِ طفلاں

اردو ادب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے ڈاکٹر وزیر آغا جیسا صاحبِ فکر نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار ملا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید جیسا بالغ نظر عقیدت مند اور طرف دار ملا۔ ڈاکٹر انور سدید کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ہم جیسا حوصلہ مند قاری ملا۔ اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر انور سدید کی بیس عدد تصانیف کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ہماری صحت بھی اتنی اچھی ہے کہ اُن کی زیرِ طبع نصف درجن کتابوں کے انتظار میں ہم زندگی کے دن ایسی بے چینی سے کاٹ رہے ہیں جیسے کوئی مجرم عمر قید کی سزا رہائی کی امید میں کاٹتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تصانیف کے جملہ حقوق تو انھیں کے نام محفوظ ہیں، لیکن خود ڈاکٹر وزیر آغا کے جملہ حقوق ڈاکٹر انور سدید نے اپنے نام محفوظ کرا رکھے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ حقوق حاصل کرنے والے پر بعض فرائض کی ادائی بھی واجب ہوتی ہے، لہٰذا انھوں نے حقوق و فرائض میں توازن کی ایک خوبصورت مثال قائم کی ہے۔ ایک طرف وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی حریفوں سے نبرد آزما رہتے ہیں اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کے ادبی کاموں اور کارناموں کی تعبیر و تشریح میں عالمانہ تحریریں لکھتے رہتے ہیں۔ مخالفوں سے ڈاکٹر انور سدید کا سلوک خاصا ناگفتہ بہ قسم کا ہے۔ اگر ڈاکٹر وزیر آغا کی ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو وہ نہ صرف اس بے چاری کی سات پشتوں میں فی نکالتے ہیں بلکہ اس کی آیندہ نسلوں کے سرگودھا میں داخلے پر پابندی بھی لگا دیتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی حیثیت اتنی مستحکم ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید کے دفاعی اقدامات کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی

حیثیت لاکھ مستحکم سہی، آخر انور سدید نے بھی تو فنِ سپہ گری میں کمال حاصل کیا ہے، اس کمال کے اظہار کی بھی تو کوئی صورت ہونی چاہیے۔ سو وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے حریفوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے کاغذی توپیں داغتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب ڈاکٹر وزیر آغا کے سب حریف کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے تو پھر ڈاکٹر انور سدید کیا کریں گے؟ یہ سوال قبل از وقت ہے، لہٰذا اس کا قبل از وقت جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید خود ہی اپنے ممدوح کے خلاف ایک آدھ مضمون لکھ کر مختلف قلمی ناموں سے اس کے دس بارہ جواب چھپوا دیا کریں گے، لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے، اِن شاء اللہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ڈاکٹر انور سدید کے دفاعی مضامین سے مشتعل ہونے والے ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے اور پرورشِ لوح و قلم کا سبب بنتے رہیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں انور سدید دو کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ایک تو "وزیر آغا، ایک مطالعہ" ہے اور دوسری "وزیر آغا کے خطوط"۔ اس وقت ڈاکٹر انور سدید کی تیسری کتاب ہمارے سامنے ہے جس کا نام ہے "شام کا سورج"۔ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور فن کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کی لکھی ہوئی وہ تحریریں یک جا کی گئی ہیں جو ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید، شاعری اور انشائیہ نگاری کے بارے میں جو بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں، ان کا انتخاب اس کتاب میں ہے۔ لکھنے والوں میں ہمارے عہد کے تقریباً سبھی اہم اہلِ قلم شامل ہیں۔ ہم نے اس کتاب کے بیشتر مضامین پہلے سے پڑھ رکھے ہیں، اور بعض ایسے ثقیل ہیں کہ انھیں پہلے پڑھا نہ اب پڑھنے کی ہمت ہے۔ البتہ اس کتاب کا ایک باب ایسا ہے جس کا مطالعہ ہم نے ذوق و شوق سے کیا۔ یہ وہ باب ہے جس میں وزیر آغا کے نام اُن کے معاصرین کے خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ تقریباً تین درجن مشاہیرِ ادب کے ان خطوط میں جہاں بہت سے علمی ادبی اور ذاتی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں، وہیں کچھ دلچسپ باتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مکتوب نگاروں کو کیا معلوم تھا کہ وزیر آغا کے نام وہ جو راز کی باتیں لکھ رہے ہیں، انھیں انور سدید منظرِ عام پر لے آئیں گے۔

قیوم نظر جہاں دیدہ شاعر ہیں، لیکن دیکھیے ایک خط میں وہ کتنے "معصوم" نظر آتے ہیں:

"میرا اپنا خیال ہے کہ گیتوں کی دنیا میں بیسویں صدی میں بہت کم لوگ مجھ تک پہنچ پاتے ہیں۔ میراجی نے پہلے پہل مجھے اس زمین میں دریافت کیا تھا۔ ان کے نزدیک مجھے گیتوں کی بہت اچھی

سوجھ بوجھ تھی.... یہ محض اتفاق ہے کہ آج کی ڈاک ہی سے مجھے ایک خط ملا ہے جس کے لکھنے والے کو 'پون جھکولے' کا ایک خستہ حال نسخہ کہیں سے مل گیا ہے اور وہ اسے پڑھ کر میرا حد درجہ عقیدت مند بن گیا ہے"۔

'پون جھکولے' کا خستہ حال نسخہ دست یاب ہونے پر جس شخص کا یہ حال ہوا ہے، اگر اُسے کتاب کا کوئی صاف ستھرا نسخہ مل جاتا تو معلوم نہیں اس پر کیا گزرتی۔

خلیل الرحمان اعظمی مرحوم نے ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر محمد حسن کے بارے میں یہ رائے دی تھی:

"محمد حسن نے پھر ایک مضمون نقوش میں شائع کرایا ہے۔ ان کی چیزوں کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ انتہائی سرسری اور صحافتی انداز کی ہیں، پچھلے چھ سات سال سے گھوم پھر کر وہ چند باتیں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں، ان کی تکرار سے اب متلی سی آنے لگتی ہے۔ شاعری کی پرکھ کا تو خیر ان حضرت کے یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ ڈھنگ کی فہرست سازی بھی نہیں کر پاتے"۔ اگر خلیل الرحمٰن اعظمی زندہ ہوتے تو وہ اپنی اس رائے میں جزوی تبدیلی ضرور کر لیتے کیوں کہ اب ڈاکٹر محمد حسن ڈھنگ کی فہرست سازی کر لیتے ہیں۔

نظیر صدیقی لکھتے ہیں: "ضیا جالندھری... نے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے مجھے بارہا مشورہ دیا کہ میں سی ایس ایس کے امتحان میں ضرور بیٹھوں۔ لیکن محض اس خیال سے کہ میری ادبی صلاحیتیں سرکاری فائلوں کے انبار میں دب کر نہ رہ جائیں، میں نے ضیا کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ اگر میں چاہتا تو کسی اچھی فرم کا نمایندہ بن کر اس وقت اچھی زندگی گزار رہا ہوتا لیکن میں نے مادی آسایشوں پر اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کو ہمیشہ ترجیح دی"۔

ہمارا خیال ہے کہ ضیا جالندھری نے جو مشورہ دیا تھا وہ نظیر صدیقی کے مفاد میں نہیں، ادب کے مفاد میں تھا۔ نظیر صدیقی اب بھی اس مشورے پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے اور ادب کا بھی۔

اپنے بارے میں افتخار جالب کی کسی تحریر کو پڑھ کر ن م راشد نے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ افتخار جالب کی یہ 'حرکت' ایسی ہے کہ جیسے کوئی اخبار میں نام چھپوانے کے لیے کسی پر قاتلانہ حملہ کر دے، اور پھر یہ لکھا ہے: "ایک اور سبب جو نفسیاتی ہے یہ ہے کہ افتخار جالب کے کردار میں AMBIVALENCE ہے۔ اس نے اپنی کتاب اپنے والد محترم کے نام معنون کی ہے لیکن

ساتھ ہی اس کی نظموں میں وہ عناصر ملتے ہیں جن میں ولادت کے شرف کو کم کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ میں بھی جہاں تک شاعری کا تعلق ہے FATHER IMAGE دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ میری تعریف بھی کرتا ہے اور مذمت بھی۔ یہ ایک طرح سے آج کل کے ہر نوجوان کا مسئلہ ہے لیکن افتخار جالب کے معاملے میں اس نے گویا شدت اختیار کرلی ہے"۔

راشد مرحوم کو اس کا علم نہیں تھا کہ افتخار جالب اپنے قلم کو کسی کی تعریف سے اسی وقت آلودہ کرتے ہیں جب انھیں ممدوح کی مذمت مقصود ہوتی ہے۔ وہ اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی کی تھوڑی سی تعریف کرکے مذمت کی جائے تو تعریف بھی مذمت کا حصہ بن جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے ایک باب میں خود ڈاکٹر وزیر آغا کے بھی بہت سے خط جمع کردیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی مکتوب نگاری تفصیلی مطالعے کی مستحق ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز مکتوب نگار ہیں اور خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس کو کیسا خط لکھنا چاہیے۔ مثلاً منظر علی خان منظر کو وہ لکھتے ہیں: "آپ کی علالت کا پڑھ کر پریشانی ہوئی۔ خلق خدا کو مسرت کے لمحات عطا کرنے والے شخص کو بیمار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بیماری تو صرف اذیت پہنچانے والوں بالخصوص نثری نظموں کے ذریعے اذیت پہنچانے والوں کے لیے مختص ہونی چاہیے۔ ویسے آپ کی بیماری تو مجھے خللِ معدہ (خللِ دماغ نہیں) کے سوا کچھ نظر نہیں آتی"۔

واضح رہے کہ قوسین کے الفاظ بھی ڈاکٹر صاحب کے ہیں، یہ ہم نے اضافہ نہیں کیے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اس جانب توجہ نہیں فرمائی کہ منظر علی خان منظر جہاں ایک طرف مزاحیہ مضامین لکھ کر مسرت کے لمحات عطا کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف غزلیں لکھ کر ان لمحات کو واپس بھی لے لیتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک خط ہمارے نام بھی ہے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں: "انشائیہ نگاری کے سلسلے میں آپ مجھے ہمیشہ رعایتی نمبر دے کر پاس کردیتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے بیس پچیس سال کی مختصر مدت میں ہمارے ہاں اعلیٰ پائے کے انشائیے لکھے گئے ہیں۔ یقیناً آپ ان سے محظوظ ہوئے ہوں گے اور یہ سب انشائیے دوسروں نے لکھے ہیں۔ یہ سب لوگ اس بات پر رنجیدہ ہیں کہ خامہ بگوش نے انھیں کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کسی وقت ان کے آنسو پونچھ دیجیے۔ آپ کو دعائیں دیں گے"۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ ہم ایک وقت میں دو کام نہیں کرسکتے۔ لکھنے والوں کے بھی آنسو پونچھیں اور پڑھنے والوں کے بھی۔ انشائیہ نگاری کے سلسلے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ کسی نے اس صنفِ ادب کے مزاج کو نہیں سمجھا۔ وہ اردو کے پہلے اور اب تک آخری انشائیہ نگار ہیں۔ باقی انشائیہ نگاروں کا وہی حال ہے جو نثری نظم لکھنے والوں کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اوپر کے اقتباس میں فرمایا ہے کہ نثری نظم لکھنے والے پڑھنے والوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ انشائیہ نگاروں کے بارے میں ہماری رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شوخیِ تحریر کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ ساقی فاروقی کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: "الفنسو آم کی ایک قسم ہے جو صرف میرے باغ میں ہوتی ہے۔ ہر سال اس کے پودوں پر ۴۸۲ آم لگتے ہیں' اور ان دوستوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں جو زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ چوں کہ آم بہت ہی شیریں ہے' اس لیے دوست جب اسے کھاتے ہیں تو شیرینی سے ان کے لب جُڑ جاتے ہیں اور وہ کئی ماہ تک بات نہیں کرسکتے۔ زبان بندی کی یہ بہترین صورت ہے۔ آپ آیندہ سال جون کے آخری ہفتے پاکستان آیئے پھر ہم آپ کی زبان بندی کا تماشا دیکھیں گے بلکہ آپ کے رخِ زیبا کو دیکھنے کا موقع ملے گا کیوں کہ باتیں کرتے ہوئے آدمی کو کون دیکھ سکتا ہے"۔

ساقی فاروقی کی زبان بندی سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ دہشت گردی کا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلیں گے۔ آم کھاتے جائیں اور گٹھیلوں کو "سنگِ طفلاں" کی طرح استعمال کرتے جائیں گے۔

(۲۳/ مارچ ۱۹۸۹ء)

شاعری اور سوءِ تنفس

پچھلے دنوں ہندوستان کے ایک نامور افسانہ نگار کراچی تشریف لائے تو ایک ادبی محفل میں ان سے سوال کیا گیا: "کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے"؟ انھوں نے جواب دیا: "چند برس پہلے تک تو میرا خیال تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ مگر اب میں مایوس ہو چکا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں اردو کی کتابیں بہت زیادہ چھپنے لگی ہیں"۔

یہ منطق ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ ظاہر ہے کہ جس زبان کی کتابیں زیادہ تعداد میں چھپیں گی، اس زبان کے بولنے اور پڑھنے والے بھی زیادہ ہوں گے، اور یہ بات ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر کسی زبان کے مستقبل سے مایوسی کا اظہار کیا جائے۔ ہم نے محترم مہمان کی خدمت میں عرض کیا، آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: "پاکستان میں بھی اردو کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا۔ میں نے نہایت آسان اردو میں اظہارِ خیال کیا ہے، جب اتنی آسان اردو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو پھر بہتر ہو گا کہ ہم کسی دوسری زبان میں گفتگو کریں"۔

یہ سن کر ہم شرمندہ ہوئے، لیکن اس قدر نہیں کہ خاموش ہو جائیں۔ عرض کیا: "یہ تو اچھی بات ہے کہ کتابیں زیادہ تعداد میں چھپ رہی ہیں"۔ انھوں نے فرمایا: "یہ ہرگز اچھی بات نہیں ہے۔ وہاں ہر اُردو بولنے والا یا شاعر ہے یا محقق ہے۔ ہر مہینے ڈیڑھ دو سو دیوان چھپتے ہیں جنھیں کوئی نہیں پڑھتا۔ الفاظ اور کاغذ دونوں کو بے دردی سے ضائع کیا جاتا ہے۔ تحقیقی کتابوں کا یہ حال ہے کہ ایسے ایسے پرانے شاعروں پر تحقیق کی جاتی ہے جو اپنے زمانے میں تیسرے درجے کے شاعر بھی نہیں تھے"۔

مہمان سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں تھا' اس لیے ہم نے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ بہرحال اس گفتگو سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ نگاروں کو شاعری اور تحقیق سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ لوگ صرف اپنا لکھا پڑھتے ہیں۔ اس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں کہ ادب کی دوسری اصناف میں کیا کام ہو رہا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ شاعری اور تحقیق لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں شاعری ہو گی وہاں تحقیق بھی ہو گی۔ پاکستان ہو یا ہندوستان' دونوں ملکوں کے بیشتر شاعر اس کے مستحق ہیں کہ ان پر تحقیق کی جائے۔ ایک مہذب ادبی معاشرے میں کسی مجرم کو سزا دینے کا اس سے زیادہ شریفانہ طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ایسے شاعر بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے زمانے کے بعد اپنی شاعری کی وجہ سے یاد رکھے جائیں' زیادہ تر شاعر محققوں کی محنت کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔

بعض لوگ تحقیق سے بلاوجہ تعصب برتتے ہیں حالانکہ یہ ایک مفید کام ہے۔ اہلِ تحقیق کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ وہ گم شدہ کتابوں ہی کو نہیں' گم شدہ مصنفین کو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ گم شدہ بچوں کی تلاش کا کام جو لوگ کرتے ہیں' معاشرہ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گم شدگانِ ادب کو تلاش کرنے والے بھی عزت کے مستحق ہیں۔ جب کسی پرانے گم شدہ شاعر پر کوئی کتاب نظر آتی ہے تو ہم اسے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی ایک مفید کتاب حال ہی میں لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "آغا حجّو شرف۔ احوال و آثار"

ممکن ہے ہمارے قارئین میں سے کوئی پوچھے کہ یہ آغا حجو شرف کون ہیں؟ عرض ہے کہ پچھلی صدی کے لکھنؤ کے ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اسی لیے تو کاظم علی خاں نے ان پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اب کوئی قاری یہ سوال بھی کر سکتا ہے کہ یہ کاظم علی خاں کون ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خان صاحب ہندوستان کے چوٹی کے محققین میں سے ہیں۔ لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ مذاکروں اور سے می ناروں میں شرکت کے لیے اکثر ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ سفر کے دوران ریل گاڑی میں تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کا قاری دورانِ مطالعہ جھٹکوں اور ہچکولوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ خان صاحب کا تحقیقی کام اتنا گراں قدر اور وزنی ہے کہ..... معاف کیجیے "کہ" کے بعد جملہ پورا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ اس لیے ایک واقعہ سن لیجے۔ ایک مرتبہ خان صاحب کے مکان کا ایک حصہ گر گیا۔ دوست احباب ازرہِ خلوص

پُرسشِ احوال کے لیے آئے۔ ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق ہمدردی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب نے بڑی عجیب بات کہی: "خان صاحب آپ جس قسم کے ثقیل اور وزنی مضامین لکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا"۔ یہ واقعہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں لیکن تب لطیفے کے طور پر لکھا تھا، اب خان صاحب کی علمی دھاک بٹھانے کے لیے لکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ علمی دھاک سے پہلے خان صاحب کا مکان بیٹھ گیا۔

اب تک ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آغا حجو شرف اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ کاظم علی خاں نے ان پر کتاب لکھی ہے اور کاظم علی خاں اس لیے بڑے محقق ہیں کہ انھیں تحقیق کے لیے آغا حجو شرف جیسا بڑا موضوع ملا ہے۔ ان دو بڑوں کے درمیان ہم اس لیے آئے ہیں کہ خان صاحب نے ازراہ کرم اپنی کتاب کا ایک نسخہ ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں خوب اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ جب ایک بڑا محقق ایک بڑے شاعر سے دست و گریباں ہوتا ہے تو قاری کبھی دست بہ دل ہوتا ہے اور کبھی دست بہ سر۔

آغا حجو شرف نامور لکھنوی استاد خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ کاظم علی خان کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ۱۲۲۹ھ سے کچھ پہلے یا کچھ بعد پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر کا زمانۂ پیدائش متعین کرنے کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہے کہ کوئی سنہ تصور کر لیا جائے اور پھر کہہ دیا جائے کہ شاعر اس سنہ سے پہلے یا بعد پیدا ہوا ہو گا۔ اس میں غلطی کا امکان نہیں رہتا کیونکہ شاعر کبھی نہ کبھی ضرور پیدا ہوا ہو گا۔ اگر کوئی ایک سنہ متعین کر دیا جائے اور وہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے تو آیندہ کے محققوں کو اعتراض کا موقع مل جائے گا۔ شاعر کی پیدائش پر نہیں، محقق کی تحقیق پر۔

کاظم علی خاں نے آغا حجو شرف کی پیدائش کی طرح ان کی وفات کے زمانے کو بھی محدود نہیں کیا۔ صرف یہ فرمایا ہے کہ اس بات کا قطعی ثبوت موجود ہے کہ وہ ۱۸۸۴ء تک زندہ تھے لہٰذا سالِ وفات کو اس سنہ کے بعد تلاش کرنا چاہیے۔ ہماری ناقص رائے میں بجائے سالِ وفات کے اگر خود شاعر ہی کو تلاش کر لیا جائے تو بہتر ہو گا۔ پرانے زمانے کے لوگ لمبی عمریں پایا کرتے تھے۔ کوئی تعجب نہیں اگر آغا حجو شرف زندہ ہوں اور کلکتہ میں مقیم ہوں جہاں وہ واجد علی شاہ اختر کے متوسلین میں شامل تھے۔ آج کل ڈاکٹر مظفر حنفی کلکتہ یونی ورسٹی سے منسلک ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ کچھ وقت نکال کر آغا حجو شرف کو تلاش کریں اور اُن سے اُن کا صحیح سالِ پیدائش معلوم کر کے کاظم علی

خاں کو بتادیں تا کہ وہ ۱۲۲۹ھ کے آس پاس بھٹکنے کی زحمت سے بچ جائیں۔

ہو سکتا ہے کہ آغا حجو شرف کا سالِ وفات متعین کرنے میں کاظم علی خاں نے عمداً بحث کا دروازہ کھلا رکھا ہو، تا کہ مزید تحقیق کی گنجایش رہے اور اہلِ تحقیق تا دیر موشگافیاں کرتے رہیں جس کے نتیجے میں تحقیقی کتابیں پڑھنے والے اپنے اپنے سنینِ وفات سے آگاہ ہو سکیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے بھی ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔

چند سال قبل ہم لکھنؤ گئے تو جناب کاظم علی خان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سلام دعا کے فوراً بعد ہم نے اخلاقاً نیز اپنی شومیِ قسمت سے پوچھ لیا کہ آج کل آپ کس موضوع پر دادِ تحقیق دے رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ مصحفی کے ایک ہم عصر بھورے خاں آشفتہ کے سالِ وفات پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ دو گھنٹے تک ہمیں اپنے نتائجِ تحقیق سے مستفید فرماتے رہے۔ جب بھورے خاں آشفتہ کا مُردہ اچھی طرح خراب ہو چکا تو انھوں نے فاتحانہ نظروں سے ہماری طرف اس طرح دیکھا جیسے ہمیں بھورے خاں آشفتہ ہوں۔ پھر فرمایا: "اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے"؟ ہم نے عرض کیا: "آپ نے آشفتہ کے ساتھ ساتھ ہمارا سالِ وفات ہی نہیں تاریخ، مہینہ اور وقت بھی متعین کر دیا ہے"۔ خان صاحب ہمارے جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "جی ہاں تحقیق میں یہ اکثر ہوتا ہے کہ آپ کسی ایک شخص کا سالِ وفات تلاش کریں تو بہت سوں کے سال ہائے وفات خود بخود معلوم ہوتے چلے جاتے ہیں"۔

کاظم علی خان نے بڑی محنت سے آغا حجو شرف کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر اتنی محنت آغا صاحب اپنی شاعری پر خود کرتے تو آج اپنے تعارف کے لیے ایک محقق کا احسان نہ اٹھاتے۔ ان کا دیوان، دیوانِ غالب کی طرح مقبولِ خواص و عوام ہوتا۔ بہرحال کاظم علی خاں کو تو محنت کرنی ہی تھی، سو انھوں نے تحقیق کا حق نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔ انھوں نے آغا صاحب کی غزلوں کی تصنیف کا زمانہ متعین کیا ہے۔ ان کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کی ہیں، ان کی مثنویات کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ آغا صاحب نے اپنے عہد کے کس کس استاد کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ آغا صاحب پہلے لکھنؤ میں اور پھر کلکتے میں مہاجرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے ان کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی لہٰذا دوسروں کی زمینوں ہی میں غزلیں کہتے تھے۔ اس صورت حال کی وضاحت کے لیے کاظم علی خاں نے آغا صاحب کے اور دیگر اساتذہ کے ہم طرح اشعار کثرت سے نقل کیے

ہیں۔ اس طرح آغا صاحب کے شعروں کے ساتھ دوسرے اساتذہ کے شعر بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بھی آغا صاحب کی عظمت کا ثبوت ہے کہ ان کی وجہ سے دوسروں کے کچھ اچھے شعر پڑھنے کو مل گئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آغا صاحب کے ہاں اچھے شعر نہیں ملتے۔ آیئے آپ کو ان کے چند مزے دار شعر سنائیں۔

بہت سے شعرائے لکھنؤ خواجہ حیدر علی آتش کے خلاف تھے اور ان کی مقبولیت سے جلتے تھے۔ آغا حجو شرف اپنے استاد کی مخالفت دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ دیکھیے انھوں نے کس عمدہ پیرائے میں مخالفوں کو بددعا دی ہے :

مرے استاد کے جو نام سے دنیا میں جلتے ہیں
نکالے ان پہ یارب آتشِ دوزخ غبار اپنا

دوزخ کے ساتھ ساتھ آغا صاحب کو اِندر کے اکھاڑے سے بھی خاصی دلچسپی تھی :

اِندر کا اکھاڑا ہے مرے شیشۂ دل میں
کیا بزم ہے ایک ایک پریزاد سے پوچھو

شیشۂ دل بھی کم اِندر کے اکھاڑے سے نہیں
اس میں معشوق اترتے ہیں پری رو ہو کر

آغا صاحب کے کلام میں ایک خوبی ایسی ہے جو شاید دنیا کے کسی دوسرے شاعر کے کلام کے میں نہیں ملے گی۔ وہ سوءِ تنفس کے مریض تھے۔ ان کے دیوان میں بے شمار ایسے شعر ملتے ہیں جن میں اس مرض کا ذکر ہے۔ کاظم علی خاں نے یہ سارے شعر یک جا کر دیے ہیں تا کہ قاری کو اصل دیوان سے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔ آغا صاحب نے سوءِ تنفس کے ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ فی الحال صرف ایک شعر سنیے اور شاعر کی نازک خیالی کی داد دیجیے :

تمھارا بھر کے دم سوءِ تنفس میں قضا کرتا
یہ حسرت تھی کہ جو شرط محبت تھی ادا کرتا

کاظم علی خاں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ آغا صاحب پر مذکورہ مرض کا پہلا حملہ کب ہوا تھا۔ انھوں نے اس پر اظہارِ افسوس بھی کیا ہے کہ جن ادبی مورخوں نے اپنی کتابوں میں آغا صاحب کا

ذکر کیا ہے' وہ ان کی بیماری سے بے خبر تھے۔ اس پر ہم بھی اظہار افسوس کرتے ہیں اور ادبی مورخوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ آیندہ جب کبھی آغا صاحب کے بارے میں کچھ لکھیں تو ان کی سوءِ تنفس کی بیماری کا ذکر ضرور کریں۔ ہم ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر مظفر حنفی کو زحمت دیں گے کہ کلکتے میں اگر اُن کی ملاقات آغا صاحب سے ہو جائے تو ان کی مزاج پرسی کریں اور پوچھ لیں کہ مرض میں افاقہ ہوا یا کاظم علی خان کی کتاب پڑھ کر اضافہ ہوا۔ یہاں ہم آغا صاحب کا کلام پڑھنے والوں کو بھی متنبہ کرتے ہیں کہ وہ احتیاط سے کام لیں کیوں کہ اس کلام کو پڑھتے ہوئے بعض اوقات دم گھٹنے کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اس قسم کے شعر نظر سے گزرتے ہیں:

تمھارے تشنۂ دیدار کی یہ حالت ہے
کہ نل کے پانی بھی اب تو پیا نہیں جاتا

کاظم علی خان نے بتایا ہے' آغا حجو شرف باغوں اور لالہ زاروں کی سیر کے شیدائی تھے۔ صبح تڑکے بیدار ہو کر ہوا خوری کے لیے نکل جاتے تھے۔ اسی لیے ان کے کلام میں لالہ' سمن' گلزار اور باغ جیسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے جو پندرہ بیس شعر پیش کیے ہیں' ان میں یہ شعر بھی ہے:

گلوں میں جا کے جو دل کی تلاش کی ہم نے
چھدا ہوا اسے اک نوکِ خار میں دیکھا

واقعی ہوا خوری اچھی چیز ہے۔ اگر آغا صاحب میں اس کی عادت نہ ہوتی تو وہ دل کی تلاش میں کامیاب نہ ہوتے اور یہ قیمتی چیز نوک خار میں چھدی پڑی رہتی۔

کاظم علی خان نے بتایا ہے کہ آغا صاحب کی نواسی کی شادی مرزا حامد علی کوکب سے ہوئی تھی۔ تخلص سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صاحب بھی شاعر تھے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کاظم علی خان کی اگلی کتاب آغا صاحب کے نواس داماد کے بارے میں ہو۔ تحقیق کے لیے یہ ایک اچھا موضوع ہے۔

(۲۲/ فروری ۱۹۹۰ء)

نقدِ مستعار

نقاد کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو وہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے: "ڈبویا تجھ کو ہونے نے"۔ لیکن یہ اکیلے نہیں ڈوبتے' اپنے ساتھ ادب کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ یہ نقاد دوسروں کے صبر کا امتحان لیتے ہیں' خود کسی مشکل (از قسمِ مطالعہ وغیرہ) میں نہیں پڑتے۔ یہ "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے' بقول شخصے' دوسروں کی تحریروں سے تیسروں کے اقتباسات لے کر تنقیدی مقالے تیار کرتے ہیں۔ اِس قسم کی تنقید کو اصطلاحاً "نقدِ مستعار" کہا جاتا ہے۔ اِس کے معنی ہیں' ایسی تنقید جو دوسروں سے ادھار لی گئی ہو۔ "نقد" کے ساتھ "ادھار" کو جو تعلق ہے' اُس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس قسم کی تنقید کا ادب میں وہی مقام ہوتا ہے جو حسابیات میں بہی کھاتے کا۔

بہی کھاتے والے نقاد ترقی کرکے شماریات کے ماہرین بن جاتے ہیں۔ اُن کی تنقید' فہرست سازی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مثلاً مقالے کا عنوان ہوگا "جدید اردو غزل"۔ غزل تو اُس میں کہیں نظر نہیں آئے گی' البتہ غزل گو شاعروں کی لمبی لمبی قطاریں ہر طرف دکھائی دیں گی۔ فہرست سازوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نام چھوٹنے نہ پائے' خواہ معقولیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لیکن معقولیت کا دامن چھوٹنے کا سوال تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ دامن کبھی ہاتھ میں رہا ہو۔

کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو اپنے عجزِ بیان کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے لکھتے ہیں۔ گویا اظہار' عدم اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر بھی لکھیں' نتیجہ یکساں ہوتا ہے' یعنی بات سر سے گزر جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس قسم کے نقادوں کا علم چونکہ وسیع اور خیالات نہایت گہرے ہوتے

ہیں، اس لیے اردو زبان اِس وسعت اور گہرائی کا ساتھ دینے سے قاصر رہتی ہے۔ معترضین اِس قسم کے نقادوں کو عجز بیانی کا طعنہ دیتے ہیں، حالاں کہ طعنوں کی مستحق اردو زبان ہے جو چار پانچ سو سال سے مروج ہونے کے باوجود اپنی تنگ دامانی کا علاج نہیں کر سکی۔ ہمیں اِس قسم کے نقادوں پر رحم آتا ہے کہ علم تو ان کے پاس بہت سا ہے اور قاری ایک بھی نہیں۔

معاف کیجیے، اگر ہم اسی طرح نقادوں کی قسمیں گنواتے رہے تو ہمارا کالم ہی نہیں، ہم خود بھی ختم ہو جائیں گے اور پھر بھی موضوع کا حق ادا نہیں ہو گا۔ یہاں آپ سوال کر سکتے ہیں کہ جب حق ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا تو اس موضوع پر کالم لکھنے کی ضرورت کیا تھی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہم کسی ضرورت کے تحت کالم نہیں لکھتے، یہ معاملہ عادت کا ہے۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔

قصہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں ممتاز نقاد شمیم احمد کا نیا تنقیدی مجموعہ "زاویۂ نظر" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سوچا اس پر ایک کالم لکھ دیں۔ قلم ہاتھ میں لیا تو خیال آیا کہ پہلے ایک زوردار تمہید باندھی جائے جس میں نقادوں کی قسمیں بیان کی جائیں اور کسی ایک قسم کے تحت شمیم احمد کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ لیکن جب تمہید کا کچھ حصہ لکھا جا چکا تو احساس ہوا کہ نقادوں کی معروف اقسام کے تحت شمیم احمد کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اُن کا حال تو میر تقی میر جیسا ہے :

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

شمیم احمد کے ٹیڑھ پن کا اِس سے اندازہ کیجیے کہ آج کل پاکستان کے بیشتر لکھنے والے دو دبستانوں میں منقسم ہیں لیکن شمیم احمد نے اپنی ڈیڑھ اینٹ (یا پتھر) کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ سلامت روی کا تقاضا تو یہ تھا کہ شمیم احمد کسی ایک دبستان سے وابستہ ہو کر یا ہماری طرح دونوں کی خوشہ چینی کر کے ادب کی خدمت کرتے لیکن انھوں نے دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ کبھی اِس دبستان پر خشت باری کرتے ہیں کبھی اُس دبستان کو سنگ ہائے ملامت کا ہدف بناتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں دبستانوں والے آپس میں تو الجھتے رہتے ہیں لیکن شمیم احمد سے کچھ نہیں کہتے۔ وجہ ظاہر ہے کہ دونوں اپنے اپنے دشمن کی رسوائی پر خوش ہوتے ہیں۔

میر صاحب نے اپنے شعر میں جس روکھے پن کا ذکر کیا ہے، اُس کا مطلب یہ نہیں کہ میر صاحب یا شمیم احمد شگفتگیِ طبع سے محروم ہیں۔ میر صاحب کے بے شمار شعروں اور شمیم احمد کے

ان گنت جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طنز و مزاح کے آداب سے واقف ہیں۔ بلکہ شمیم احمد تو میر صاحب سے دو ہاتھ آگے ہیں۔ وہ فقرے بازی اور جملے سازی کو تنقید کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "ہمارے ہاں تنقید میں بعض حضرات فقرہ بازی کو غیر سنجیدہ اور قبیح فعل سمجھتے ہیں۔ گویا اُن کا خیال یہ ہے کہ تنقید نگار کو ایک ٹھس اور بے مغز آدمی ہونا چاہیے جس کو سوائے احمقانہ خیالات کی جگالی اور مکھی پر مکھی بٹھانے کے کچھ اور نہیں کرنا چاہیے' حالاں کہ فقرہ اور جملہ وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو خیالات کا تجزیہ نئے انداز سے کر سکتا ہو یا کسی فن پارے یا نقطۂ نظر کی روح تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو"۔ (ص ۹۴)

اِس کے بعد یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ روکھے پن سے مراد بے مروتی ہے۔ سو بہ حیثیت نقاد شمیم احمد اِس معاملے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ کسی مصنّف یا کتاب پر لکھتے ہوئے مصنّف سے اپنے ذاتی مراسم کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ حالاں کہ ایسے موقعوں پر تنقید کو بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں شمیم احمد کے نزدیک تنقید اتفاقِ رائے کا نہیں' اختلافِ رائے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۳۵ برسوں سے موصوف دنیائے ادب میں اکیلے ہی حزبِ اختلاف کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

یہاں تک میر کے پہلے مصرع کی تشریح تھی' اب آیئے دوسرے مصرع کی طرف۔ تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر کو تو کم سمجھا گیا تھا لیکن شمیم احمد کو غلط سمجھا گیا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اُن کے ہاتھ میں نقاد کا قلم نہیں' اندھے کی لاٹھی ہے کہ جسے بھی لگ جائے۔ عام طور پر لوگ اُن سے ذرا دور ہی رہتے ہیں کہ پتا نہیں لاٹھی کا رخ کب کس طرف ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی نے شمیم احمد کو تقریبِ رونمائی میں مدعو نہیں کیا اور اپنی کتاب کا دیباچہ تو کیا' فلیپ بھی نہیں لکھوایا۔ بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کتاب سرے سے اُن کی نظر ہی سے نہ گزرے۔ ہمارے خیال میں شمیم احمد کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ وہ ٹیڑھے اور روکھے ضرور ہیں لیکن غیر منصف مزاج نہیں۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں بے شمار اچھی کتابوں کو سراہا ہے اور اچھے مصنّفوں کو اُن کی کاوشوں پر داد دی ہے۔ ہاں جہاں کہیں کوئی گڑبڑ نظر آتی ہے' وہاں وہ تیغِ بے نیام ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نادر شاہ کی تلوار بن جاتے ہیں اور قتلِ عام کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے قتلِ عام میں گناہ گاروں کے ساتھ بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں۔ اس میں شمیم

احمد کا کوئی قصور نہیں، نادر شاہ کی تلوار چیز ہی ایسی ہے جو گناہ گار اور بے گناہ کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔

اوپر کتابوں کی رونمائیوں سے شمیم احمد کے اجتناب کا ذکر آیا ہے، اس کی وجہ خود اُن کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے: "کتاب کی رونمائی سے مجھے طبعاً چڑ رہی ہے۔ کچھ پڑھنا تو درکنار اس میں شرکت بھی میرے لیے ایک معیوب اور ناگوار فعل رہا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں ادیب اور شاعر کے دولھا بننے کے ارمان کو فن کار کی بے نیازی، دکھ بھوگنے اور انجانے خواب دیکھنے کے عمل کے منافی سمجھتا ہوں اور جب یہ عمل شادی شدہ اور بالغ فن کار انجام دیتے ہیں تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے جیسے عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد اُن کے بہت سے ارمان ناآسودہ رہ گئے ہیں اور وہ اپنی کتابوں کی رونمائیوں کے ذریعے اپنی کسی ناآسودہ خواش کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں"۔ (ص ۲۳۵)

لیکن "زاویۂ نظر" میں صرف اسی قسم کی مزے دار باتیں نہیں ہیں، اور بھی بہت کچھ ہے۔ ادب، ادبی مسائل اور ادیبوں کے بارے میں دو درجن سے زیادہ مضامین کا یہ مجموعہ ادب کے سنجیدہ قارئین کی نظر سے ضرور گزرنا چاہیے۔ یہ روایتی تنقید نہیں ہے کہ پڑھنے والا اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتے۔ یہ روایتی تنقید کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جس سے قاری کے خون میں حدّت پیدا ہوتی ہے۔ آپ شمیم احمد سے لاکھ اختلاف کریں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی تحریریں ادب اور اُس کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی راہ دکھاتی ہیں۔

(۱۰/ مارچ ۱۹۸۸ء)

طنز و مزاح کا خانۂ خالی

ایک مرتبہ ہم نے شفیقہ فرحت کے حوالے سے لکھا تھا کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا حال خاصا پتلا ہے' لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین بارہ بارہ کتابوں کے مصنف ہیں تو ہمارے دل میں ہندوستان کے اردو قارئین کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ان بے چاروں کا حال بھی خاصا پتلا ہو گا!

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اپنا لکھا آپ پڑھنے کی روایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے' انھوں نے بارہ بارہ کتابیں لکھ کر اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے۔ ان کا یہ احسان ہمیشہ اردو زبان پر رہے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے اردو کی گردن جھک جائے۔ واضح رہے کہ "گردن جُھکنا" ایک محاورہ ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک احسان سے زیر بار ہونا اور دوسرے شرمندہ ہونا۔ ہم نے یہ محاورہ پہلے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بھی انھی معنوں سے سروکار رکھیں' دوسرے معنوں کو لغت نویسوں کی غلطی سمجھیں۔ آخر لغت نویس بھی ہماری آپ کے طرح انسان تھے اور انسان خطا کا پُتلا ہوتا ہے۔ لغت لکھی جائے یا کوئی عام کتاب' ایک کتاب لکھی جائے یا بارہ کتابیں' غلطی کا امکان بہرحال رہتا ہے لیکن صورت حال اُس وقت سنگین ہو جاتی ہے جب بارہ کتابوں کے بعد تیرھویں کتاب بغیر لکھے وجود میں آجائے۔

ممکن ہے بعض لوگ اوپر کے پیراگراف کے آخری جملے کو مہمل قرار دیتے ہوئے یہ پوچھیں کہ کوئی کتاب لکھے بغیر کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔ ہم پورے پیراگرف کو مہمل ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن آخری جملے کو نہیں۔ اس کے بامعنی ہونے کا ثبوت اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے جو بارہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں' ان کے انتخابات حال ہی میں شائع ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں اب وہ تیرہ تیرہ کتابوں کے مصنف بن گئے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آج کل ہندوستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے ناموں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ (معلوم نہیں خود بج رہا ہے یا دونوں خود ہی بجا رہے ہیں) جس رسالے کو اٹھایئے اس میں ان دونوں کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین' شخصی خاکے اور سفرنامے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں طنز و مزاح کی کانفرنسیں ہوتی ہیں اور ان کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا انھیں دونوں کے سر بندھتا ہے (سر کا کچھ نہ کچھ مصرف تو ہونا ہی چاہیے) رشید احمد صدیقی' کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کی وفات کے بعد اردو طنز و مزاح میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے ان دونوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پُر کیا ہے۔ "خانۂ خالی را دیومی گیرد" اسی کو کہتے ہیں۔ پچھلے سال یہ دونوں پاکستان تشریف لائے تو ان کی بڑی دھوم ہوئی تھی۔ ہر محفل میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کے مضامین ذوق و شوق سے سُنے گئے۔ پاکستانیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ ہندوستانی ادب کے خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی ہیں۔ مزید حیرت اس پر ہوئی کہ ان دونوں کی کوئی کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہوئی حالانکہ ہندوستان کی ہر اچھی کتاب کا جعلی ایڈیشن یہاں چھپ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان دونوں کی جو کتابیں ہندوستان میں چھپی ہیں ان میں سے بیشتر کی طباعت و کتابت کچھ ایسی ہے کہ صورت سے جعلی ایڈیشن دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی پبلشر ایسے گئے گزرے نہیں کہ جعلی ایڈیشنوں کے جعلی ایڈیشن چھاپیں۔

بہرحال وجہ کوئی بھی ہو' اہل پاکستان کا یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے لاعلم رہنا افسوس ناک ہے۔ دونوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی کتابیں پاکستان میں چھپوائیں۔ دونوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ انھیں جو زرِ مبادلہ ملا ہے وہ اتنا نہیں ہے کہ کتابیں چھپوائی جاسکیں۔

اکادمی ادبیات سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ اکادمی صرف معذور ادیبوں کی مدد کرتی ہے۔ ایسے ادیبوں کی مدد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو معذور بھی نہ ہوں اور پھر پاکستانی بھی نہ ہوں۔ اگر یہ دونوں پاکستانی ہوتے تو انھیں بہت سے صحت مند پاکستانی ادیبوں کی طرح معذور ادیبوں کے فنڈ سے مدد دی جاسکتی تھی۔ واضح رہے کہ اکادمی کے پاس معذور ادیبوں کی مدد کے لیے جو فنڈ ہے اس کا بڑا حصہ صحت مند ادیبوں پر صرف ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو

ادیب معیاری ادب تخلیق نہ کر سکیں انھیں بھی معذور ادیب تصور کیا جاتا ہے۔

مایوسی کے اس عالم میں ایک ادب دوست امید کی کرن بن کر طلوع ہوئے اور انھوں نے اپنے ادارے کی طرف سے یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابات شائع کرنے کی پیش کش کی جو فوراً قبول کرلی گئی۔ فوراً اس لیے کہ موصوف کو اپنی پیش کش پر نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکے۔ ویسے اس کا امکان نہیں تھا کیوں کہ یہ صاحب کتابوں کی اشاعت کا کام محض شوق کی بنا پر کرتے ہیں تجارت ان کا مقصد نہیں۔ اسی لیے وہ کتابیں چھاپ کر گودام میں رکھ دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کتاب اس وقت تک فروخت نہیں ہوتی جب تک اسے چھپے ہوئے ایک طویل عرصہ نہ گزر جائے۔ کتاب پرانی ہو جائے تو اُس کا شمار نوادر میں ہوتا ہے اور نوادر بآسانی فروخت ہو جاتے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے انتخابات بالترتیب "زیرِ غور" اور "قطعِ کلام" کے ناموں سے شائع ہو گئے ہیں۔ انتخاب کا کام معروف خاتون صحافی اور افسانہ نگار رعنا فاروقی نے انجام دیا ہے۔ رعنا فاروقی کی شہرت کا سبب کہانیوں کا وہ مقبول سلسلہ ہے جو "تین عورتیں تین کہانیاں" کے نام سے چھپتا رہا ہے۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابوں کو اِس سلسلے کی ایک کڑی نہ سمجھا جائے۔ یہ بالکل مختلف نوعیت کا کام ہے۔

رعنا فاروقی کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے پہلے دونوں مصنفوں کی دو درجن کتابوں کو پڑھا اور پھر اُن میں سے ایسی تحریروں کو الگ کیا جو اُن کے نزدیک بہترین ہیں۔ ہمت کی داد ہم نے اس لیے دی ہے کہ دو درجن کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی وہ اس لائق رہیں کہ بُرے بھلے میں تمیز کر سکیں۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو تحریروں کا انتخاب قرعہ اندازی سے کرتے اور پڑھنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے۔ ویسے بھی یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریریں سراپا انتخاب ہوتی ہیں۔ انتخاب کا انتخاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیگ میں سے کچھ چاول نکال کر کہا جائے کہ یہ باقی چاولوں سے بہتر ہیں۔ دیگ میں سب چاول ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی اردو کمزور ہے، ممکن ہے کہ وہ ہمارے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالیں کہ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم دیگیں پکانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کمزور اردو والوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دیگیں پکانا، طنز و مزاح لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

بہرحال پاکستانی قارئین کے لیے ان انتخابات کی ضرورت تھی۔ ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے

کہ دونوں مصنفین کی وہ تحریریں جو نگاہِ انتخاب میں اعتبار حاصل نہ کر سکیں، کیسی ہوں گی۔ انھیں پڑھنے کی خواہش بھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔ رعنا فاروقی نے دونوں کتابوں کے دیباچوں میں نہایت عمدگی سے ان کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔ اس کے لیے رعنا فاروقی اور دونوں مصنفین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ رعنا فاروقی اس لیے کہ انھیں خوبیوں کی تلاش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین اس لیے کہ بالآخر اُن کی تحریروں کی خوبیاں تلاش کرلی گئیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اردو کے محقق جو کام دو سو سال بعد کرتے، وہ آج ہمارے سامنے انجام پا گیا۔

"زیرِ غور" میں ۱۹ مضامین اور چار شخصی خاکے ہیں۔ ان مضامین کا تعلق معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے ہے۔ کچھ مضامین ادب اور ادبی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کی نظر انھیں گوشوں کی طرف جاتی ہے جہاں معمول کے خلاف کوئی بات نظر آتی ہے۔ وہ پہلے سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر نہایت "معصومیت" کے ساتھ مسئلۂ زیرِ بحث کو سمجھنے اور سمجھانے کی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں کہلاتا ہے۔ وہ نہایت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شرافت، اخوت اور بہادری وغیرہ کے اوصاف کی وجہ سے انسان اس کا مستحق ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کہلائے۔ پھر وہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتے ہیں اور انسانوں میں ان خوبیوں کو تلاش کرلیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کی ایک مثال یہ ہے: "دلیری اور بہادری میں انسان کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کسی کی جیب کاٹ لینا، مکان لوٹ لینا، فساد برپا کروا دینا، چھری مار دینا، مندر سے مورتی اور مسجد سے جوتے اُڑا لینا، انسان کے لیے روزمرہ کے کام ہیں..... ایسے کام انجام دینے سے ایک سکون سا محسوس ہوتا ہے"۔

ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے ہوئے بھی انھوں نے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ "مرزا غالب کی صحت جسمانی" ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں انھوں نے کلامِ غالب سے ثابت کیا ہے کہ غالب گوناگوں امراض کا ہدف تھے اور اُن کی ساری زندگی مختلف بیماریوں میں گزری۔ ہمارے محققوں خصوصاً غالب پر تحقیق کرنے والوں کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے اور اس موضوع پر مزید تحقیق کرنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غالب زیادہ بیمار تھا یا اس کے محقق۔

اس کتاب میں جو چار شخصی خاکے ہیں، وہ باقر مہدی، سلیمان اریب، راجندر سنگھ بیدی اور

کرشن چندر کے ہیں۔ ان میں سے آخری تین اب ہمارے درمیان موجود نہیں اور باقر مہدی، خدا انھیں سلامت رکھے، پہلے سے زیادہ موجود ہیں۔ انھیں اپنی کالی غزلوں اور پیلی تنقید سے اتنی شہرت نہیں ملی جتنی یوسف ناظم کے خاکے سے ملی ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یوسف ناظم کی شہرت میں بھی اس خاکے کا بڑا حصہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ آیندہ چل کر باقر مہدی اور یوسف ناظم اسی خاکے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں۔

مجتبیٰ حسین کے انتخاب "قطع کلام" میں مضامین اور خاکوں کے علاوہ سفرنامے بھی شامل ہیں۔ موصوف خاصے "جہاں دیدہ" ہیں۔ انھوں نے محاورۃً دنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انھوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابن انشا سے لی ہے۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ عام لکھنے والے مُردوں سے متعلق طبع زاد واقعات بیان کرتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین زندوں کے بارے میں بھی طبع زاد باتیں لکھتے ہیں اور اس کی داد زیادہ تر اُنھیں سے ملتی ہے جن کے بارے میں یہ باتیں لکھی جاتی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر افسانہ گو ہیں۔ ان کے بیشتر بلکہ تمام مضامین افسانوی نوعیت کے ہیں جن میں وہ دلچسپ واقعات اپنے دلچسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان میں اس قسم کے معنی خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں: "اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا۔ اسے ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ پہلی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے اور دوسری صورت میں ادیب"۔

"قطع کلام" میں تیرہ مضامین چار شخصی خاکے اور دو سفرنامے ہیں۔ شخصی خاکے راجندر سنگھ بیدی، کنھیالال کپور، صادقین اور مشفق خواجہ کے ہیں۔ سفرنامے جاپان اور روس کے ہیں۔ مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے، ان کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا اندازِ بیان ہے۔ وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے اور اس کیفیت سے اسی وقت آزادی حاصل کرتا ہے جب مضمون ختم ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ کاش مجتبیٰ حسین مضمون کو ختم نہ کرتے اپنی بات جاری رکھتے۔ صادقین کا خاکہ ایک ایسی ہی تحریر ہے۔ صادقین کی شناخت کے

لیے اس کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کے ساتھ اس خاکے کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ تصویروں میں صادقین کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے' اس خاکے میں ہم جیتے جاگتے صادقین سے ملتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شخصیات پر لکھتے ہوئے واقعے اور افواہ میں فرق نہیں کرتے۔ ہم اِس قدر مبالغے سے تو کام نہیں لیں گے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ مجتبیٰ حسین واقعے کو افواہ بنائیں یا افواہ کو واقعہ دونوں صورتوں میں ان کے اسلوبِ بیان کی دلکشی برقرار رہتی ہے۔

(۲۶/ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

نقشہ کھینچنا یا بگاڑنا

محققوں کے بارے میں ہماری رائے وہی ہے جو اہلِ نظر کی نثری نظمیں لکھنے والوں کے بارے میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو طبع موزوں نہیں رکھتے' وہ نثری نظمیں لکھتے ہیں۔ ہمارا قول برحق یہ ہے کہ جو مذاقِ سلیم نہیں رکھتے وہ محقق بن جاتے ہیں۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔ مسکراتے وہ اِس لیے نہیں کہ اِس سے چہرے کی علمیت مجروح ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب اِس لیے نہیں رکھتے کہ اُس سے ہاتھ میلے نہیں ہوتے۔ محققوں کو صرف کرم خوردہ' دریدہ' آب رسیدہ اور گرم و سردِ زمانہ چشیدہ کتابوں سے دلچسپی ہوتی ہے تا کہ وہ یہ بتا سکیں کہ جن کتابوں کو کیڑوں نے مکمل طور پر کھانا پسند نہیں کیا' انھیں مکمل طور پر پڑھنے کا ہفت خواں طے کر لیا گیا ہے۔ ہر وہ کتاب جس کی اپنے زمانے میں کوئی قدر نہیں ہوتی' وہ آنے والے زمانوں میں محققوں کی وجہ سے اہم قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر دوست شاعروں سے یہ کہا ہے کہ اگر آج اُن کی قدر نہیں ہو رہی تو انھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے' آیندہ زمانے کے محقق اُن کے دیوانوں کی گرد جھاڑنے کا فریضہ ضرور انجام دیں گے۔ اِسی ضمن میں ہم نے ایک مرتبہ یہ بھی عرض کیا تھا کہ ایک فی صد شاعر آنے والی نسلوں کے لیے شعر کہتے ہیں' باقی ننانوے فی صد آنے والے محققوں کے لیے۔ یہ ننانوے فی صد شاعر اگر نہ ہوں تو محقق ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

محققوں کو زندہ ادیبوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اور جوں ہی کسی ادیب کا انتقال ہوتا ہے' اُس کے حالات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک علّامۂ تحقیق سے پوچھا: "حضرت' آپ کسی زندہ شخص پر تحقیق کیوں نہیں کرتے"؟ انھوں نے جواب دیا: "زندہ ادیب پر

تحقیق کی جائے تو اِس کا امکان ہے کہ وہ ہمارے نتائجِ تحقیق کی تردید کر دے۔ مُردہ ادیب دخل در معقولات کا مرتکب نہیں ہوتا"۔ اِس پر ہم نے عرض کیا: "یہ تحقیق کیا ہوئی' مُردوں پر مٹی ڈالنے کا کام ہوا"۔ انھوں نے فرمایا: "جی ہاں' نقاد زندوں پر مٹی ڈالتے ہیں اور ہم مُردوں پر"۔

پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں لیکن سارے محقق ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ بس ایک ڈاکٹر فرمان فتح پوری استثنا کی مثال ہیں۔ اُن کی طبیعت بھی شگفتہ ہے اور تحریر بھی۔ اُن سے مل کر جی خوش ہوتا ہے اور اُن کی کتابیں پڑھ کر قاری خودکشی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ بس ذرا مہد سے لحد تک کا وقفہ کم ہو جاتا ہے۔ اِس کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر عائد نہیں ہوتی' خود قاری اِس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ آخر اس کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ مہد سے لحد تک کے سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب کی تحقیق سے دل چسپی لے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑا مفید کام شروع کر رکھا ہے۔ وہ اپنے رسالے "نگار" میں ہر مہینے کسی ایسی "گم شدہ" کتاب کو شائع کر دیتے ہیں جو ایک مرتبہ چھپ کر عام نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہوتی ہے مگر اپنی افادیت کے اعتبار سے اِس لائق ہوتی ہے کہ اِسے دوبارہ منظرِ عام پر لایا جائے۔ "نگار" میں اِس طرح کی کئی مفید اور دلچسپ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِس مہینے "نگار" کا جو شمارہ شائع ہوا ہے' اُس میں علامہ نیاز فتح پوری کی تصنیف "مذاکراتِ نیاز" کا وہ حصہ شامل کیا گیا ہے جس کا عنوان "لکھنؤ اور لکھنویات" ہے۔ یہ اتنی دلچسپ کتاب ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے علامہ نیاز فتح پوری کے لیے مغفرت کی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لیے طولِ عمر کی دعا دل سے نکلتی ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری اپنی وضع کے منفرد ادیب تھے۔ علم اُن کے پاس اتنا تھا کہ اُن کے ہم عصروں میں سے بہت کم اُن کے درجے تک پہنچتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خداداد ذہانت کی بھی کمی نہ تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ذہانت کے بغیر علم دولتِ بیدار نہیں بنتا' دولتِ خفتہ ہی رہتا ہے۔ نیاز صاحب کا اسلوبِ تحریر بھی بڑا باغ و بہار ہے۔ یہ اُن چند اسالیب میں سے ہے جس پر اردو زبان ناز کر سکتی ہے۔ نیاز صاحب کی طبیعت میں شوخی بھی بلا کی تھی۔ اس شوخی کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔ کبھی "جن" کے نام سے رسالہ نکالتے تھے' کبھی قمر زمانی بیگم کا روپ دھار کر شاہ دل گیر جیسے ثقہ بزرگ سے عاشقانہ خط و کتابت کرتے تھے۔ کبھی مذہبی مسائل پر بحثیں چھیڑ کر علما کے منھ آتے تھے۔ کبھی مسلّمات کی تردید کر کے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیتے تھے۔ اُن کی شوخ طبعی نے کئی بار اُنھیں

خطرناک صورت حال سے دوچار کیا۔ اُن پر کفر کے فتوے بھی لگے اور عزت و آبرو پر بھی بنی۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "لکھنؤ اور لکھنویات" کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے، وہ نیاز صاحب کی شوخیِ طبع کا شاہکار ہے۔ اس کا کوئی جملہ ایسا نہیں جو تہ دار نہ ہو اور جس میں اہلِ لکھنؤ کی تاریخ اور معاشرت پر گہرا طنز نہ ہو۔ یہ دراصل نیاز صاحب کا سفرنامۂ لکھنؤ ہے جب انھوں نے رام پور یا بھوپال میں قیام کے زمانے میں چند روز کے لیے لکھنؤ کی سیر کی تھی۔ ان چند دنوں میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے اپنے خاص انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں انھوں نے جو ناگفتنی باتیں لکھی ہیں، انھیں نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور پھر نیاز صاحب نے تو صرف "ناپسند" ہی کو معیار بنایا ہے۔ ذرا دیکھیے وہ لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں کیا فرماتے ہیں: "لکھنؤ کا شاعر کبھی ایک یاوہ گو ناظم، ایک ہرزہ سرا متشاعر، ایک بوالہوس حسن پرست، ایک بازاری فقرہ باز، ایک عام پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا ہے کیوں کہ ماحول کا اقتضا یہی تھا"۔

ذاتی پسند اور ناپسند کے سلسلے میں نیاز صاحب نے جو معیار بنائے ہیں وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ مثلاً انھیں اس پر اصرار ہے کہ مولانا آسی اور افسر میرٹھی کے اصل نام (عبدالباری اور حامد اللہ) غیر شاعرانہ ہیں۔ اس قسم کے نام رکھنے والے شاعر نہیں ہو سکتے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ نام کی بنا پر کسی کے شاعر یا غیر شاعر ہونے کا فیصلہ کرنا ایک شاعرانہ خوش فعلی ہے۔ آسی اور افسر کے نام تو اُن کے والدین نے رکھے تھے، اس میں ان دونوں کا کوئی قصور نہیں۔ والدین کی "غلطی" کو اولاد کے کھاتے میں ڈال کر کوئی ادبی رائے قائم کر لینا بے ادبی ہے۔ ہمیں "بعض لوگوں" کی اِس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ کیا والدین اتنے سخن فہم نہیں ہو سکتے جو نومولود کی صورت دیکھ کر اندازہ کر لیں کہ یہ شاعر بن سکتا ہے یا نہیں اور پھر اِسی مناسبت سے بچے کا کوئی شاعرانہ یا غیر شاعرانہ سا نام رکھ دیں!

کسی شاعر کا نام سن کر اُس کے شاعر یا غیر شاعر ہونے کا فیصلہ کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح نقاد مطالعۂ کلامِ شاعر کے تکلیف دہ عمل سے گزرے بغیر شاعر کا ادبی یا غیر ادبی مقام متعین کر سکتا ہے۔

نیاز صاحب کو یہ شکایت بھی ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں کا کلام پڑھ کر اُن کی جو ذہنی تصویریں بنتی ہیں، وہ خود اُن تصویروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ اگر کسی شاعر کے کلام میں نازک خیالی ملتی ہے تو وہ صورت سے لوہار معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی کی شاعری میں رنج و غم کی فضا پائی جاتی ہے تو اندازِ گفتگو سے وہ مسخرہ دکھائی دیتا ہے۔ اِس صورت حال کو واضح کرنے کے لیے نیاز صاحب نے ایک "غیر لکھنوی" مثال پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں: "اوّل اوّل جب میں نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا تو اُن کے کلام کی رفعت اور جذبات کی بلندی کو سامنے رکھ کر جو صورت اُن کی میں نے قائم کی تھی، یہ تھی۔ ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور صحتِ جسمانی کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو بالکل "مسترسل الشعر" قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک خاص قسم کا نورانی خندہ ہر وقت جھلکتا ہوگا۔ معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی۔ بہ لحاظِ اخلاق یکسر عجز و فروتنی ہوں گے۔ بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی اور بہ حیثیتِ مجموعی اُن میں ایک ایسی کشش ہوگی کہ انسان خود بخود اُن کی طرف کھنچ جاتا ہوگا۔ لباس بالکل مشرقی وضع کا ہوگا اور نمایش سے دور۔ لیکن جب میں اُن سے ملا تو مجھے کسی قدر تکلیف ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میرے مزعومات کے مطابق نہ تھی۔ میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے اور اونچا کوٹ۔ ہر چند یہ ضروری نہیں کہ معمولی گفتگو بھی ایک شاعر کی شاعرانہ دلکشی رکھتی ہو، لیکن اِس کا تو وہم بھی نہ گزرا تھا کہ وہ قیام کو کیام اور قہقہہ کو کہکہہ بولتے ہوں گے۔ وہ مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اور میں حیران تھا کہ خدایا یہ اقبال دفعتہً اکبال کیسے بن گیا۔ آنکھیں چھوٹی اور بہت چھوٹی، جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ تربیت یافتہ۔ حقہ (حکہ) کے غیر لطیف و کثیف استعمال کی کثرت سے کمرے کی ساری فضا بدبو سے لبریز، چہرے کی ساخت، نقشے کی قطع و برید یکسر غیر دلچسپ اور عوایدمیں کوئی دلکشی نہیں"۔

ہمیں افسوس ہے کہ علامہ اقبال جن کے دل میں پوری قوم کے لیے ہمدردی کا جذبہ موجزن رہتا تھا، نیاز فتح پوری کو ذہنی تکلیف پہنچانے کا سبب بنے۔ گمانِ غالب ہے کہ وہ بغیر پیشگی اطلاع کے علامہ کے ہاں چلے گئے ہوں گے۔ اگر علامہ کو اُن کی آمد کی پہلے سے اطلاع ہوتی تو وہ ضرور فاقہ کشی کر کے اپنا وزن کم کر لیتے۔ آپریشن کے ذریعے آنکھوں کا سائز اور چہرے کی ساخت تبدیل کرا لیتے، حقے کی بجائے پان کے استعمال سے اپنا شین قاف درست کر لیتے۔ شلوار اور کوٹ کی جگہ انگرکھا

اور چوڑی دار پاجامہ زیب تن کر کے اپنے قدو قامت کو شاعرانہ وضع قطع میں ڈھال لیتے۔

نیاز صاحب کو علامہ اقبال سے تو یہ شکایت تھی کہ وہ پہلوانی جسم کیوں رکھتے ہیں۔ صفی لکھنوی سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ وہ دبلے کیوں ہیں۔ فرماتے ہیں: "صفی معمر شخص ہیں اور غیر شاعرانہ حد تک زار و نحیف۔ حالانکہ میں نے اُن کی شاعری سے اُن کے 'عظیم الجثہ' ہونے پر حکم لگایا تھا۔ نہ طبیعت میں شگفتگی نہ چہرے پر رونق، نہ اداؤں میں دل بستگی، نہ گفتگو میں جاذبیت۔ الغرض دنیاوی انسان ہونے کے لحاظ سے وہ صفر کا درجہ رکھتے ہیں اور ایک ایسی غیر جمالیاتی فضا اُن کے چاروں طرف محسوس ہوتی ہے کہ اگر قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ نہ دے دیا ہوتا تو شاید ہی کوئی شخص اُن سے ملتا"۔

افسوس کہ صفی لکھنوی کو بھی نیاز صاحب کی آمد کی پیشگی اطلاع نہیں ملی تھی، اور کچھ نہیں تو وہ کم از کم اپنی اداؤں میں دل بستگی ضرور پیدا کر لیتے۔

عزیز لکھنوی کو اِن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے: "میں نے انھیں بھی ایک نحیف الجثہ انسان سمجھ رکھا تھا، لیکن یہ بھی 'ماشاء اللہ' نکلے۔ چہرے کے گوشت نے چشم و بینی کا بدنمائی کی حد تک احاطہ کر رکھا ہے اور نقشے کی ذہانت معدوم ہو گئی ہے۔ چہرے کی خشونت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی خلش ہر وقت ایذا دیتی رہتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ گفتگو میں کوئی دلکشی ہے نہ کوئی عمق و ذہانت"۔

نیاز صاحب کی تحریر میں سفاکی اور دوسروں کی تضحیک کا جو عنصر شامل ہے، وہ اگر نہ ہوتا تو ہم ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ بات مان لیتے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس میں ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے، مگر اب تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ نیاز صاحب نے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا نقشہ کھینچا نہیں بگاڑا ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ کتاب کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں۔

(۸/ مئی ۱۹۸۶ء)

کمالِ کفش دوزی اور تنقید

ہندوستانی ناقدوں کا یہ عجیب شیوہ ہے کہ آپس میں لڑتے لڑتے تھک جاتے ہیں تو منھ کا مزہ بدلنے کے لیے کسی پاکستانی نقاد کے حال پر توجہ فرماتے ہیں۔ دو سال پہلے اِن ہندوستانی طالع آزماؤں نے ڈاکٹر وزیر آغا پر یلغار کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اِس حملے کو سہار گئے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ حملہ آوروں نے پسپائی ہی میں اپنی خیریت دیکھی۔ ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی کمزور اعصاب کا ناقد ہوتا تو وہ ڈاکٹر محمد حسن کی طرح نثری نظمیں لکھنے لگتا۔ حالانکہ ڈاکٹر محمد حسن کو الگ سے نثری نظمیں لکھنے کی ضرورت نہیں، اُن کے تنقیدی مضامین میں بھی نثری نظموں کا حُسن پایا جاتا ہے۔ بشرطے کہ جو کچھ پایا جاتا ہے، اُس کو "حُسن" کہا جا سکے۔

ہندوستانی نقادوں کی جنگجویانہ ذہنیت کا تازہ شکار پروفیسر عتیق احمد ہیں۔ پاکستان میں ایک سے ایک جغادری نقاد موجود ہے لیکن اُن سب کو چھوڑ کر، نزلہ بر عضوِ ضعیف کے مصداق، بیچارے عتیق احمد کو تختۂ مشق بنانا، آدابِ جنگ ہی کے نہیں، روزمرہ اخلاق کے بھی منافی ہے۔ عتیق احمد کا قصور صرف اتنا ہے کہ اُنھوں نے "جدید ادب؟ صرف ایک سوال" کے عنوان کے تحت ایک تنقیدی انشائیہ لکھا ہے جس میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ آدمی کو اپنی تخلیقی قوت کا مظاہرہ کرنا ہے تو شعر و شاعری یا افسانہ یا ناول یا ڈراما نویسی ہی کیوں کی جائے۔ یہ تخلیقی جوہر کسی اور مد میں کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ اور پھر اِس کا جواب مولانا حالی کے ایک شعر کے حوالے سے اِن الفاظ میں دیا ہے:

"معاشرے میں جو افادیت کفش دوزی کی ہے، وہ نہ پینٹنگ کی ہے نہ مجسمہ سازی کی، نہ شعر و ادب کی"۔ مولانا حالی کے جس شعر سے عتیق احمد نے استفادہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

کمالِ کفش دوزی ، علمِ افلاطوں سے بہتر ہے
ہے وہ نکتہ جسے سمجھے نہ مشّائی نہ اشراقی

عتیق احمد نے مشائی اور اشراقی کی جگہ شیرازی اور فارابی لکھا ہے، لیکن اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، موصوف کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں کہ اِن چاروں میں کیا فرق ہے۔

عتیق احمد نے ایک سیدھے سادے سوال کا سیدھا سادا جواب دیا ہے جس پر بحث کی گنجایش نہیں کیوں کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے لیے اپنے مزاج کی مناسبت سے کسی کام کا انتخاب کرے۔ اگر عتیق احمد کفش دوزی کو شعر و ادب سے زیادہ مفید سمجھتے ہیں تو ہمیں اُن سے اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اُنھیں اُن کے شعبۂ خدمتِ خلق میں باکمال دیکھنے کی دعا کریں، نہ یہ کہ اُن کے راستے میں روڑے اٹکائیں۔ ہندوستانی نقادوں نے عتیق احمد کے مقالے کے بارے میں جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی نقاد کسی پاکستانی نقاد کو خوش حال دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ پاکستانی نقاد مولانا حالی کے تجویز کردہ شغل سے بے نیاز ہو کر صرف تنقید لکھتا رہے اور پریشان حال رہے تاکہ اُس کی ذات سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ آسنسول (مغربی بنگال۔ بھارت) سے ایک رسالہ "پہچان" شائع ہوتا ہے۔ اُس کے تازہ شمارے میں عتیق احمد کا مذکورہ مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اِس مقالے کے بارے میں چار ہندوستانی نقادوں، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری کے ارشادات بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن اور قمر رئیس نے عتیق احمد کی رائے سے ایک سو ایک فی صد اتفاق کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں معزز نقاد ترقی پسندی کے حوالے سے عتیق احمد کے ادبی ہم زلف ہیں۔ عتیق احمد کے نام سے رسالہ "پہچان" میں مذکورہ مقالے کی بجائے خالی صفحات ہوتے تو تب بھی یہ دونوں اتّفاقِ کلّی فرماتے۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری نے جس انداز سے اختلافِ رائے کیا ہے، اُس سے ہندوستانی نقادوں کی تنگ نظری کا واضح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تبصرے کا آغاز اِن الفاظ سے کیا ہے: "عتیق احمد صاحب کا مضمون میں نے بہت توجہ سے پڑھا لیکن مجھے شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اِس کا کوئی واضح تاثر یا تصور میرے ذہن میں نہ بن سکا۔ اُن کے اکثر جملے ربط سے عاری ہیں۔ ایک پیراگراف سے

دوسرے پیراگراف تک فکری جست اتنی لمبی ہے کہ ربط اور بھی مفقود ہو جاتا ہے۔ اُن کے ساتھ چلنے کی کوشش میں قاری کی سانس پھولنے لگتی ہے"۔

یہ عجیب منطق ہے۔ مضمون لکھا ہے عتیق احمد نے اور شرمندہ آپ ہو رہے ہیں۔ حالانکہ اِس کا حق بھی مصنف ہی کو تھا۔ اگر زیرِ بحث مضمون کا کوئی واضح تاثر یا تصور آپ کے ذہن میں نہیں بن سکا تو اِس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ لکھتے وقت خود مصنف کا بھی یہی حال تھا۔ جملوں کے باہمی ربط سے عاری ہونے کا اعتراض بھی غلط ہے۔ جب نظم معرّیٰ ہو سکتی ہے 'نثر معرّیٰ کیوں نہیں ہو سکتی؟ اگر عتیق احمد کے ساتھ چلنے میں قاری کی سانس پھولتی ہے تو اِس میں عتیق احمد کا کیا قصور ہے؟ کیا کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے کہ قاری 'عتیق احمد کے قدومِ میمنت لزوم کے ساتھ اپنے قدومِ نامبارک ملا کر چلے!

عتیق احمد کا ایک بے ضرر سا جملہ ہے: "نظیر اکبر آبادی تشکیلِ معاشرہ اور حیات آفرینی کے فطری بہاؤ کے رخ اپنی ساری آرزومندی کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں"۔ اِس پر فاروقی کا تبصرہ اِن الفاظ میں ہے: "یہ عبارت بھی حسبِ معمول گنجلک ہے۔ لیکن اگر اِس کا مطلب یہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری کو تشکیلِ معاشرہ اور حیاتِ آفرینی کے لیے صرف کیا (تشکیلِ معاشرہ اور حیاتِ آفرینی تقریباً مہمل الفاظ ہیں) تو یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے نظیر کا کلام نہ پڑھا ہو"۔

یہ تبصرہ کم فہمی کی دلیل ہے۔ عتیق احمد کی عبارت ہرگز گنجلک نہیں۔ حیرت ہے کہ فاروقی استعارے کی زبان نہیں سمجھتے۔ "تشکیلِ معاشرہ" اور "حیات آفرینی" کو دو دریا تصور کیجیے اور "آرزومندی" کو ایک گھوڑا۔ اِن دریاؤں کے فطری بہاؤ کے رُخ پر پہلے تو گھوڑے کو چھوڑا گیا' اور پھر اُس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی گئیں۔ امید ہے اِس وضاحت کے بعد فاروقی اپنا اعتراض واپس لے لیں گے۔

فاروقی یہ دور کی کوڑی بھی لائے ہیں کہ عتیق احمد نے جو بات کہی ہے 'ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے نظیر کا کلام نہ پڑھا ہو۔ حیرت ہے کہ فاروقی نقاد ہونے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ کسی شاعر کے بارے میں کوئی بات کہنے کے لیے اُس کا کلام پڑھنا ضروری ہے۔ اِس قسم کی غیر ضروری شرط عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نقادوں کی ساری زندگی پڑھنے میں گزر جائے گی' لکھنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ اور پھر نظیر اکبر آبادی کے معاملے میں تو صورتِ حال نہایت پریشان کن ہے۔ اُس کی

مطبوعہ کلیات میں سیکڑوں الفاظ حذف کر کے نقطے درج کیے گئے ہیں۔ اِس وجہ سے نظیر کے کلام کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات تو نظریاتی قسم کے تھے، لیکن فضیل جعفری نے ذاتی اور شخصی اعتراضات کیے ہیں۔ مثلاً اُن کے تبصرے کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: "میرے نزدیک مضمون نگار FEATHER WEIGHT قسم کی چیز ہے۔ اُنھیں حقیقی نقاد تو کجا پروفیسر نظیر صدیقی تک بننے کے لیے عمر خضر درکار ہوگی"۔ کسی کو دیکھے بغیر رائے قائم کر لینا نہایت غیر ذمہ دارانہ فعل ہے۔ فضیل جعفری اگر کبھی عتیق احمد کو ایک نظر دیکھ لیں تو ایک نظر ہی میں اُنھیں اندازہ ہو جائے گا کہ موصوف FEATHER WEIGHT نہیں HEAVY WEIGHT ہیں۔ عتیق احمد کو ایک نظر دیکھ لینے کا یہ فائدہ بھی ہوتا کہ اُن کی عظیم و جسیم شخصیت سے مرعوب بلکہ خوف زدہ ہو کر فضیل جعفری اُن کے خلاف لکھنے کی بجائے ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کی طرح تائید میں لکھتے۔

فضیل جعفری نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ عتیق احمد کے ساتھ نظیر صدیقی پر بھی وار کر دیا۔ گویا گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پیس ڈالا۔ قطع نظر اِس سے کہ کون گیہوں ہے اور کون گھُن، فضیل جعفری کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نظیر صدیقی آسانی سے نظیر صدیقی نہیں بنے۔ اِس کے لیے اُنھیں بڑی محنت کرنی پڑی ہے جس کا ہلکا سا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے پروین شاکر کا سارا کلام اول تا آخر کئی مرتبہ پڑھا اور پھر وہ طویل اور مشہورِ زمانہ مضمون لکھا جو بجنوری کے مقدمۂ دیوانِ غالب کی طرح مقدمۂ کلامِ پروین شاکر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بجنوری مقدمہ جیت گئے تھے۔ لیکن جیت یا ہار کی کوئی اہمیت نہیں، اصل چیز کوشش اور محنت ہے۔

پروین شاکر کا ذکر آیا ہے تو ایک واقعہ بھی سن لیجے۔ پچھلے دنوں پروین شاکر کو جب اُن کے نئے مجموعے پر اکادمی ادبیات کا چالیس ہزار کا انعام ملا تو ساقی فاروقی نے کہا: "اِس رقم میں سے دس فی صد کا میں حق دار ہوں کیوں کہ انعام یافتہ مجموعے کا فلیپ میں نے لکھا ہے"۔ یہ بات نظیر صدیقی تک پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا: "ساقی فاروقی کا حصہ ادا کرنے کے بعد جو رقم بچے وہ مجھے ملنی چاہیے کیوں کہ پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت میرے مقالے کی وجہ سے ہے"۔ اِس واقعے سے ہمارے فلیپ نگاروں اور نقادوں کی اخلاقی نیز مالی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

فضیل جعفری کے چند جملے ملاحظہ فرمایئے: "عتیق احمد کو ترقی پسند نظریات سے خاصا شغف ہے۔ اگر وہ صرف مارکس اور اینگلز کی تحریریں پڑھ لیتے تو اُنھیں اپنے سوالات کے جواب مل جاتے لیکن ایسا لگتا ہے کہ بہت سے دوسرے لکھنے والوں کی طرح اُنھیں بھی پڑھنے کا نہیں، صرف لکھنے کا شوق ہے۔ اگر صاحبِ مضمون مطالعے کے تعلق سے اتنے پیدل واقع نہ ہوتے تو...."۔

"تو" کے بعد بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن اِس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی فضیل جعفری کی متعصبانہ ذہنیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ عتیق احمد نے اپنے سوالوں کے جواب مارکس اور اینگلز سے طلب کیے تھے نہ فضیل جعفری سے۔ اُنھوں نے مذکورہ مقالہ محض اِس لیے لکھا تھا کہ خود ہی سوال کریں اور خود ہی جواب دیں۔ اور اِس میں وہ خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ اِس کامیابی کا اندازہ پنجابی کے مشہور شاعر ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی ایک رباعی سے کیا جا سکتا ہے۔ رباعی تو ہمیں یاد نہیں، اُس کا مفہوم یہ ہے کہ اگلے زمانے کے صوفی جب نعرہ مارتے تھے تو سننے والے بے ہوش ہو جاتے تھے، آج کل کے صوفی خود ہی نعرہ مارتے ہیں اور خود ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ عتیق احمد کو مطالعے کی عادت نہیں ہے (ہم اتنے بے ادب نہیں ہیں کہ مطالعے کے تعلق سے پیدل ہونے کی بات کریں) بفرضِ محال یہ بات مان بھی لی جائے تو عتیق احمد کی یہ خدمت کیا کم ہے کہ وہ مقالے لکھ کر دوسروں کے شوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ آدمی خود نیکی نہ کرے، دوسروں کو نیکی کرنے کا موقع دے تو اُس کے اِس عمل کو بھی نیکیوں میں شمار کیا جائے گا۔

عتیق احمد سے ہمیں ذاتی نیاز مندی کا شرف حاصل ہے اور اُن کے صاحب مطالعہ ہونے کے ہم چشم دید بلکہ بچشمِ گریاں گواہ ہیں۔ جن دنوں فضیل جعفری کی کتاب "زخم اور کمان" شائع ہوئی تھی تو ہم نے اُس پر ایک کالم لکھا تھا۔ یہ کالم پڑھ کر عتیق صاحب ہم سے ملے اور کہنے لگے: "فضیل جعفری کی یہ کتاب صد فی صد سرقہ ہے۔ اِس عزیز نے ایڈمنڈ ولسن کی THE WOUND AND THE BOW کا ترجمہ کر دیا ہے"۔ ہم نے عرض کیا کہ دونوں کتابوں میں صرف نام کی حد تک مماثلت ہے، مواد بالکل مختلف ہے۔ کہنے لگے: "جب نام ہی سے سرقہ ظاہر ہے تو کتاب کے اندر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے"۔ ہم نے مشورہ دیا کہ آپ دونوں کتابیں پڑھنے کے بعد کوئی فیصلہ کیجیے۔ فرمایا: "کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے دونوں کتابوں کے نام پڑھ لینا ہی کافی ہے"۔

فضیل جعفری نے عتیق احمد پر بزدلی اور منافقت ہی کے الزام نہیں لگائے، بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ: "عتیق احمد کا پورا مضمون بہتان نویسی، کذب وافترا کی نمایش، دوسروں کی شہرت کی ہجو اور اپنی گم نامی کے نوحے وغیرہ کا خمیرۂ زورِ زبان بن کر رہ گیا ہے"۔ قطع نظر اِس سے کہ 'خمیرۂ زورِ زبان' کی ترکیب نہایت خوب صورت ہے، فضیل جعفری نے عتیق احمد سے بڑی زیادتی کی ہے۔ صرف ایک مضمون پڑھ کر اتنا مشتعل ہونا شدید جذباتیت کی دلیل ہے۔ ہمیں دیکھیے کہ ہم گزشتہ ربع صدی سے عتیق احمد کے تنقیدی مقالے پڑھ رہے ہیں، ہمیں کبھی مشتعل ہونے کی تو کیا، مسکرانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

(۲۳/ اپریل ۱۹۸۷ء)

ورودِ نامسعود

آپ بیتی ایک عجیب و غریب صنفِ ادب ہے جس کا موضوع بظاہر تو لکھنے والے کی اپنی ذات ہوتی ہے، لیکن بحث عموماً دوسروں کے اعمال و کردار سے کی جاتی ہے۔ لکھنے والے کو اجازت ہوتی ہے کہ ہر اُس بات کو پھیلا کر بیان کرے جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہ ہو اور ہر اُس بات کو نظر انداز کر دے جس سے اصل موضوع پر روشنی پڑنے کا امکان ہو۔ آپ بیتی اس لیے نہیں لکھی جاتی کہ لکھنے والے کو کچھ کہنا ہوتا ہے بلکہ اس لیے لکھی جاتی ہے کہ لکھنے والا بہت کچھ چھپانا چاہتا ہے اور بہت سے حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

آپ بیتی لکھنے والے اپنا ذکر ایسی عقیدت و محبت سے کرتے ہیں جیسے وہ اپنے حالات نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ کسی خوش اعمال بزرگ اور محترم ہستی کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے اپنے شجرۂ نسب میں تبدیلی سے لے کر ہر قسم کے واقعات میں رنگ آمیزی کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں سچائی کا دعویٰ خود سچائی کا نعم البدل بن جاتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے، اس کے لیے کسی دستاویزی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس کی ذاتِ فیض رساں ہی تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ خود اعتمادی بالآخر بہت سی خرابیوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جن میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لکھنے والے کے بجائے پڑھنے والے شرمندہ ہوتے ہیں۔

آپ بیتی کو یادوں اور یادداشتوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ لیکن آپ بیتی میں یادوں اور یادداشتوں کی ترمیم شدہ یا حسبِ منشا صورت ہی نظر آتی ہے۔ حافظہ اول تو کام نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو مصنف کی مرضی کے مطابق مواد فراہم کرتا ہے، اسی لیے آپ بیتیوں میں بہت سے ایسے واقعات

بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کے وقوع پذیر ہونے کا امکان ماضی میں تو کیا، مستقبل میں بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے ایک کرم فرما نے آپ بیتی لکھی اور اُس کا مسودہ ہمیں پڑھنے کے لیے دیا تاکہ ہم اُس کا نام تجویز کر دیں۔ ہم نے اس مسودے کو پڑھا تو اُس میں ایسے بہت سے واقعات جن کے ہم عینی شاہد تھے، اصل سے مختلف صورت میں نظر آئے۔ اس بنا پر ہم نے آپ بیتی کا نام "حافظہ نباشد" تجویز کیا تو ہمارے کرم فرما ہم سے ناراض ہو گئے۔

ان سب باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو میں اچھی آپ بیتیاں نہیں لکھی گئیں۔ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی کا نام اِس وقت ذہن میں آرہا ہے جس میں خواجہ صاحب نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو کوئی دوسرا اپنے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مثلاً انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ خود پسند ہیں اور اِس حد تک کہ کسی دوسرے کی جائز تعریف بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ خوشامد اُن کا دل خوش کر دیتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ خوشامد بُری چیز ہے، خوشامدیوں کو وہ اپنے گرد و پیش دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ خلافِ ضمیر کام کرنے پر بھی ان کی طبیعت ہمیشہ آمادہ رہتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو سنگ دل بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں بیوی مرگئی، دو بیٹے مرگئے، ایک بیٹی مرگئی لیکن میرے دل پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔

اردو میں ایسی آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں جن پر "حافظہ نباشد" کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان میں بے شمار سچے واقعات ملتے ہیں لیکن یہ ایسے واقعات ہیں جن کا بیان نہ کرنا بیان کرنے سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اردو کے ممتاز نقاد کلیم الدین احمد کی آپ بیتی ہے جس کا نام اگرچہ "اپنی تلاش میں" ہے لیکن دراصل یہ اُن کی گمشدگی کا اعلان نامہ ہے۔ انھوں نے صفحوں کے صفحے سیاہ کر دیے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ بے شمار، بے مزہ واقعات لکھے ہیں جن میں اپنی تصانیف کی کتابت و طباعت سے لے کر جلد سازی تک کی تفصیلات بیان کر دی ہیں۔

اور اب اردو میں ایک ایسی آپ بیتی بھی شائع ہو گئی ہے جسے بلاشبہہ اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مصنف ہیں مشہور ماہرِ لسانیات، محقق، نقاد اور شاعر ڈاکٹر مسعود حسین خان اور آپ بیتی کا نام ہے "ورودِ مسعود"۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اُسے "نامسعود" قرار دیں گے کیوں کہ اِس میں اُن کا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان ہمارے اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جن کے علمی کام اردو زبان کا سرمایہ

افتخار ہیں۔ ہم نے ان کی تقریباً سبھی کتابیں پڑھی ہیں' حالاں کہ اِس قدر خشک ہیں کہ اُن کو پڑھنا تو کیا دور سے دیکھنا بھی عام قاری کی صحت کو متاثر کر سکتا ہے۔ ہمیں چوں کہ اپنی صحت کی زیادہ فکر نہیں ہے' اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے استفادہ کرنے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی' البتہ ہم نے ہر کتاب قسطوں میں پڑھی ہے۔ دو چار صفحے پڑھے اور پھر دو چار دن آرام کیا' لیکن آرام کے یہ دن بھی بے آرامی میں گزرتے تھے کیوں کہ مزید دو چار صفحے پڑھنے کا خوف ذہن پر طاری رہتا تھا۔ بہرحال ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ ہم نے ان کی کتابوں کے مطالعے سے خوف اور بے آرامی کے علاوہ علم بھی حاصل کیا۔ گو یہ علم اب تک ہماری کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہوا لیکن یہ فخر کیا کم ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کے خوانِ علم کے ریزہ چیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی ہیبت ہم پر ایسی طاری ہوئی کہ اُن کے مجموعۂ کلام "دونیم" کو بھی ہم نے لسانیات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھا۔ "دونیم" کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے قدیم اردو کے بعض متون مرتب کیے ہیں' اسی طرح جدید اردو کا بھی ایک متن اپنے مجموعۂ کلام کی صورت میں مرتب کر کے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ متون جدید ہوں یا قدیم' لسانی نقطہ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اُنھیں اِسی نقطۂ نظر سے پڑھنا بھی چاہیے۔

ہم نے "ورودِ مسعود" کو اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں اس لیے شمار کیا ہے کہ اس کے دامن میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو آپ بیتی کے دائرے میں نہ آتی ہو۔ عام آپ بیتی نگاروں کی طرح انھوں نے اپنے موضوع سے کہیں انحراف نہیں کیا اور اپنے تجربات و مشاہدات کے بیان سے کام رکھا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے اپنے لسانیات کے علم اور اپنی شاعری سے کتاب کو گراں بار بنانے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس طرح یہ کتاب آپ بیتی کی بجائے لسانی بحثوں کی کھتونی بننے سے بال بال بچ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنا تقریباً تین چوتھائی کلام مختلف مقامات پر درج کیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں نہ سہی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب واقعات کو خوش اسلوبی سے اور دل کش پیرائے میں بیان کرنے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں۔ حالاں کہ اہلِ تحقیق سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اہلِ تحقیق دلچسپ واقعات کو بھی غیر دلچسپ انداز میں بیان کرنے کو اپنی علمیت کے

اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ "ورودِ مسعود" کا خوب صورت پیرایۂ بیان قاری کو اِس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کتاب کو شروع کرنے اور ختم کرنے کے درمیان کوئی دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملتی کہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے' اس میں "بیان" کتنا ہے اور "آرائشِ بیان" کتنی۔ ویسے بھی بیان اور آرائشِ بیان کے فرق کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہوں اور اُن واقعات سے براہ راست آشنا ہوں جو اِس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے ہمارا تعلق غائبانہ ہے۔ ہم نے صرف اُن کی کتابیں پڑھی ہیں' ان کی ذات کو پڑھنے کا موقع بھی ایک کتاب (ورودِ مسعود) ہی کے توسط سے ملا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین اُس دودمانِ عالی شان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اراکین میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جیسے بڑے لوگ شامل ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے بتایا ہے کہ یہ دونوں "جلالی" بزرگ تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے جلال کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ملازم لڑکے کی حرکتوں پر وہ اِس قدر برہم ہوئے کہ اُسے رسی سے باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں جائداد کے معاملے میں اس قدر غصے میں آئے کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کو خط لکھا کہ اگر اُن کی بات نہ مانی گئی تو وہ راشٹرپتی بھون کے سامنے دھرنا دیں گے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اپنے ان دونوں بزرگوں کے مقابلے پر خاصے "جمالی" واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف شادی سے پہلے (اور بعد میں بھی) اپنی بیگم صاحبہ سے اپنے عشق کی داستان لکھی ہے بلکہ اپنی طالب علمی کے زمانے کا یہ دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ ایک برقع پوش طالبہ کا کئی برس تک "پرچھائیں" بن کر تعاقب کرتے رہے۔ ۳۵ برس بعد جب ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے تو اُن کو مذکورہ "طالبہ" کے انتقال کی خبر ملی۔ انھوں نے ۳۵ برس پہلے کے تعاقب کے تمام سربستہ راز اپنی بیگم کو بتا دیے اور مرحومہ طالبہ پر "پرچھائیں کی موت" کے نام سے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم زیرِ نظر آپ بیتی میں شامل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے مرحومہ کی زندگی میں اُن پر کوئی نظم نہیں لکھی' ورنہ مرحومہ کے انتقال کا سانحہ مقررہ وقت سے پہلے بھی پیش آسکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے "جمالی" پہلو سے متعلق واقعات پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے لسانیات پر تحقیق کیوں کی۔ انھیں تو جمالیات کے فلسفے پر کتابیں لکھنی چاہیے تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے بڑی بے باکی سے دوسروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مُردوں کے بارے میں تو بھی بڑی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے زندوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ جس کے متعلق جو محسوس کیا' اسے قلم بند کر دیا۔ فی الحال اس کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اپنے شاگردوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک شاگرد کے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھے صرف ایک شاگرد نے مایوس کیا ہے جو اَب دہلی کی ایک بڑی یونیورسٹی میں اردو کے درس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جب اِس یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد نے مجھ سے شکایت کی کہ مسعود صاحب' ہر چند فلاں صاحب کو اصرار ہے کہ وہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں' لیکن ان کی استعداد اور حرکات دیکھ کر یقین نہیں آتا۔ میں نے کہا وہ مستثنیات میں سے ہیں اور عرصہ ہوا ہے میں اُن سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ کہنے لگے مگر وہ تو آپ سے دست بردار نہیں ہوئے"۔

یہ تو ایک شاگرد سے دست برداری کا واقعہ تھا' ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک استادِ محترم سے بھی دست برداری کا اعلان کیا ہے۔ علی گڑھ میں اپنی تعلیمی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ایم اے کو پڑھانے کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی لیکچرر تھے لیکن اُن سے مجھے شرفِ شاگردی کبھی حاصل نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ خلوصِ جذبات یا حافظے کی فروگزاشت کی وجہ سے پاکستان میں جہاں بھی متعارف کرانے کا موقع ملتا ہے مجھے فخریہ اپنا شاگرد بتاتے ہیں"۔

ہمارے خیال میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر صدیقی کو اپنی استادی سے عاق کر کے خود اپنے ساتھ برا کیا ہے۔ عاق نامہ پڑھ کر ڈاکٹر صدیقی' شاگرد کو شاگرد کہنے سے تو باز نہیں آئیں گے' لیکن اب اُن کا احساسِ فخر' احساس ندامت میں تبدیل ہو جائے گا اور صفیر بلگرامی کی طرح وہ جب بھی ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ذکر کریں گے تو کہیں گے 'شاگرد تو وہ میرے ضرور ہیں لیکن....

صفیر بلگرامی کا قصہ یہ ہے کہ جب خواجہ سخن دہلوی (صاحبِ سروشِ سخن) ان کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تو صفیر بلگرامی اُن کا ذکر اِس طرح کیا کرتے تھے: "جب تک خواجہ سخن مجھ سے

اصلاح لیتے رہے، اچھا شعر کہتے تھے، اب تو وہ شعر نہیں کہتے، گھاس کاٹتے ہیں"۔

"ورودِ مسعود" ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ ایک فرد ہی کی نہیں، ایک پورے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ "نشیب" عموماً دوسروں کے ہیں اور "فراز" خود لکھنے والے کے۔ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا جو کچھ لکھتا ہے اپنے نقطۂ نظر سے لکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین کوئی تحقیقی کتاب تو لکھ نہیں رہے تھے جو وہ دوسروں کے نقاطِ نظر کو سامنے رکھتے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سُنا "ورودِ مسعود" اُسی کی بازیافت ہے۔ اگر کسی کو ڈاکٹر صاحب کے دیکھنے اور سُننے پر اعتراض ہو تو اُسے فرد کی آزادیِ دید و شنید میں مداخلتِ بے جا کے مترادف سمجھنا چاہیے۔

اس آپ بیتی کا مطالعہ بہت سے حوالوں سے کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اِس میں سفرنامے کا خوب صورت انداز ملتا ہے۔ شخصی خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی زندگی کے سفر کی روداد ملتی ہے۔ پرانی تہذیب کی مرقع نگاری ہے۔ تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کی داستان ہے۔ غرض کہ دنیا جہان کے قصے ہیں۔ لہٰذا جن لوگوں کو قصہ گوئی سے دلچسپی ہو وہ بھی اِس کتاب سے محظوظ ہوسکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق درس و تدریس کے شعبے سے ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری سے لے کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری تک تعلیمات کے میدان میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔ سب سے زیادہ عبرت ناک منظر انھیں جامعہ ملیہ میں نظر آیا۔ فرماتے ہیں:

"جامعہ کے استادوں میں بعض سیاہ رُو سیاہ کار بھی تھے، نہایت رکیک حرکتیں کرنے والے، رسوائے زمانہ، دوسروں کی بہو بیٹی کو بہکانے اور ہر قسم کا نشہ کرنے والے.... کسی نے فائل سے ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ غائب کرا کے اپنی تاریخِ پیدائش بدلوادی تھی۔ دو استاد ایسے ملے جو ۱۹-۱۹ سال سے پی ایچ ڈی میں نام کا اندراج کرائے ہوئے تھے اور اُن کے قلم سے تاحال چند صفحات تک برآمد نہیں ہوئے تھے۔ ایک صاحب ہائی اسکول تا ایم اے تھرڈ ڈویژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے..."

یہ ساری باتیں قابلِ مذمت ہیں لیکن پی ایچ ڈی میں نام کا اندراج کرا کے ۱۹-۱۹ سال تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں کو برا سمجھنا صریحاً ناانصافی ہے۔ آج کل پی ایچ ڈی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے' اس کو دیکھتے ہوئے وہ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں جو پی ایچ ڈی کے لیے مقالے نہیں لکھتے۔ ہماری رائے میں اب انھیں اساتذہ کو ترقی ملنی چاہیے جو پی ایچ ڈی کی تہمت سے محفوظ ہیں۔

"ورودِ مسعود" میں اردو ادب کی بعض اہم شخصیات کا ذکر نہایت دلچسپ پیرائے میں ملتا ہے۔ مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور کے بارے میں مسعود صاحب نے جو کچھ لکھا ہے' اس سے ہم جیسے دور افتادہ نیاز مندوں کے سامنے ان دونوں بزرگوں کی شخصیات کے بعض بالکل نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مسعود صاحب ان دونوں بزرگوں کے شاگرد اور بقول خود نیاز مند اور محرمِ راز بھی ہیں۔ اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے' اس کے درست ہونے میں شبہہ نہیں ہو سکتا۔ مسعود صاحب نے "موازنۂ انیس و دبیر" کی طرح "موازنۂ رشید و سرور" مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کڑھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً دل تنگ رکھتے ہیں۔ وہ ابتدا میں جس کو بڑھاتے ہیں' آخر میں اُسی سے رشک کرنے لگتے ہیں... سرور صاحب کے ہاں تواضع کرنے سے تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دستر خوان بہت کشادہ تھا۔ ان کے یہاں معقول' نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خود سدا کے حاجت مند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے"۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سرور صاحب کے غیر متواضع ہونے کا یہ ثبوت بھی پیش کیا ہے کہ ایم اے کے امتحان میں مولوی عبدالحق نے تو ڈاکٹر مسعود حسین خان کو ۱۰۰ میں سے ۸۴ نمبر دیے لیکن سرور صاحب نے صرف ۵۷ نمبروں پر ٹرخا دیا۔ سرور صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جب نمبر بڑھانے میں گرہ سے کچھ نہیں جا رہا تھا تو پھر بخل سے کام لینے کی کیا ضرورت تھی۔

مسعود صاحب نے رشید صاحب سے اپنی تمام عقیدت کے باوجود یہ بھی لکھا ہے کہ: "ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو تھا جنھوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ جب تک رشید صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اس کی ترقی و توسیع ناممکن ہے"۔

کم و بیش اسی قسم کی بات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سرور صاحب کے لیے بھی لکھی ہے:

"پتّا مار کام سرور صاحب کے بس کا کبھی نہیں رہا۔ ایک ذہین انسان ہونے کے ناتے وہ طلاقتِ لسانی اور تنقیدی اشارات و متفرقات کے مرد میدان ہیں"۔

رشید صاحب اور سرور صاحب جتنے ایک دوسرے سے قریب تھے، آخر آخر میں اتنے ہی دور ہو گئے۔ سبب یہ تھا کہ رشید صاحب اپنی ملازمت میں توسیع چاہتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی مخالفت کی وجہ سے انھیں توسیع نہیں ملی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ توسیع نہ ملنے کا سبب یہ تھا کہ ۱۹۵۸ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی عمر ۶۵ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی وائس چانسلر اس عمر کے استاد کو توسیع نہیں دے سکتا تھا۔ سرور صاحب نے مخالفت نہیں کی، صرف یہ کیا کہ خاموش رہے حالاں کہ اُن کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ رشید صاحب کی حمایت میں لب کشا ہوتے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے یہ حقائق بیان کر کے بہت اچھا کیا لیکن اور زیادہ اچھا ہوتا اگر ان حقائق کا علم رشید صاحب کو اُن کی زندگی میں ہو جاتا۔ کاش مسعود صاحب کی آپ بیتی رشید صاحب کی زندگی میں چھپ جاتی، تب سرور صاحب سے اُن کی ناراضی ختم ہو جاتی اور مسعود صاحب سے شروع ہو جاتی کیوں کہ انھوں نے رشید صاحب پر کارنا کردگی کا الزام لگایا ہے۔

اس کتاب کا سب سے سنسنی خیز حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ایک "غلطی" کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس غلطی کی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زبردست ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ہنگامے کی زد میں وائس چانسلر یعنی خود ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی آئے اور وہ جامعہ سے اس حد تک بددل ہوئے کہ واپس علی گڑھ جانے کی ٹھان لی۔ مسعود صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کو ایک نہایت ذہین انسان، طلاقتِ لسانی کا ماہر اور فعال شخصیت کا مالک کہا ہے۔ ان کے کاموں کی تعریف بھی کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے: "انھیں ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت بعض اچھے اساتذۂ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ ملیہ لایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ ایک حوصلہ مند مگر جاہ طلب انسان ہیں۔ طبیعت میں خود پسندی اور شدت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو وہ کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں۔ جب منفی ہو جاتی ہے تو جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہیں۔ تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے، اس سے انھیں غرض نہیں ہوتی۔ اپنے مقصد

کے لیے وہ ہر قسم کے ذریعے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ طلبہ تک کو"۔

ہمارے خیال میں مسعود صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ جامعہ ملیہ میں جو لوگ ڈاکٹر نارنگ کی مخالفت کر رہے تھے وہ نااہلوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے، خود کام کرتے تھے نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے تھے۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہدف پر نظر رکھنا کافی ہے، یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے۔ رہی جاہ طلبی اور خود پسندی تو یہ ایسی "خوبیاں" ہیں جو تھوڑی بہت ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ ہمیں تو آج تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو صوفیہ کی طرح ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات کی نفی کرتا رہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بتایا ہے کہ جامعہ ملیہ میں پروفیسری کے امیدوار تھے لیکن "ان کے بائیں بازو سے انتہائی شغف ..... کو جامعہ کے ماحول کے لیے مناسب نہیں پایا۔ ڈاکٹر محمد حسن ..... سخت شاکی ہوئے اور اِس کے بعد مجھے پہچاننا چھوڑ دیا۔ میں اس قسم کی آزادی اپنے دوستوں کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں دیتا۔ میرے اُن کے پرانے مراسم تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں ریڈری کی اسامی پر ان کا تقرر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بہت سے تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ میری ہی سفارش اور ذمہ داری پر کیا تھا۔ اب جو اُن کی یہ شانِ بے نیازی دیکھی تو میں بھی خدا بن بیٹھا اور میں نے ان کے وجود ہی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ میرے ردِ عمل کا شاید اثر تھا کہ عرصے بعد اُن کا ایک خط آیا جس میں کچھ شکایت اور کچھ اپنے رویّے پر شرمندگی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ راہ و رسم کا دروازہ پھر کھل جائے، لیکن اس سے زیادہ نہ کھل سکا کہ ہم سر اور ہاتھ کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے"۔

ڈاکٹر محمد حسن اپنے بارے میں جب یہ تحریر پڑھیں گے تو امید ہے راہ و رسم کا یہ نیم وا دروازہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

"ورودِ مسعود" میں دو تین جگہ ڈاکٹر گیان چند کا ذکر آیا ہے اور ہر جگہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں موصوف کو پسند نہیں کرتے۔ ڈاکٹر گیان چند کے علمی و تحقیقی کام ایسے اعلیٰ معیار کے ہیں کہ انھیں نظر انداز کر کے ذاتی ناپسندیدگی کی بنا پر اُن کا ذکر مضحکہ خیز انداز میں کرنا، ڈاکٹر مسعود حسین خاں جیسے صاحبِ علم و فضل کے شایانِ شان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسری کے امیدوار ڈاکٹر گیان چند بھی تھے اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی، انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی ڈاکٹر اعجاز

حسین اس کے ایک رکن تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین کو منتخب کر لیا گیا اور ڈاکٹر گیان چند ناکام ہوئے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "شام تک اردو کے نئے پروفیسر کے انتخاب کی خبر عام ہو گئی۔ میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے ملا تو اُنھوں نے بڑے مزے لے لے کر گیان چند صاحب کی امیدواری کا قصہ سنایا۔ کہا' جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو گا یہ الہ آباد کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اُنھوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو اُنھیں اس انتخابی کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو اچانک میرے پاس خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدر آباد تو جانا ہی ہے ایسی تاریخ دی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدر آباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدر آباد کے لیے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہم سفر تھے"۔

اس واقعے سے شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر اعجاز حسین کو "رشوت" دی لیکن اس سے زیادہ دلچسپ یہ بات ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے مذکورہ واقعہ پروفیسر سروری کے گھر پر سنایا تھا لیکن چار سطروں کے بعد لکھتے ہیں: "دو روز کے بعد علی گڑھ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اتفاق سے اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو پایا' اسی سفر میں انھوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سنایا"۔

جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے مذکورہ واقعہ پروفیسر سروری کے گھر پر سنایا تھا یا علی گڑھ جاتے ہوئے ہم سفری کے دوران' اس وقت تک ہم ڈاکٹر گیان چند کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھیں گے۔

(۲۶/ جنوری و ۲/ فروری ۱۹۸۹ء)

ہمہ صفت موصوف

ہندوستان سے آئے دن ادیب آتے رہتے ہیں جن سے مل کر اور جن کی باتیں سن کر ہم خوش ہوتے ہیں لیکن اب کے ایک ایسا ادیب آیا ہے جس کے آنے کی خبر سن کر سب پر خوف طاری ہو گیا اور مل کر ایسا محسوس ہوا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ باقر مہدی اپنی وضع کے بالکل مختلف آدمی ہیں۔ روایتی ادب اور روایتی اخلاق دونوں سے بیزار ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سوائے وارث علوی کے کوئی ان کو پڑھ کر خوش ہوتا ہے نہ مل کر۔ وہ تحریر میں شمشیرِ عریاں ہیں تو گفتگو میں تیغِ محرّف۔ نوکِ خنجر سے لکھتے ہیں تو نیزے کی انی سے بولتے ہیں۔ ہر معاملے میں اُن کی رائے دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر باقر مہدی کے سامنے اُن کی تعریف کی جائے تو وہ ایسے مدلل انداز میں تردید کرتے ہیں کہ تعریف کرنے والا شرمندہ ہو جاتا ہے اور یہ عہد کر لیتا ہے کہ وہ آیندہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

خود باقر مہدی کا سچ کس قسم کا ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک پاکستانی ادیب نے نہایت عقیدت سے ان کی خدمت میں اپنی کتاب پیش کی۔ باقر مہدی نے کتاب اور مصنّف دونوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کہا: "اس زحمت کی کیا ضرورت تھی"؟ مصنّف نے اپنی عقیدت کو مزید گاڑھا کرتے ہوئے عرض کیا: "یہ حقیر تحفہ آپ کی نذر ہے"۔ باقر مہدی نے جواب دیا: "میرے اپنے ملک میں ایسے حقیر تحفوں کی کیا کمی ہے جو میں آپ کے ملک کی کتابیں ساتھ لے جاؤں"۔

ایک ادبی ادارے کے سکتر صاحب باقر مہدی کی آمد کی خبر سن کر اُن سے ملنے گئے اور اُن کے اعزاز میں استقبالیہ دینے کی خوش خبری سنائی۔ باقر مہدی نے پوچھا: "آپ استقبالیہ کیوں دینا

چاہتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا : "آپ بہت بڑی ادبی شخصیت ہیں، ہمارے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ آپ ہمارے ادارے میں تشریف لائیں"۔ باقر مہدی نے دوسرا سوال کیا: "آپ نے میری کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں"؟ سکتر صاحب اس ٹیڑھے سوال کا جواب نہ دے پائے تو باقر مہدی نے کہا: "آپ کے استقبالیے میں میرا شرکت کرنا آپ کے لیے تو ضرور اعزاز کی بات ہوگی لیکن میرے لیے اس سے بڑی ذلّت کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ میں ایسے لوگوں کے درمیان وقت گزاروں جو ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے"۔

اس جواب سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ باقر مہدی کا نظریۂ ادب کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے اتنے مطمئن ہیں کہ کسی دوسرے کو ذرا کم ہی مانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دوسرے بھی ان کے بارے میں اسی قسم کی جارحانہ رائے رکھتے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، باقر مہدی سے لوگ لاکھ اختلاف کریں انھیں کوئی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ سب اُن سے خوف زدہ رہتے ہیں لیکن پھر بھی ادبی محفلوں میں انھیں بلاتے ہیں تاکہ گرمیِ محفل کا کوئی تو سبب ہو۔

باقر مہدی گرمیِ محفل کا سبب کس طرح بنتے ہیں؟ اس سلسلے میں ایک تازہ ترین واقعہ سن لیجے۔ پچھلے دنوں علی گڑھ میں ایک سیمینار میں باقر صاحب نے شرکت کی۔ ایک مشہور ادیب نے مقالہ پڑھا۔ صدرِ محفل نے باقر صاحب سے کہا وہ اِس مقالے کے بارے میں اپنی رائے سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔ انھوں نے اِس کے جواب میں فرمایا: "میں بہت بدقسمت آدمی ہوں کیوں کہ عموماً خراب مقالوں ہی کے بارے میں مجھ سے رائے دینے کے لیے کہا جاتا ہے"۔

باقر مہدی پچھلے دنوں کراچی تشریف لائے تو یہاں کے ادیبوں نے اُن سے "اجتماعی ملاقات" کی بہت کوشش کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ (شاید اِس لیے کہ وہ "اجتماعی ملاقات" کو اجتماعی خودکشی جیسی کوئی چیز سمجھتے ہیں) البتہ ادارۂ یادگارِ غالب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ باقر مہدی نے اسے اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازا۔ اس ادارے کے سیکریٹری نے استاد لاغر مراد آبادی کو باقر مہدی کی خدمت میں بھیجا اور یہ درخواست کی کہ کچھ دیر کے لیے غالب لائبریری میں آیئے اور مشتاقانِ دید کو اپنی ایک جھلک دکھا کر قیامت تک کے لیے ممنون احسان کیجیے۔ (گویا ان کا یہ احسان قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا)

استاد لاغر مراد آبادی نے انھیں کسی نہ کسی طرح شیشے میں اتار لیا۔ باقر صاحب نے دو شرطیں

پیش کیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کوئی تقریر نہیں کریں گے کیونکہ ان کا گلہ خراب ہے۔ دوسری یہ کہ وہ بعض لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے' لہٰذا اُن کو نہ بلایا جائے۔ ادیبوں کی دو فہرستیں تیار کی گئیں۔ ایک میں اُن کے نام تھے جنھیں بلایا نہیں جائے گا۔ دوسری فہرست اُن ادیبوں کی تھی جن کی موجودگی پر باقر مہدی کو اعتراض نہیں تھا۔ استاد لاغر مراد آبادی نے غلطی سے پہلی فہرست کے ادیبوں کو مدعو کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب لائبریری کی نشست طنز و مزاح کانفرنس بن گئی۔ چونکہ باقر صاحب نے گلے کی خرابی کی بنا پر تقریر کرنے سے معذرت کرلی تھی' اس لیے انھوں نے حاضرین کے سوالوں کے مختصر جواب مرحمت فرمانے پر اکتفا کی۔ یہ سوال و جواب کچھ اس قسم کے تھے:

س : ہندوستان کے معاصر ادب کی صورت حال کیا ہے؟

ج : اس کا جواب تو کوئی مدرّس نقاد ہی دے سکتا ہے۔

س : آپ کے اپنے تاثرات کیا ہیں؟

ج : میں اردو ادب ذرا کم پڑھتا ہوں۔ مجھے عالمی ادب اور تاریخ کی کتابوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔

س : آپ کی شناخت تو اردو ادب ہے۔

ج : صرف میری شناخت سے کام نہیں چل سکتا۔ آپ کی بھی تو کوئی شناخت ہونی چاہیے۔

س : اچھا صرف اتنا بتایئے کہ کیا آپ کو ہندوستان اور پاکستان کے ادب میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟

ج : بالکل نہیں۔ خراب کتابیں وہاں بھی چھپتی ہیں اور یہاں بھی۔ خراب لکھنے والے وہاں بھی کثرت سے ہیں اور یہاں بھی۔

افسوس کہ باقر مہدی جیسے اہم نقاد اور شاعر سے اہلِ کراچی کچھ زیادہ مستفید نہ ہوسکے۔ پیاسوں کو علم کے سمندر سے شبنم بھی نہ ملی۔

سُننے میں آیا ہے کہ باقر صاحب آج کل لاہور میں ہیں اور وہاں کی ادبی محفلوں میں صبح و شام شرکت کررہے ہیں اور چہک رہے ہیں۔ چہکنے کی وجہ یہ ہے کہ کشور ناہید اُن کی میزبان ہیں۔ گویا بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں' والا معاملہ ہے۔ کشور ناہید جہاں چاہتی ہیں انھیں لے جاتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ وہ انھیں ڈاکٹر وزیر آغا کے گھر بھی لے گئیں۔ یہ وہی ڈاکٹر وزیر آغا ہیں جن کے

خلاف وارث علوی کا مقالہ باقر مہدی نے اپنے رسالے "اظہار" میں بڑے اہتمام سے چھاپا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وسیع القلبی قابلِ ستایش ہے کہ انھوں نے باقر مہدی کی خوب آؤ بھگت کی اور شہر کے تمام نامور ادیبوں کو بلا کر اِس طرح دار ادیب کی زیارت کرائی۔ موصوف بہت خوش تھے۔ اُن کے گلے کی خرابی دور ہو چکی تھی۔ وہ تقریر کرنے کے تو کیا گانے کے موڈ میں بھی نظر آتے تھے۔ اس محفل میں ڈاکٹر انور سدید بھی موجود تھے جو وارث علوی کے مقالے کا جواب لکھ چکے ہیں۔ کسی نے ڈاکٹر انور سدید سے کہا: "جس شخص نے ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف مقالہ لکھوایا اور اپنے رسالے میں چھاپا' وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہی کے گھر میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بیٹھا ہے اور آپ کو اِس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ آپ اس کی باتیں نہایت دلچسپی سے سن رہے ہیں اور ہمہ تن گوش بیٹھے ہیں"۔ ڈاکٹر انور سدید نے جواب دیا: "میں ہمہ تن گوش نہیں پنبہ در گوش ہوں"۔

باقر مہدی سے ہمارا تعارف مشہور شاعر معین احسن جذبی کے ذریعے ہوا تھا۔ جذبی کا ایک خط بنام باقر مہدی "نقوش" کے مکاتیب نمبر میں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے کچھ اِس قسم کی باتیں لکھی تھیں: "آپ کی سیاست کا علم آپ کے جانے کے بعد ہوا.... اپنے گریبان میں منھ ڈال کر سوچیے کہ آپ کا رویہ میری جانب کہاں تک ایمان دارانہ ہے۔ مخالفت وہی اچھی ہے جو کسی اصول پر مبنی ہو.... آپ میرے طالب علم ہیں.... آپ شاعر اور ادیب بننا چاہتے ہیں اور شہرت کے بھی طلب گار ہیں لیکن شاعر اور ادیب بننے سے پہلے آپ کو ایک اچھا انسان بننا پڑے گا... رسالوں میں نظم یا تصویر کا چھپ جانا اِس امر کی دلیل نہیں کہ آپ اچھے ادیب بھی ہیں... آپ میرے چکر میں نہ پڑیے اور مجھے اپنے لیے ایک مسئلہ نہ بنائیے۔ اس سے آپ کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ آپ کے تبرے سے میرا کیا بگڑے گا لیکن خود آپ کا بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ خود آپ کی شخصیت میں بعض ایسی چیزیں پیدا ہو جائیں گی جن کی وجہ سے آپ میں نظر کی بلندی پیدا ہو سکے گی نہ کشادہ دلی....."۔

خط خاصا طویل ہے ہم نے صرف چند جملے نقل کیے ہیں۔ یہ اچھا خاصا نصیحت نامہ ہے۔ جذبی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے پرانے زمانے کے لوگ اِس قسم کی باتیں لکھنے کے عادی ہیں۔ جب یہ خط چھپا تھا تو ہم نے پڑھ کر اِس کی داد جذبی صاحب کو نہیں' باقر مہدی کو دی تھی کہ وہی اِس ادب

پارے کی تخلیق کا سبب تھے۔ ہم نے باقر مہدی کو اس جرأت پر بھی داد دی تھی کہ انھوں نے اپنے خلاف ایسی ہوش رُبا دستاویز چھپوا دی۔ مگر برسوں بعد معلوم ہوا کہ اِس کی اشاعت کا تعلق باقر مہدی کی جرأت مندی سے نہیں، خلیل الرحمان اعظمی کی جرأتِ رندانہ سے تھا۔ ہوا یوں کہ ایک زمانے میں باقر مہدی اور خلیل الرحمان اعظمی میں گہری دوستی تھی۔ باقر نے یہ خط اعظمی کو پڑھنے کے لیے دیا۔ جب دوستی کے گہرے سائے کم ہوئے تو اعظمی نے یہ خط "نقوش" میں چھپوا دیا۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ اتنی قیمتی دستاویز کہیں ضائع نہ ہو جائے، لہٰذا اِسے آیندہ نسلوں کی ذہنی تربیت کے لیے محفوظ کر دینا ضروری ہے۔ اس خط کی اشاعت سے باقر مہدی کو بہت قلق ہوا جس کا اظہار انھوں نے اعظمی کے انتقال کے بعد ایک مضمون میں کیا اور یہ لکھا: "(اس) خط کی اشاعت کے اِس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ خلیل مجھے رسوا اور ذلیل کرنا چاہتے تھے، مگر مجھے اب جا کے معلوم ہوا کہ دوستی کی طرح دشمنی بھی اہم اور ضروری ہے"۔ (تنقیدی کشمکش، ص ۲۴۲)

یہ سارا قصہ ہم نے اس لیے سنایا ہے کہ باقر مہدی کا یہ نظریہ سامنے آجائے کہ وہ دوستی کی طرح دشمنی کو بھی بہت اہم اور ضروری سمجھتے ہیں۔ دوستی کا ذکر تو محض آرایشِ بیان کے لیے ہے، البتہ دوسرا کام ہی موصوف کے نزدیک اصل کام ہے۔ انھوں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے: "میں دو تین آدمیوں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا"۔ (تنقیدی کشمکش، ص ۱۶۵) یہ صحیح ہے کہ باقر مہدی زیادہ تر لوگوں کو ناخوش رکھتے ہیں لیکن یہ درست نہیں کہ وہ دو تین آدمیوں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتے۔ ہم کم از کم تین ایسے آدمیوں کو جانتے ہیں جنھیں باقر مہدی نے ہمیشہ خوش رکھا ہے۔ اُن میں سرِفہرست تو باقر مہدی خود ہیں، حُسنِ اتفاق سے باقی دو افراد کا نام بھی باقر مہدی ہی ہے۔

باقر مہدی نے اپنی کتاب "تنقیدی کشمکش" میں جہاں دوسروں کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں لکھی ہیں وہاں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ مثلاً یہ کہ اُن میں "مسخرے پن" کا ہنر ہے۔ (ص ۲۲۲) معلوم نہیں یہ بات انھوں نے کس بنا پر لکھی ہے۔ اُن کی تنقید اور شاعری سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ شاعری سے تو اِس کی بھی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ شاعری ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی انھیں "فالتو آدمی" کہتے تھے۔ (ص ۲۲۸) اور علی سردار جعفری سی آئی اے کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ (ص ۲۲۹) یہ باقر مہدی ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ دوسروں کے حوالے سے بھی اپنے آپ کو رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ شاید اسی حوصلے نے ان سے یہ شعر کہلوایا :

بس میرا ذکر آتے ہی محفل اجڑ گئی
شیطاں کے بعد دوسری شہرت ملی مجھے

شعر کی بات چلی ہے تو وہ مشہور شعر بھی سنا دینے میں کوئی حرج نہیں جو راجہ مہدی علی خاں کی ایک نظم میں ملتا ہے۔ اس نظم میں بیوی' اپنے شوہر کے سامنے شکایتیں پیش کرتے ہوئے کہتی ہے:

میں تنگ آئی تری بدعہدیوں سے
ان آئے دن کی باقر مہدیوں سے

گویا باقر مہدی ایک فرد کا نام نہیں' ایک صفت کی علامت ہے۔ باقر مہدی واقعی ہمہ صفت موصوف ہیں۔

اس کالم کے شروع میں ہم نے عرض کیا تھا کہ باقر مہدی سے مل کر یا اُن کو پڑھ کر وارث علوی کے سوا کوئی خوش نہیں ہوتا۔ بہتر ہو گا کہ کالم کے اختتام پر اس ابہام کی توضیح پیش کر دی جائے۔ وارث علوی کی خوشی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ باقر مہدی کے حوالے سے بات بنائی یا بگاڑی ہے اور باقر کی شاعری پر تو ایک طویل مقالہ لکھا ہے جب کہ کسی دوسرے نقاد نے باقر کی شاعری پر لکھنے کی تو کیا' اس شاعری کو پڑھنے کی بھی جسارت نہیں کی۔ باقر مہدی اور اُن کی شاعری کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود وارث علوی اپنے ممدوح کو باغی شاعر نہیں مانتے بلکہ جھگڑالو شاعر سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "باقر کا شعری کردار باغیانہ نہیں محض جھگڑالو ہے۔ باغی کو بغاوت کے لیے قدروں کی ضرورت پڑتی ہے جب کہ جھگڑالو آدمی کو جھگڑے کے لیے اسباب کی۔ یہ ضروری نہیں کہ اسباب موزوں اور مناسب ہوں' جھگڑے کے لیے کوئی بھی سبب ہو کام آتا ہے"۔

یہ تو سُنا تھا کہ باقر مہدی روز مرّہ زندگی میں جھگڑالو قسم کے آدمی ہیں' اب معلوم ہوا کہ شاعری میں بھی اُن کا یہی شغل اور شوق ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو باقر کی شاعری' صحیح معنوں میں ان کی زندگی کی عکاس ہے۔

(۲۸/ دسمبر ۱۹۸۹ء)

تنقید یا تخریب کاری

کسی مجبوری کی بنا پر شاعر کہلانے والے تو خیر نثری نظم بھی لکھ لیتے ہیں لیکن حقیقی شاعروں کے لیے نثر لکھنا خاصا دشوار کام ہے۔ نظم طباطبائی نے اپنی کسی کتاب میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ کلکتے میں تھے، وہاں کے ایک انگریز صاحب بہادر نے کچھ شاعروں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ آپ لوگ اردو کی ایک ایسی گرامر لکھ دیں جو عام لوگوں کے کام آسکے۔ ان شاعروں نے آپس میں مشورہ کر کے صاحب بہادر کو جواب دیا : "ہم یہ کام نہایت خوش دلی سے کر دیں گے بہ شرطے کہ گرامر کی کتاب منظوم ہو"۔ صاحب بہادر کو اِس جواب پر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے پوچھا: "کتاب نثر میں کیوں نہ ہو"؟ جواب ملا: "نظم لکھنا ہمارے لیے آسان ہے کہ زندگی بھر اسی کی مشق کی ہے۔ نثر لکھنا ایک بالکل مختلف کام ہے جو ہم لوگوں کے بس کا نہیں"۔

شاعروں کے لیے نثر لکھنا واقعی مشکل کام ہے۔ بس ایک غالب ہیں جو نظم و نثر دونوں پر قادر ہیں ورنہ باقی تو خدا جانے کیا لکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے خطوط پڑھ جایئے، یقین ہی نہیں آتا کہ "مسجد قرطبہ" کا خالق ایسی روکھی پھیکی نثر بھی لکھ سکتا ہے۔ جوش صاحب کی شاعری میں جو الفاظ دل میں گھر کر لیتے ہیں، ان کی نثر میں وہی الفاظ قاری کے سر سے پتھروں کی طرح ٹکراتے ہیں۔ فیض صاحب کا تقریباً ہر مصرع زباں زدِ خاص و عام ہے لیکن نثر کا ایک جملہ بھی انھوں نے ایسا نہیں لکھا جو اُن کے کسی خراب سے خراب شعر کی طرح یاد رہ جائے۔

آج کے دور میں خوش قسمتی سے کئی ایسے شاعر ہمارے درمیان موجود ہیں جو اچھی نثر لکھ لیتے ہیں۔ مثلاً شان الحق حقی، جمیل الدین عالی، ندا فاضلی، کشور ناہید، قمر جمیل۔ لیکن ساقی فاروقی کی بات ہی اور ہے۔ باقی لوگ تو شرافت کے دائرے میں رہتے ہوئے لکھتے ہیں، ساقی فاروقی اس

دائرے سے باہر نکل کر بھی کام کی باتیں کر جاتے ہیں۔ شرافت کی بات اس لیے درمیان میں آئی کہ ساقی فاروقی کی لغت میں لحاظ و مروت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ بے باکی بلکہ سفاکی کی حد تک صاف گو ہیں۔ واضح رہے کہ صاف گو، حق گو کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ صاف گو سے مراد وہ شخص ہے جو بغیر کسی مصلحت کے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سچ بھی بولے۔

آج ساقی فاروقی اس لیے یاد آئے کہ ان کے نثری مضامین کا مجموعہ "بازگشت و بازیافت" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں چند تنقیدی مضامین و مراسلات ہیں اور دو شخصی خاکے۔ یہ مجموعہ عام تنقیدی مجموعوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں روایتی تنقید والی کوئی بات نہیں۔ ساقی کو جہاں کوئی اچھی بات نظر آتی ہے، دل کھول کر اس کی داد دیتے ہیں، اور جہاں کوئی برائی دکھائی دیتی ہے، اس کی مذمت بھی کشادہ دلی سے کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ساقی کے اچھائی اور برائی کے معیار بالکل ذاتی ہیں۔ ان معیاروں کو آپ رد کر سکتے ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ساقی کے خود ساختہ معیاروں کی بنیاد وسیع مطالعے پر ہے۔ (واضح رہے کہ ہم نے مطالعے کے لیے "وسیع" کا لفظ استعمال کیا ہے "عمیق" کا نہیں۔) ساقی کا محبوب موضوع اردو کی جدید شاعری ہے جس کے مطالعے میں انھوں نے ایک عمر صرف کی ہے۔ یہی عمر کسی بہتر کام میں بھی صرف کی جا سکتی تھی لیکن اس صورت میں زیر نظر کتاب وجود میں نہ آتی۔

ساقی کے محبوب شاعر تین ہیں۔ فیض، میراجی اور راشد۔ فیض کو وہ اہم شاعر مانتے ہیں لیکن بڑا شاعر نہیں۔ میراجی ان کے نزدیک موضوعات اور نئے مواد کی فراہمی کے معاملے میں فیض سے بڑے شاعر ہیں۔ راشد کو وہ سب سے بڑا ترقی پسند شاعر قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دیتے ہیں کہ "میں ترقی پسندی کو اس کے اصلی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس کا سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری والی ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں"۔

لیکن صحیح معنوں میں ساقی کے محبوب شاعر سردار جعفری اور احمد فراز ہیں۔ ان دونوں کے ذکر میں انھیں بڑا لطف آتا ہے۔ گفتگو کسی بھی موضوع پر ہو، تان انھیں دونوں پر ٹوٹتی ہے، اور کبھی کبھی تو قلم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً زہرا نگاہ کے مجموعۂ کلام "شام کا پہلا تارا" کے فلیپ پر سردار جعفری کی جو رائے درج ہے اسے دیکھ کر ساقی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "گرد پوش

پر سردار جعفری کی رومانی، مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعر سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لیے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لیے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نثر ان کی شاعری کی طرح بے اعتبار ہے"۔

ہمارے خیال میں اتنا قصور سردار جعفری کا نہیں جتنا پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کا ہے، جو اچھی شاعرات ہونے کے باوجود سردار جعفری سے سند حاصل کرنا ضروری سمجھتی ہیں۔ ساقی نے عمر بھر میں دو تین فلیپ ہی لکھے ہیں، اس لیے وہ ان لوگوں کی مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے جنھیں ایک سال میں دو دو درجن کتابوں پر فلیپ لکھنے پڑتے ہیں۔

بیچارے احمد فراز کے ساتھ تو ساقی کا رویہ خاصا سخت ہے۔ فیض کی وفات کے بعد جب سید سبط حسن سے کسی نے پوچھا تھا کہ اب شاعری مین فیض کی جگہ کون لے گا تو انھوں نے جواب میں احمد فراز اور حبیب جالب کے نام لینے کے بعد دبے لفظوں میں یہ بھی کہا تھا کہ "قاسمی بھی ہیں"۔ اس پر ساقی خاصے چراغ پا نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "آخر سبط حسن کو ایسا کون سا دکھ احمد ندیم قاسمی نے پہنچایا تھا کہ دو ڈیم فول اور جونیر شاعروں کے نام کے بعد 'قاسمی بھی ہیں' کی ریوڑی بانٹی"۔ یہی سوال ہم ساقی سے کریں گے کہ آخر انھیں فراز اور جالب جیسے وضع دار اور طرح دار شاعروں سے ایسا کون سا دکھ پہنچا تھا جو انھیں "ڈیم فول" کے مشترکہ تخلص سے نوازا؟

معزز ہم عصروں کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا اخلاق اور شائستگی کے منافی ہے۔ دو ہم عصروں یا قریب العہد شاعروں کے لیے مشترک تخلص تجویز کرنا اس سے بھی بڑی غیرذمہ دارانہ حرکت ہے۔ یکساں تخلص کی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال اور اقبال صفی پوری کے ہم تخلص ہونے کی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصور پاکستان اقبال صفی پوری نے پیش کیا تھا اور علامہ اقبال سیالکوٹ میں نہیں صفی پور میں پیدا ہوئے تھے۔

احمد فراز سے ساقی فاروقی کچھ زیادہ ہی ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ساقی نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں فراز نے اپنی نظموں کے انگریزی تراجم فیض صاحب کو نظر ثانی کے لیے دیے اور ساقی فاروقی کی موجودگی میں ان سے پوچھا کہ یہ ترجمے آپ نے دیکھ لیے کہ نہیں۔ ساقی کو چہکنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے فیض صاحب سے کہا: "ترجمے میں اچھے شاعروں کی سبکی ہوتی ہے اور برے شاعر بہتر ہو جاتے ہیں۔ اب اس بیچارے فراز کو لیجے۔ ادھر

آپ نے ایک بار لاہور میں 'مقتل' لکھا' اُدھر اس نے پشاور سے تیس 'مقتل' بھیجے۔ اِدھر آپ نے ایک "جاناں" لکھا' اُدھر اس نے جاناں جاناں کا ورد شروع کر دیا۔ اِدھر آپ نے ایک صلیب اٹھائی' یہ برادر پورا درخت کاٹ کر چل نکلا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب آپ ہی کی طرح اٹک اٹک کر مشاعروں میں شعر بھی پڑھنے لگا ہے' آپ ہی کی طرح سگریٹ پیتا ہے بلکہ راکھ بھی آپ ہی کے انداز میں جھاڑتا ہے"۔

ظاہر ہے یہ باتیں فراز ہی کو نہیں' فیض صاحب کو بھی ناگوار گزریں۔ دوسرے روز انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کا بدلہ لے لیا۔ ہوا یہ کہ زہرا نگاہ کے ہاں دعوت تھی' کھانے کے بعد میزبان نے ساقی سے کہا کہ فراز کو اس کے گھر چھوڑ دیجے۔ ساقی نے جواب دیا: "میں انھیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھا سکتا کہ جوں ہی کوئی خراب شاعر بیٹھتا ہے' گاڑی کا ایک پہیہ ہلنے لگتا ہے"۔ فیض صاحب نے کہا: "تمھارے بیٹھنے سے تمھاری گاڑی کے دو پہیے تو مستقل ہلتے ہوں گے"۔

فیض صاحب زندہ ہوتے تو وہ دیکھ لیتے کہ اب ساقی کی گاڑی کے چاروں پہیے مستقل ہلتے ہیں کیوں کہ زیرِ نظر کتاب کی اشاعت کے بعد اُن کا شمار نقادوں میں بھی ہونے لگا ہے۔

اس مجموعے میں دو شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔ ایک فیض کا دوسرا راشد کا۔ راشد والا خاکہ تو "نیا دور" کے راشد نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ البتہ فیض کا خاکہ نیا ہے اور پہلی مرتبہ اسی کتاب کے ذریعے منظرِ عام پر آیا ہے۔ فیض کی شخصیت پر درجنوں مضامین لکھے گئے ہیں لیکن ایسا دلچسپ خاکہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ساقی نے اپنے مشاہدات کو نہایت بے باکی سے قلم بند کیا ہے۔ صرف ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ ساقی نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے پوچھا' یہ جو آپ بھری محفلوں میں خواتین کے ساتھ خاص قسم کی بے تکلفی کا اظہار کرتے ہیں' اس کا جواز کیا ہے۔ فیض صاحب نے فرمایا کہ وہ اس طرح دل اور نظر کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد کا قصہ خود ساقی کی زبان سے سُنیے: "۱۴/ ستمبر ۱۹۸۳ء کی تاریخ دل پر نقش ہے۔ وہ میرے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ حکم دیا کہ میں انھیں اپنے گھر کا ایک ایک کمرہ دکھاؤں۔ میں نے یہ کام اپنی بیوی... کے حوالے کر دیا۔ نیچے اوپر ہر جگہ گئے.... سلیقے کی کھل کر تعریف کرتے گئے... بوسے نچھاور کرتے رہے۔ دل کا حق اور نظر کا حق ادا کرتے رہے"۔

ساقی نے ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ جس کا عنوان ہے "ایک

ندیم کی مدافعت میں"۔ یہ مضمون بھی پہلی مرتبہ اسی کتاب میں شائع ہوا ہے۔ ساقی نے قاسمی صاحب کے ادبی مقام اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا کچھ اندازہ مضمون کے عنوان ہی سے ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں ساقی کو ندیم صاحب کی مدافعت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور پھر مدافعت بھی ایسی جس کا نتیجہ جارحیت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ندیم صاحب کی شاعری پر ساقی نے اس انداز سے اظہار خیال کیا ہے جیسے وہ رحم کھا کر لکھ رہے ہوں' حالانکہ دوسروں کی شاعری پر وہ عموماً تاؤ کھا کر لکھتے ہیں۔

ساقی نے ڈاکٹر وزیر آغا اور قاسمی صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ وہ آپس میں صلح کرلیں۔ حیرت ہے کہ ساقی خود تو دنیا بھر سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور دوسروں کو صلح جوئی کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ویسے بھی بزرگوں کے جھگڑے میں خُردوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اس قسم کے معاملات میں خُردوں کا رویہ وہی ہونا چاہیے جس کی مثال طفیل احمد جمالی مرحوم ۲۸ برس پہلے پیش کرچکے ہیں۔ جس زمانے میں مصطفےٰ زیدی نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر تھے' انھوں نے یوم بابائے اردو میں جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ان دونوں بزرگوں میں معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو نواب شاہ لے جانے کی ذمہ داری طفیل احمد جمالی کی تھی۔ انھوں نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری گاڑی سے شاہد صاحب کے ساتھ خود نواب شاہ جا پہنچے۔ مصطفےٰ زیدی نے جمالی سے کہا : "آپ سب لوگ ایک ہی گاڑی سے آجاتے تو اچھا تھا' مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن نہ آنا پڑتا"۔ جمالی نے جواب دیا: "آپ کو معلوم ہے کہ جوش صاحب اور شاہد صاحب کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔ دونوں کا ایک ساتھ سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر راستے میں دونوں میں صلح ہو جاتی تو کون ذمہ دار ہوتا"؟

پس نوشت : یہ کالم لکھا جا چکا تھا کہ یہ اطلاع ملی۔ کشور ناہید لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے ہوائی سفر کے دوران ساقی کی کتاب کا مطالعہ کرتی رہیں اور قہقہے لگاتی رہیں۔ ان کے ساتھ جو مسافر بیٹھا تھا' قہقہوں سے اس کی نیند میں خلل واقع ہوا تو اُس نے کشور سے کہا: "محترمہ لطیفوں کی کتابیں گھر میں بیٹھ کر پڑھی جاتی ہیں' گھر سے باہر نہیں"۔

(۲۰/ اگست ۱۹۸۷ء)

ڈبویا اُن کو ہونے نے

بھارتی شاعر ندا فاضلی یہاں آ کے واپس بھی چلے گئے لیکن کراچی کے اخبارات میں ان کا ذکر اس تسلسل و تواتر کے ساتھ ہو رہا ہے جیسے جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کے بعد بھارت کی دوسری اہم شخصیت وہی ہیں۔ پچھلے ہفتے "حریت" میں اور اس ہفتے "جسارت" میں ان کے انٹرویو چھپے ہیں۔ حریت والے انٹرویو سے متاثر ہو کر سرشار صدیقی صاحب نے ایک کالم لکھا ہے اور محسن بھوپالی صاحب نے ایک تصویر چھپوائی ہے جس میں وہ اور بعض دوسرے شاعر ندا فاضلی کے ساتھ اس طرح کھڑے ہیں جس طرح لوگ بس میں چڑھنے کے لیے قطار میں کھڑے ہوتے ہیں۔

سرشار صدیقی صاحب کو شکایت ہے کہ اپنے انٹرویو میں ندا فاضلی نے اپنی شخصیت کے جھنڈے گاڑنے والا چھوٹا کام ہی نہیں کیا' بلکہ اپنے پاکستانی معاصرین کے تخلیقی عمل پر اظہار خیال کرتے ہوئے غیر ذمہ دارانہ رویہ بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً فیض کے شعر:

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

کے بارے میں کہا ہے کہ: "اس شعر میں سوائے لب و لہجہ کی روایاتی غنائیت کے اور کیا ہے' ذرا اِس کی انگریزی کر کے دیکھیں تو میری بات واضح ہو جائے گی"۔

ہمیں تو ندا فاضلی کی اس رائے میں فیض صاحب کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ رویہ نظر نہیں آیا۔ فیض کے ہاں بہت سے ایسے شعر ملتے ہیں کہ انھیں انگریزی میں تو کیا' اردو نثر میں بھی منتقل کر دیا جائے تو صورت حال بہتر ہو جاتی ہے۔ یعنی تعقید اور سکتے وغیرہ کے عیوب دور ہو جاتے ہیں۔

ہاں سرشار صاحب نے ندا فاضلی کے بارے میں شخصیت کے جھنڈے گاڑنے والی جو بات

لکھی ہے' اس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ ندا صاحب کا انٹرویو لینے والے نے جھنڈے گاڑنے کا منظر اس طرح بیان کیا ہے: "میں جب ان کے گھر ناظم آباد گیا تو تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کیا۔ چند لمحوں کے بعد ندا فاضلی ہاتھ میں ٹوتھ برش لیے سفید اونچا کرتا اور رنگین تہمد پہنے کمرے میں داخل ہوئے"۔

اگر کوئی پوچھے کہ جدیدیت کے علم بردار شاعر کے ہاتھ میں قلم کے بجائے ٹوتھ برش کیوں ہے تو اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے شعر:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

ٹوتھ برش ہی سے لکھے جاسکتے ہیں۔

ندا فاضلی نے اپنے حالات زندگی جس پیرائے میں بیان کیے ہیں' اس سے بھی موصوف کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: "دہلی میونسپل کارپوریشن کے پرانے ریکارڈ کے مطابق میں ۱۹۳۹ء میں ۔ اس گھرانے میں زبردستی داخل ہوا جہاں مجھ سے پہلے مجھ جیسے تین اور افراد گھر کی اقتصادی گنجایشوں کو استعمال کر رہے تھے۔ مجھے نہیں ہونا تھا مگر میں ہوا۔ اب ہونے کے بعد غالب کے ایک مصرعے کا ٹکڑا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ اکثر ذہن میں رہتا ہے"۔

فاضلی صاحب کو تحقیق سے خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے سالِ پیدائش کے لیے دہلی میونسپل کارپوریشن کے پرانے ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے حالاں کہ لوگ ان کے بیان پر کسی حوالے کے بغیر ہی یقین کر لیتے۔ فاضلی صاحب سے درخواست ہے کہ اگر آیندہ انھیں کبھی اپنی شاعری کے آغاز کا سنہ بتانے کی ضرورت پیش آئے تو وہ کسی میونسپل کارپوریشن کے نئے یا پرانے ریکارڈ کا حوالہ نہ دیں۔ ورنہ لوگ اس میونسپل کارپوریشن پر الزام لگائیں گے کہ اس کا صفائی ستھرائی کا انتظام ناقص ہے۔

مذکورہ اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فاضلی صاحب خاصے منکسر المزاج ہیں۔ انھوں نے غالب کے مصرعے کا یہ ٹکڑا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ اپنے ذہن میں رکھا۔ حالانکہ ڈوبنے کا تعلق ان سے نہیں شاعری سے ہے۔ انھیں تو اس مصرعے کا دوسرا ٹکڑا۔ نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔ اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو مرغے اور چونچ والی شاعری کون کرتا؟

ندا فاضلی کا جو انٹرویو "جسارت" میں چھپا ہے وہ زیادہ فکر انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے جہاں ایک طرف یہ اعلان کیا ہے کہ ہماری تہذیب میں بزرگوں کے بارے میں رائے نہیں دی جاتی، وہیں دوسری طرف انھوں نے اپنے بعض بزرگوں، اختر الایمان اور اُن کی نسل کے شاعروں کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ یہ لوگ اپنے امیج کی عظمت کے اسیر ہیں اور اپنے بعد کے شاعروں کو نہیں پڑھتے۔

اختر الایمان اور اُن کی نسل کے شاعروں نے ایک عمر کی ریاضت کے بعد جو مقام حاصل کیا ہے، اگر وہ اس کے اسیر ہیں تو اِس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ یہ کوئی ایسا جرم نہیں جس کی پاداش میں انھیں ندا فاضلی اور اُن کے ہم عصروں کا کلام پڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ اختر الایمان اور اُن کی نسل کے شاعر بڑے عاقبت اندیش ہیں کہ وہ اپنے بعد کے شاعروں کو نہیں پڑھتے اور اِس طرح بہت سی بلاؤں سے محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً اختر الایمان اگر کبھی ندا فاضلی کا وہ گیت پڑھ لیتے جس کے چار مصرعے یہ ہیں:

بالوں کو بکھرائیں کپڑے بگاڑیں
مٹی میں دبے ہنستے پتھر اکھاڑیں
جی چاہے، چیخ پڑیں
دوڑیں اور دھاڑیں

تو اُن کی باقی ماندہ عمر چیخنے، دوڑنے اور دھاڑنے میں گزر جاتی۔

نئی نسل کو اپنے بزرگوں سے یہ شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ انھوں نے اپنے بعد کے شاعروں کو نہیں پڑھا کیوں کہ خود نئی نسل نے اپنے سے پہلے کے شاعروں کو پڑھنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی۔ سچی بات یہ ہے کہ نئی نسل کو سوائے مشاعرے پڑھنے کے کچھ اور پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔

ندا فاضلی کا شکوہ سن کر انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا: "آپ نے اپنے بعد آنے والی نسل کے لیے کیا کیا ہے"؟ موصوف نے جواب دیا: "میں نے ہر نئی آواز کو متعارف کرانے میں حصہ لیا ہے۔ حیدر آباد دکن کے شاعر علی کی نظمیں، میں نے اپنے نوٹ کے ساتھ 'شاعر' بمبئی میں شائع کرائی تھیں"۔

شاید اسی نوٹ کا اثر ہے کہ اس نئے شاعر کا نام اور کلام پھر کبھی کسی رسالے میں نظر نہیں آیا۔

اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک نئے شاعر نے ایک پرانے شاعر کے سفارشی خط کے ساتھ اپنی غزل شاہد احمد دہلوی مرحوم کو رسالہ "ساقی" میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ شاہد صاحب نے اس کے جواب میں شاعر کو لکھا : "آپ کی غزل تو اچھی ہے لیکن جن صاحب سے آپ نے سفارشی خط لکھوایا ہے، ان کے بارے میں میری رائے اچھی نہیں ہے۔ لہٰذا غزل واپس بھیج رہا ہوں"۔

(۲۲/ جون ۱۹۸۴ء)

اہلِ تحقیق کی سخن ناشناسی

ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے بلند مرتبہ محقق ہیں۔ ان کا نام بلا تکلف حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اردو کے قدیم ادب پر خصوصاً داستانوں اور مثنویوں کے حوالے سے جو کام کیا ہے، اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہر کتاب تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند قدیم ادب کے سمندر میں غوطہ زنی کرکے تہ کی خبر لاتے ہیں لیکن ساحل پر کھڑے ہوئے شاعروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہ رویّہ اہلِ تحقیق کی روایتی شانِ بے نیازی کے عین مطابق ہے اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ موتی سمندر کی تہ ہی میں ہوتے ہیں۔ ساحل پر خس و خاشاک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا :

دریا میں موتی اے موج بے باک
ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

اتفاق کی بات یہ ہے کہ پرانے تذکروں میں خار، خس اور خاک تخلص کے شاعر موجود ہیں۔ مذکورہ شعر لکھتے وقت علامہ اقبال کے سامنے یہی شعرا ہوں گے۔

ڈاکٹر گیان چند کو شکایت یہ ہے کہ شعرائے کرام انھیں بہت پریشان کرتے ہیں اور بلا طلب اور بلا ضرورت اپنے شعری مجموعے بھیج کر اپنی شان میں نثری قصیدے لکھوانے کے تقاضے کرتے ہیں۔ اس صورت حال سے ڈاکٹر صاحب اس حد تک پریشان ہیں کہ انھوں نے "مجھے شعری مجموعوں سے بچاؤ" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس کی تمہید میں وہ فرماتے ہیں:

"اکادمیوں کی مالی امداد کے طفیل اردو میں وہ کتابیں بھی اشاعت کا منہ دیکھ لیتی ہیں جنھیں امداد کے بغیر پردۂ غیب ہی میں رہنا ہوتا۔ اشاعت کے بعد کتاب کی نکاسی کی اوگھٹ گھاٹی سامنے آتی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی کتابیں تو درس گاہوں کی لائبریریاں اور شاذ طلبہ خرید لیتے ہیں لیکن شعری مجموعوں کا کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں شعرا کی تعداد نثر نگاروں سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ اردو کی جملہ ادبی کتابوں میں شعری مجموعوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ شاعر، سامع اور قاری کے لیے تڑپتا ہے۔ خریدار نہیں ملتا تو اپنی عمر بھر کی (یا سال دو سال کی کمائی) تحفتہً ہی اہل الرائے کو تفویض کر دیتا ہے اور اس کی بہا میں نثری داد کا طالب ہوتا ہے"۔

پاکستان میں بھی صورت حال تقریباً یہی ہے۔ یہاں اردو اکادمیاں تو نہیں ہیں جو مالی امداد دے کر شریکِ جرم ہوں، البتہ بہت سے تجارتی ادارے ایسے ہیں جو بروشیر کے لیے اشتہار دے کر شاعر کے نقصان کی تلافی کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات شاعر ادبی اعتبار سے نہ سہی، مالی طور پر فائدے ہی میں رہتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان میں تقریباً ہر صاحبِ دیوان شاعر اپنے دیوان کے ساتھ ایک بروشیر بھی چھاپتا ہے۔ دیوان کے لیے کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑتی کیونکہ شاعری کے سانچے اور ڈھانچے پہلے سے موجود ہیں، انھیں کو کام میں لا کر دیوان تیار کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بروشیر میں شامل کرنے کے لیے آرا اور اشتہارات کے لیے در در کی گدائی کرنی پڑتی ہے۔ شاعر جتنی محنت بروشیر پر کرتا ہے، اگر اُتنی محنت وہ اپنی شاعری پر کرے تو اُس کی شاعری پر نہ سہی، اخلاقی حالت پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔

شعری مجموعے کثرت سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند فرماتے ہیں:

"میں کسی طرح معاصر ادب کا نقاد نہیں لیکن میرے پاس شعری مجموعے جس کثیر تعداد میں آتے ہیں، میں ان سے سراسیمہ ہو گیا ہوں۔ اکتوبر نومبر ۸۶ء میں چھ ہفتے کے لیے میں حیدر آباد سے باہر گیا۔ اس عرصے میں سات شعری مجموعے وصول ہوئے جن میں سے پانچ کے خالق ایسے تھے جن کا نام میں نے پہلی بار ان مجموعوں کے طفیل سنا۔ اگر کسی ہفتے کوئی شعری مجموعہ نہ آئے تو میں اسے مبارک جانتا ہوں۔ ایک شامتِ اعمال ہفتے میں تین مجموعے وصول ہوئے۔ اگر مجھ بے بصیرت کا یہ حال ہے تو جو حضرات اردو کے نامور مبصر اور دیدہ ور نقاد ہیں، ان کے یہاں تو شعری مجموعوں کی ایسی باڑھ آتی ہو گی کہ گھر میں ان کے بیٹھنے اٹھنے کو جگہ ہی نہ بچتی ہو گی"۔

ڈاکٹر صاحب خوش قسمت ہیں کہ شاعر حضرات انھیں دیوان کے ایک ایک نسخے ہی سے نوازتے ہیں ورنہ یہاں تو ایسے فراخ دل شاعر بھی موجود ہیں جو ہر نقاد کے گھر کے تمام افراد کے لیے الگ الگ نسخہ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک شاعر صاحب اپنے دیوان کے ایک درجن نسخے لے کر ایک نقاد کے گھر گئے۔ ایک نسخہ ان کی خدمت میں اور چند ان کے اہلِ خانہ کو پیش کیے۔ اس دوران نقاد کے دو چار ملاقاتی بھی آئے۔ ان سب کی تواضع بھی دیوان سے کی گئی۔ ایک ملاقاتی کے ساتھ چار پانچ سال کا ایک بچہ بھی تھا۔ اس نے اپنے باپ کے ہاتھ سے دیوان لینا چاہا تو باپ نے اسے سمجھایا: "بیٹا یہ تمھارے کام کی چیز نہیں"۔ حضرتِ نقاد مسکرائے اور کہا: "یہ اسی کے تو کام کی چیز ہے"۔ جنابِ شاعر نے سُنی اَن سُنی کر کے فرمایا: "بچے کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ میں اسے الگ سے ایک نسخہ پیش کر دیتا ہوں"۔

اپنے مضمون میں ڈاکٹر گیان چند آگے چل کر لکھتے ہیں: "ہر صاحبِ عطا (شاعر) چاہتا ہے کہ کتاب پر مفصل رائے دی جائے۔ مراد ہے مفصل تحسین کی جائے۔ میں سنبھال کر دو چار جملے لکھ دیتا ہوں تو اُس سے کہاں تشفی ہوتی ہے۔ اصرار پر اصرار ہوتا ہے کہ اور مفصل لکھیے۔ جو زیادہ اڑیل اور ڈھیٹ ہوتے ہیں وہ مصر رہتے ہیں کہ پورا مضمون لکھیے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو روایتی قسم کے شاعروں سے واسطہ پڑا ہے ورنہ آج کل کے سمجھ دار شاعر کسی سے رائے لکھنے کے لیے نہیں کہتے۔ خود ہی لکھ کر لے جاتے ہیں اور دستخط کرا لیتے ہیں۔ خود ہمارا تجربہ اس سلسلے میں خاصا دلچسپ بلکہ عبرت انگیز ہے۔ خدا جانے کس غلط فہمی میں ایک شاعر صاحب اپنا دیوان لے کر آئے اور اُس پر رائے لکھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے مصروفیت کا عذر پیش کیا تو فرمانے لگے: "اس کا مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے میں کچھ سطریں لکھ کر لے آیا ہوں۔ بس آپ صرف دستخط کر دیجیے"۔ ہم نے ان سطروں کو دیکھا جن کا سلسلہ کئی صفحوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک جگہ نظر ٹھہر گئی۔ موصوف نے غالب سے اپنا موازنہ کر رکھا تھا' وہ بھی اس طرح کہ غالب مغلوب نظر آتے تھے۔ ہم نے دستخط کرنے سے انکار کیا تو کہنے لگے: "کوئی بات نہیں۔ آپ دستخط نہیں کر سکتے تو انگوٹھا ہی لگا دیجیے"۔

ڈاکٹر گیان مزید فرماتے ہیں: "میرے لیے دو دقتیں ہیں۔ میرے غریب خانے میں پڑھنے کا ایک ہی کمرہ ہے۔ اس میں کتابوں کے لیے متعدد الماریاں ہیں۔ سب تقریباً بھری ہوئی ہیں۔ مزید

الماریوں کی گنجایش نہیں۔ اس طرح مزید کتابوں کے لیے جگہ بنانا مشکل ہے۔ .... مجھے شعری مجموعوں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن میرے مطالعے کی حد تک ان کی ترجیح کم ہے کیوں کہ میں قدیم ادب کا آدمی ہوں۔ اپنی مختصر محدود زندگی میں چند تحقیقی کتابیں لکھنے کی ہوس ہے۔ کم امید ہے کہ انھیں پورا کرسکوں گا۔ اپنے محدود وقت کو معاصر ادب کی تنقید کی نذر نہیں کرسکتا۔ میں اردو کے مستند خوش فکر شعرا کے مجموعوں کو خوش آمدید کہوں گا۔ بشرطیکہ وہ مجھ سے فوری رائے طلب نہ کریں۔ کسی مضمون میں ان کا اقتباس یا تبصرہ دینے کی ضرورت آئے گی تو مجموعے سے استفادہ کرکے پیش کروں گا"۔

ڈاکٹر گیان چند بہت بڑے محقق ضرور ہیں لیکن شاعر شناس معلوم نہیں ہوتے۔ ان کا یہ فرمانا کہ صرف مستند خوش فکر شاعر اپنے مجموعے بھیجیں' اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ ہر وہ شخص جو چار مصرعے موزوں کرلیتا ہے' اپنے آپ کو مستند خوش فکر شاعر سمجھتا ہے اور اب تو نثری نظم کے چلن کی وجہ سے مصرعوں کی موزونیت کی قید بھی نہیں رہی۔ ہمارا خیال ہے کہ اب ڈاکٹر صاحب کو پہلے سے زیادہ مجموعے موصول ہوں گے۔ ہر شاعر محض اس وجہ سے انھیں اپنا مجموعہ ضرور بھیجے گا کہ ڈاکٹر صاحب مستند خوش فکر شاعروں کے مجموعے جمع کرتے ہیں۔

اپنے مضمون کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے: "جو شعرا میری حقیر رائے کو اپنا مقام بلند کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں' ان سے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنے مجموعے عطا نہ کریں"۔

ڈاکٹر صاحب اگلے وقتوں کے آدمی ہیں' انھیں یہ معلوم نہیں کہ اب شعرائے کرام اپنا مقام بلند کرنے کے لیے دوسروں کی رائے طلب نہیں کرتے' بلکہ رائے دینے والوں کو ان کے مقام سے گرانا مقصود ہوتا ہے۔

(۱۹/ مارچ ۱۹۸۷ء)

عمرِ عزیز یا عمرِ رائیگاں

یہ ضروری نہیں کہ ہر مشہور ادیب مقبول بھی ہو، لیکن جمیلہ ہاشمی اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شہرت اور مقبولیت آگے نکل جائیں اور جمیلہ ہاشمی پیچھے رہ جائیں۔ بلکہ یوں ہو رہا ہے کہ تینوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شاہ راہِ ادب پر ہوا کی طرح اڑتی جا رہی ہیں۔ اِدھر جمیلہ ہاشمی کوئی کتاب لکھتی ہیں اور اُدھر وہ دنیائے ادب میں سکّۂ رائج الوقت بن جاتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے ۲۶۔۲۷ سال پہلے جب اُن کا پہلا ناول "تلاشِ بہاراں" شائع ہوا تھا تو نو عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہم جیسے بوڑھوں نے بھی اسے مزے لے لے کر پڑھا تھا۔ اس زمانے کے نو عمر لڑکے لڑکیاں تو بوڑھے ہو کر زیادہ مفید کاموں میں مصروف ہو چکے ہیں لیکن ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں تھے۔ یہ ناول آج بھی ہمارے سرہانے رکھا رہتا ہے۔ خدانخواستہ اس سے ہم تکیے کا کام نہیں لیتے بلکہ جب جی چاہتا ہے اس کے دو چار صفحے پڑھ کر ادبِ عالیہ کے مزے لوٹتے لوٹتے سو جاتے ہیں۔

ہمارے بعض بہی خواہ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ اس ناول سے اتنی دلچسپی نہ لو ورنہ ایک دن سوتے کے سوتے رہ جاؤ گے۔ مگر ہم ایسی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ بفرضِ محال اگر ہمارے بہی خواہوں کے اندیشے کے مطابق کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی گئی تو اُس سے یہی ثابت ہو گا کہ ناول اتنا عمدہ ہے کہ اسے پڑھنے والا دنیا کے غموں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے اس ناول پر آدم جی انعام ملا تھا جس کی وجہ سے خانوادۂ آدم جی کی عزت و شہرت میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور اب تک اسی عزت و شہرت سے اُن کا کام چل رہا ہے۔

جس سال "تلاشِ بہاراں" کو آدم جی انعام ملا تھا، اس سال انعام کے لیے داخل کی جانے

والی کتابوں میں ممتاز مفتی کا ناول "علی پور کا ایلی" بھی شامل تھا۔ یہ وہی ناول ہے جس کو شائع کرنے کے لیے اشفاق احمد نے زرِ کثیر صرف کر کے اپنے گھر میں پریس لگایا تھا۔ (آج کل پریس کی جگہ پاکستان ٹیلی ویژن کو کنٹرول کرنے کے آلات لگا رکھے ہیں) انھیں توقع تھی کہ اگر ناول کو انعام مل گیا تو یہ دھڑا دھڑ فروخت ہو گا اور اس طرح وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لیکن شومیِ قسمت سے یا بدخواہوں کی سازش سے انعام نہ ملا تو اشفاق احمد کی پریس پر خرچ ہونے والی رقم اور ممتاز مفتی کا ناول، دونوں ڈوب گئے۔ یہ واقعہ "شہاب نامہ" کے بعض واقعات کی طرح طبع زاد نہیں ہے، خود ممتاز مفتی نے اپنی کتاب "اَوکھے لوگ" میں ناول اور رقم کے ڈوبنے کا سارا قصہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو کراچی نے ممتاز مفتی کے ساتھ ایک شام منائی تھی۔ جس میں ان کی شان دار ادبی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے آدم جی انعام اور رائٹرز گلڈ کے پہلے سیکریٹری جمیل الدین عالی نے انکشاف کیا تھا کہ انعام تو "علی پور کا ایلی" کو ملنا تھا لیکن مل گیا "تلاشِ بہاراں" کو۔ چوں کہ خواتین کا احترام ہماری تہذیب میں شامل ہے، اس لیے ججوں نے جمیلہ ہاشمی کو انعام کا مستحق قرار دیا۔ عالی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ججوں میں سے شاید کسی نے بھی "علی پور کا ایلی" اور "تلاشِ بہاراں" کو نہیں پڑھا تھا۔

عالی صاحب کی مذاق کی ان باتوں کو جمیلہ ہاشمی نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ "اخبار خواتین" کے تازہ شمارے میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے، اس میں وہ فرماتی ہیں: "عالی صاحب جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ محض ممتاز مفتی کو خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے تھے۔ اگر محض خاتون رائٹر ہونے کی وجہ سے ایوارڈ دیا گیا تو ہاجرہ مسرور کی کتاب "تیسری منزل" بھی ان میں شامل تھی، انھیں کیوں نہیں دے دیا گیا؟ اس وقت منصفین میں اختر حسین رائے پوری، وقار عظیم، حمید احمد خان اور ڈاکٹر شہید اللہ شامل تھے اور ان میں سے کوئی مجھے نہیں جانتا تھا۔ جہاں تک کتابوں کو پڑھنے یا نہ پڑھنے کا تعلق ہے، اس کا پتا خود منصفین کو ہو گا۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ یہ باتیں کہہ کر عالی نے ممتاز مفتی اور اُن کے مداحوں کو تو خوش کر دیا لیکن تمام منصفین، رائٹرز گلڈ اور خود اپنی بے عزتی کی ہے۔ اس مرتبہ یہ ایوارڈ میرے ناول "دشتِ سوس" کو نہیں ملا بلکہ ممتاز مفتی کی کتاب "لبیک" کو ملا ہے۔ میں اس کا کیا مطلب لوں؟ جن دنوں عالی صاحب نے یہ بات کہی میں

عمرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔ واپس لوٹی تو معلوم ہوا۔ میں نے انھیں فون کیا کہ بھئی ایسا کیوں کہا گیا ہے۔ وہ بولے: 'مجھے معاف کر دو' تم عمرہ کر کے آئی ہو اور اب لڑ رہی ہو' تمھارا تو عمرہ بھی قبول نہیں ہوگا' یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ گالی بھرے مجمع میں دے دی اور معافی گلی میں مانگ لی۔ عالی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر سکیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ لوگ ممتاز مفتی کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کے چونچلے اٹھا رہے ہیں۔ 'تلاش بہاراں' میری قلم برداشتہ کتاب تھی۔ میں نے اسے دوبارہ پڑھے بغیر کاتب کو دے دیا تھا مگر یہ حقیقت ہے میں نے مفتی صاحب سے بہت زیادہ اور بہتر لکھا ہے۔ 'آتشِ رفتہ' کوئی مائی کا لال لکھ کر دکھا دے۔ میں ایک ایک کو چیلنج کرتی ہوں کہ 'دشتِ سوس' جیسی کوئی دس سطریں لکھ کر دکھا دے۔ مفتی صاحب مرد اور عورت کے قصے بیان کر سکتے ہیں۔ ہم بھی لکھتے ہیں مگر انداز اپنا اپنا ہوتا ہے۔ میں نے 'ماہ نو' میں ایک کہانی لکھی ہے 'شیری' ۔ وہ ایک عورت اور کتے کی کہانی ہے کیا اسے کوئی اور لکھ سکتا ہے"۔

معاف کیجیے گا' اقتباس ذرا طویل ہو گیا' لیکن حکایت لذیذ ہو تو "دراز تر" کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم) میرزا یگانہ کی جب لکھنؤ والوں سے ٹھن گئی تو انھوں نے اپنے آپ کو "فاتحِ لکھنؤ" قرار دے کر ایک "ترانہ شقشقیہ" لکھا جس میں اپنے فضائل بانگ دہل بیان کیے۔ اس ترانے کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں: "اظہارِ فضیلت جسے عوام الناس اپنی کوتاہ نظری سے خود ستائی پر محمول کرتے ہیں اور مذموم سمجھتے ہیں' دنیا کی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف سے مذموم نہیں بلکہ بعض اوقات ناگوار تبلیغی فرض ٹھہر جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس اظہارِ فضیلت سے کوتاہ نظر عوام الناس کی ہدایت و تلقین مقصود ہو"۔

جمیلہ ہاشمی نے بھی مذکورہ بیان میں جو کچھ کہا ہے' اسے ناگوار تبلیغی بلکہ ابلاغی فرض سمجھنا چاہیے جس سے ہم جیسے کوتاہ نظر عوام الناس کی ہدایت و تلقین مقصود ہے۔ یگانہ نے "ترانۂ شقشقیہ" میں صرف اپنے فضائل بیان کیے ہیں' جمیلہ ہاشمی کے "بیانِ شقشقیہ" میں فضائل کے علاوہ کچھ کام کی باتیں بھی ہیں۔

محترمہ کا خیال ہے کہ عالی صاحب نے ججوں پر کتابیں نہ پڑھنے کا جو الزام لگایا ہے' اس سے ججوں کی بے عزتی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ جو شخص گلڈ کے انعامات کا جج بننے کی ہمت رکھتا ہے' وہ عزت اور بے عزتی دونوں سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ جس کو ہوں جان و

دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

عالی صاحب کا یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہیں کہ جج صاحبان شاید ہی کوئی کتاب پڑھتے ہوں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ جج عموماً نقادوں کو بنایا جاتا ہے اور نقاد حضرات کو صرف لکھنے کی عادت ہوتی ہے' پڑھنے سے طبیبوں نے منع کر رکھا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ انعامات کے لیے اتنی زیادہ کتابیں موصول ہوتی ہیں کہ اگر جج صاحبان ان سب کو پڑھ ڈالیں تو اُن کی عمرِ عزیز عمرِ رائیگاں میں تبدیل ہو جائے گی۔

(۱۸/ نومبر ۱۹۸۷ء)

(۲)

محترمہ جمیلہ ہاشمی نے بتایا ہے کہ اس مرتبہ ان کا ناول "دشتِ سوس" اور ممتاز مفتی کا سفرنامہ "لبیک" دونوں انعامی مقابلے میں شامل تھے۔ انعام "لبیک" کو مل گیا۔ محترمہ فرماتی ہیں: "میں اس کا مطلب کیا لوں؟" اس سوال میں جواب بھی موجود ہے' یعنی یہ کہ مفتی صاحب کو انعام ازرہِ ترحم ملا ہے۔ محترمہ کی خدمت میں عرض ہے کہ انعام دینے والے انعام ہی دے سکتے ہیں' جرمانہ تو نہیں کر سکتے۔

جرمانے کے ذکر پر ہمیں استاد لاغر مراد آبادی کا ایک قول برحق یاد آگیا۔ فرماتے ہیں: "یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے انھیں اب انعامات ملتے ہیں"۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جمیلہ ہاشمی اور ممتاز مفتی انعام کے لیے کتابیں ایک ساتھ داخل کرتے ہیں اور انعام انھیں دونوں میں سے کسی ایک کو مل جاتا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں ایک ساتھ کتابیں داخل نہ کریں تاکہ انعام کسی مستحق کو مل جائے۔

ہماری اس بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جمیلہ ہاشمی انعام حاصل کرنے کی شوقین ہیں۔ وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہیں۔ انھوں نے خود پانچ ہزار روپے کا ایک ادبی انعام قائم کر رکھا ہے جو ہر سال کسی نئے افسانہ نگار کے افسانوی مجموعے پر دیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محترمہ نے انعام کے لیے افسانہ نگار کے نئے ہونے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ کہیں یہ انعام ممتاز مفتی کو نہ مل جائے۔ اگرچہ یہ بات غلط ہے لیکن کوئی کسی کی زبان بند نہیں کر سکتا۔ بہرحال غلط فہمیوں کے دروازے بند کیے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا ہماری تجویز ہے کہ محترمہ جمیلہ ہاشمی ایک ادبی انعام ان ادیبوں

کے لیے بھی قائم کر دیں جو اسّی سال سے زائد عمر کے ہیں اور باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ اس طرح یہ انعام ہر سال ممتاز مفتی کو مل جایا کرے گا۔ لیکن ہمیں امید نہیں کہ محترمہ اس تجویز پر عمل کریں گی۔ وہ عالی صاحب جیسے لوگوں میں کیسے شامل ہو سکتی ہیں جو بقول محترمہ کے، ممتاز مفتی کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کے چونچلے اٹھا رہے ہیں۔

محترمہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ: "میں نے ممتاز مفتی سے زیادہ اور بہتر لکھا ہے"۔ بہتر والے معاملے میں تو ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ ہم میں اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہے لیکن زیادہ لکھنے والی بات محلِ نظر ہے۔ ممتاز مفتی کا صرف ایک ناول "علی پور کا ایلی" اتنا ضخیم ہے کہ محترمہ کی تمام تصانیف کی مجموعی ضخامت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

محترمہ کو شاید یاد نہیں رہا کہ جب یہ ناول طبع ہو رہا تھا تو کاغذ اور قاری دونوں نایاب ہو گئے تھے۔ کاغذ اِس لیے کہ اسے اِس لحیم شحیم ناول کا بوجھ اٹھانا تھا، قاری اِس لیے کہ اُسے بھی اپنی جان کا بوجھ اٹھائے رہنا عزیز تھا۔

محترمہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ میں چیلنج کرتی ہوں کہ کوئی "دشتِ سوس" کی دس سطریں بھی لکھ کر دکھا دے۔ ہم اس پر اس قدر اضافہ کریں گے کہ دس سطریں لکھنا تو بڑی بات ہے، ان دس سطروں میں جو کامے اور فل اسٹاپ ہیں، کوئی انھیں کو ویسی ہی معنویت کے ساتھ استعمال کر کے دکھا دے تو ہم اُسے صدارتی تمغائے حُسنِ کارکردگی کا مستحق سمجھیں گے کہ اب یہ تمغا اِسی قسم کے کارناموں پر ملتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی انگریزی میں ایم اے ہیں، اس لیے وہ فرماتی ہیں کہ جو انگریزی میں ایم اے نہیں وہ اچھا ادیب بھی نہیں ہو سکتا۔ محترمہ کی اس بات کو اگر مان لیا جائے (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں) تو پھر غالب، اقبال اور پریم چند جیسے اکابر کے بارے میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ادب تخلیق نہیں کرتے تھے، گھاس کاٹتے تھے اور گھاس منڈی جانے کی بجائے غلطی سے دنیائے ادب کی طرف آ نکلے۔

جمیلہ ہاشمی سے پوچھا گیا کہ انھیں اردو کی کون سی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے "چہرہ بہ چہرہ رُوبہ رُو" کا نام لیا۔ دوسرے نمبر پر اُن کی پسندیدہ کتاب "آگ کا دریا" ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ پہلی کتاب محترمہ کی اپنی تصنیف ہے اور دوسری قرۃ العین حیدر کی۔ یہ بات محترمہ کی انصاف پسندی کی دلیل ہے ورنہ اُن کی دوسری پسندیدہ کتاب

بھی اُن کی اپنی ہی کوئی تصنیف ہو سکتی تھی۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں وہ فرماتی ہیں: "وہ میری پسندیدہ رائٹر ہے۔ اب تو میری دوست بھی ہے مگر شروع میں میں اُن کے افسانوں پر جان دیتی تھی"۔ لفظ 'مگر' کا استعمال جس فن کارانہ مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے' اس کا جواب نہیں۔ اردو کے تمام ادیب مل کر بھی 'مگر' کو اس سے بہتر طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اپنی دوست قرۃ العین کا ذکر انھوں نے ایک اور سلسلے میں بھی کیا ہے۔ فرماتی ہیں: "میری ہر کتاب کا رنگ مختلف ہے۔ جہاں کی کہانی ہے وہیں کی زبان ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ بات قرۃ العین حیدر سمیت کسی بھی لکھنے والے کے یہاں نہیں ملے گی"۔

تاریخی کرداروں پر ناول لکھنے کے سلسلے میں سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے اِن کرداروں سے متعلق مقامات کو دیکھا ہے یا نہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا جواب: "کیا لوگ چاند تاروں پر گئے ہیں۔ آخر ان کے بارے میں بھی تو لوگ لکھتے ہیں۔ لکھنے کے لیے کیا وہاں جانا ضروری ہوتا ہے... میں نے ان کتابوں کو لکھتے ہوئے ان ممالک کے نقشے دیکھے۔ بغداد کا نقشہ میرے پاس تھا۔ اس کے شہروں' پہاڑوں اور دریاؤں کا بغور مشاہدہ کیا۔ ایران کا نقشہ چھ ماہ تک میرے کمرے میں لٹکتا رہا"۔

جمیلہ ہاشمی کی محنت بلکہ ہمت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے بغداد اور ایران کے پس منظر میں تاریخی ناول لکھتے ہوئے ان علاقوں کے نقشے اپنے سامنے رکھے۔ یہ پڑھنے والوں کی کم نظری ہے کہ انھیں ناولوں میں یہ نقشے الٹے نظر آتے ہیں۔

(۹/ اپریل ۱۹۸۷ء)

(۳)

دنیائے ادب میں معرکہ آرائیوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ "نقوش" کا ادبی معرکہ نمبر دیکھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ادب کی تاریخ' معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔ اِسی بنا پر ہمارے ہاں ہجو نگاری کو فروغ ہوا۔ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے ہجو سے اپنے قلم کو آلودہ یا آسودہ نہ کیا ہو۔ اردو شاعری کا کڑے سے کڑا انتخاب بھی کیا جائے تو اُس میں دو چار ہجویات ضرور شامل ہوں گی۔

ادبی معرکہ آرائیوں کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو' یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض خوابیدہ الفاظ پرانے اور نئے مفاہیم کے ساتھ دوبارہ استعمال میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ ہے "ہی ہی"۔ اب

اسے کون استعمال کرتا ہے لیکن فراق گورکھپوری نے اثر لکھنوی کی ہجو میں اس لفظ کو دوبارہ زندہ کردیا ہے :

فراق اپنے سناتے ہیں جب اشعار
اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی

خوابیدہ الفاظ کی طرح بعض خوابیدہ اہلِ قلم بھی ادبی معرکہ آرائیوں کی بدولت خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر ادب سے گہری دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی دو ادیبوں میں معرکہ آرائی ہوتی ہے تو ہم اُسے زبان و ادب کے حق میں مضر نہیں سمجھتے۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارا رویّہ بے حد محتاط ہوتا ہے۔ ہم فریقین میں سے کسی کی طرف داری نہیں کرتے تا کہ ہارنے والا ہمیں اپنی شکست کا سبب نہ سمجھے اور جیتنے والا اپنی جیت کو ہماری دعاؤں کا نتیجہ نہ گردانے۔ ہم صلح کرانے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ اس طرح فریقین کی صلاحیتوں کے اظہار کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ ہم جھگڑے کو بڑھانا بھی پسند نہیں کرتے کہ یہ ہماری خواہش کے بغیر بھی بڑھ سکتا ہے اور اکثر بڑھ جاتا ہے۔ ہم تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ اہم ادبی جھگڑوں کی تفصیلات اپنے کالموں میں محفوظ کردیتے ہیں تا کہ آیندہ کبھی دوبارہ یہ جھگڑا شروع ہو تو اُس کا ریکارڈ فریقین کے سامنے رہے اور بات جہاں ختم ہوئی تھی وہیں سے اسے آگے بڑھانے میں مدد ملے۔

گزشتہ مہینے جمیلہ ہاشمی نے اپنے ایک انٹرویو میں ممتاز مفتی اور جمیل الدین عالی کے خلاف جو کچھ کہا تھا' اسے کسی ادبی معرکے کا نقطۂ آغاز قرار دینا مشکل تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ممتاز مفتی اپنی بزرگی کی وجہ سے جمیلہ ہاشمی کا کہا سنا معاف کردیں گے اور عالی صاحب غیر ملکی مشاعرے پڑھنے میں اتنے مصروف رہیں گے کہ ملکی ادب پڑھنے کی انھیں فرصت نہیں ملے گی۔ عالی صاحب کی حد تک ہمارا خیال درست ثابت ہوا لیکن مفتی صاحب نے اپنی بزرگی سے خود فائدہ اٹھایا نہ جمیلہ ہاشمی کو اٹھانے دیا اور ایک عدد جوابی خط لکھ کر "اخبارِ خواتین" میں چھپوا دیا۔

ممتاز مفتی نے جمیلہ ہاشمی کے نام خط میں بات یوں شروع کی ہے: "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی محترمہ کہ قصور عالی کرے اور ڈانٹ ڈپٹ ممتاز مفتی کو کی جائے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ مستی کرے گھر والا اور چٹی بھرے پڑوسن۔ میں نے تو کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آپ جیسا لکھ سکتا ہوں یا لکھنے والوں میں کسی حیثیت کا مالک ہوں۔ میں نے تو کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ 'علی پور کا ایلی' کو ادب میں

کوئی مقام حاصل ہے۔ اُلٹا وہ تو بے ادب کتاب ہے اور لوگوں میں اِس لیے مقبول ہے کہ اخلاق بگاڑنے کی ترغیب دیتی ہے"۔

قطع نظر اِس سے کہ مفتی صاحب نے ضرب المثل استعمال کرنے کے شوق میں عالی کو گھر والا اور اپنے آپ کو پڑوسن قرار دے کر خوش مذاقی کا ثبوت نہیں دیا' ان کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ عالی کے قصور کی سزا انھیں (یعنی مفتی صاحب کو) کیوں دی گئی۔ اول تو سزا یافتگی کے لیے قصور والا ہونا ضروری نہیں ہے' دوسرے مفتی صاحب ہرگز معصوم نہیں ہیں۔ وہ اُس جلسے میں مہمان خصوصی تھے جس میں "تلاشِ بہاراں" کو "علی پور کا ایلی" کے مقابلے پر کم درجے کا ناول قرار دیا گیا تھا۔ مفتی صاحب کو چاہیے تھا کہ بھرے جلسے میں اِس کی تردید کرتے لیکن وہ عالی کی تقریر کے دوران فاتحانہ انداز میں مسکراتے رہے جس کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ عالی کی زبان پر ہے' وہی کچھ مفتی صاحب کے دل میں ہے۔ ایک مفتی صاحب ہی کیا' ہمارے نزدیک تو اُس جلسے کے تمام شرکا بھی سزا کے مستحق ہیں کہ انھوں نے عالی کی تقریر کے دوران صدائے احتجاج بلند کرنے کی بجائے تالیاں بجائیں۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ "علی پور کا ایلی" کو ادب میں کوئی مقام حاصل ہے۔ جلیے اس بات کو ہم مانے لیتے ہیں لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ آیندہ بھی کوئی ایسا دعویٰ نہیں کریں گے۔ لہٰذا جمیلہ ہاشمی کی ڈانٹ ڈپٹ بے جواز نہیں ہے۔ مستقبل میں کوئی غلط قسم کا دعویٰ کرنے سے روکنے کے لیے یہ اقدام ضروری تھا۔

مفتی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں: "اگر علی پور کا ایلی' مقبول ہوگئی ہے تو ادبی حیثیت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ آپ کیوں دل آزردہ کر رہی ہیں ناحق۔ محترمہ! میں تو خود آپ کی تحریر کا مداح ہوں۔ اور صرف تحریر کا ہی نہیں آپ کے پکوان کا بھی مداح ہوں۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ بار بار کھایا ہے۔ جب بھی قدرت اللہ شہاب پنڈی سے کراچی دورے پر ریل گاڑی سے جایا کرتے تھے تو آپ اپنے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن سے تین چار دیگچے لیے گاڑی میں سوار ہو جایا کرتی تھیں اور بڑی محبت سے ہمیں کھانا کھلا کر اگلے اسٹیشن پر اتر جایا کرتی تھیں۔ آپ کے کھانوں کا ذائقہ ابھی تک میری زبان پر تازہ ہے"۔

مفتی صاحب نے نمک خوار ہونے کا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا ہے جس کا مقصد

محض یہ جتانا ہے کہ وہ قدرت اللہ شہاب کے صرف ہم پیالہ و ہم نوالہ ہی نہیں "ہم دیگچہ" بھی تھے۔ مفتی صاحب کے بیان سے یہ تو واضح ہے کہ جمیلہ ہاشمی تین چار دیگچوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتی تھیں، لیکن یہ ثابت نہیں کہ گاڑی سے اُترتے وقت وہ ان دیگچوں کو ساتھ لے جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں یہ اندیشہ ہے کہ جمیلہ ہاشمی دیگچوں کی واپسی کا مطالبہ کر سکتی ہیں، لہٰذا ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ مفتی صاحب ان دیگچوں کو جلد از جلد واپس کر دیں تاکہ بحث "علی پور کا ایلی" تک محدود رہے اور کسی غیر ادبی موضوع کی طرف منتقل نہ ہو۔

اپنے ناول کے بارے میں مفتی صاحب لکھتے ہیں: "واقعی کچھ لوگ ایسے تھے جو 'علی پور کا ایلی' کو ایوارڈ کا حق دار سمجھتے تھے، ان کچھ لوگوں میں میں بھی تھا۔ اشفاق احمد بھی تھا۔ میں تو خیر حرص کی وجہ سے خود کو حق دار سمجھتا تھا، اشفاق احمد ناول کا پبلشر تھا۔ اس نے اپنی ساری پونجی اشاعت کی بھٹی میں جھونک دی تھی۔ چونکہ ہمیں علم تھا کہ جج صاحبان کتابیں پڑھ کر فیصلہ نہیں دیتے، اس لیے ہم نے التزاماً کتاب کو ضخیم بنا دیا تھا تاکہ ضخامت کا رعب پڑے"۔

مفتی صاحب تو بقول خود صرف 'حریص' تھے لیکن اشفاق احمد 'حریص لذّتِ آزار' دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم نہیں انھوں نے اپنی ساری پونجی بھٹی میں کیسے جھونک دی۔ شاید انھوں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ اگر وہ جمیلہ ہاشمی ہی سے مشورہ کر لیتے تو بھٹی میں پونجی کی بجائے ناول کے مسودے کو جھونک دیتے!

اشفاق احمد کے حوالے سے مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے: "اشفاق احمد ذہانت اور تخلیق میں کسی اور کو خود سے برتر نہیں سمجھتا، برابر بھی نہیں۔ اس نے زندگی بھر بانو قدسیہ کو نہیں مانا۔ مجھے ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ کسی نے اشفاق سے پوچھا تھا کہ اتنی لمبی رفاقت کی وجہ سے لازم ہے کہ آپ مفتی کی تحریر سے بھی متاثر ہوئے ہوں۔ اشفاق احمد نے جواب میں کہا تھا: لاحول ولا قوۃ"۔

مفتی صاحب کو آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ اشفاق احمد لاکھ لاحول پڑھیں، مفتی صاحب کی تحریروں کے آسیب سے رہائی نہیں پا سکتے۔ انھوں نے ایک عرصے سے کام کی کوئی چیز نہیں لکھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مفتی صاحب کی تحریروں سے متاثر ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔ ہاں ٹی وی کے ڈرامے لکھے ہیں لیکن ان کا لکھنا نہ لکھنا برابر ہے کہ یہ دیکھنے کی چیز ہیں پڑھنے کی نہیں۔

خط کے آخر میں مفتی صاحب فرماتے ہیں: "محترمہ جمیلہ ہاشمی! آخر میں ایک بات کہوں، اگر آپ برا نہ مانیں تو! آپ نے انٹرویو میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ہر لکھنے والا اپنے دل میں ایسے ہی خیالات رچائے بیٹھا ہے۔ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ میرے جیسی تحریر کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا، لیکن محترمہ یہ خیالات دل میں رکھنے کی چیز ہیں، انھیں منھ پر نہیں لاتے۔ ان کی تشہیر نہیں کرتے۔ آپ کی باتیں کتنی ہی سچی کیوں نہ ہوں، لوگ سمجھیں گے یہ تعلّی ہے۔ اگر آپ کو ان باتوں کی تشہیر منظور تھی تو یہی باتیں کسی اور کے منھ سے کہلوا دیتیں۔ یہی ادبی بڑوں کا وتیرہ ہے"۔

حیرت ہے کہ مفتی صاحب جیسے بزرگ ایک خُرد کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ دل میں کچھ رکھو زبان پر کچھ لاؤ۔ جمیلہ ہاشمی اگر اپنے آپ کو سب سے بڑی ادیبہ سمجھتی ہیں تو پھر اُنھیں یہ حق حاصل ہے کہ اس کا اعلان بھی کریں۔ جب تک محترمہ خود اپنی زبان سے کچھ نہیں کہیں گی، دوسروں کو کیسے علم ہو گا کہ وہ کس مرتبے کی ادیبہ ہیں۔ یہ بے چاری گھریلو خاتون ہیں، کوئی قدرت اللہ شہاب تو ہیں نہیں کہ انھیں اپنے کمالات کے چرچے کے لیے ممتاز مفتی اور اشفاق احمد جیسے اعلانچی مل جائیں۔

(۱۰/ دسمبر ۱۹۸۷ء)

ترقّی پسندی یا روایتی کمبل

رفیق چوہدری بے حد شریف، وضع دار اور دوست نواز انسان ہیں۔ اگر ان کی تمام خوبیاں گنوائی جائیں تو اس کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ خدا کے فضل سے وہ ترقی پسند بھی ہیں۔ اگرچہ یہ وصف ان کی بہت سی خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے لیکن پھر بھی اتنی خوبیاں باقی رہ جاتی ہیں کہ ان کی بنا پر رفیق چوہدری کا نام سن کر یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا ہے:

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

چوہدری صاحب کا ترقی پسندی سے بہت پرانا تعلق ہے اور اس تعلق میں کبھی کوئی جھول پیدا نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس دوران میں خود ترقی پسند تحریک میں خاصا جھول پیدا ہو چکا ہے۔ آج سے ۴۰۔۴۵ برس پہلے انھوں نے ترقی پسند تحریک کا دامن تھاما تھا۔ اس دامن کا جو ٹکڑا چوہدری صاحب کے ہاتھ میں رہ گیا تھا، وہ ابھی تک محفوظ ہے۔ اس ٹکڑے کو پرچم بنا کر وہ گاہے گاہے میدانِ عمل میں قدم رنجہ فرماتے رہتے ہیں اور یوں ترقی پسندی کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی مخلصانہ مگر ناکام کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

چوہدری صاحب صرف زبانی ترقی پسند نہیں، تخلیقی کام بھی کرتے ہیں۔ وہ کراچی کی ایک مشہور نرسری کے مالک ہیں جس میں سارا سال انواع و اقسام کے پھول مہکتے رہتے ہیں۔ یہ نرسری کراچی کا ایک اہم ادبی مرکز بھی ہے جہاں مہینے میں ایک دو بار ادیب جمع ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت میزبان چوہدری صاحب نہایت فراخ دل ہیں۔ ان کے مہمان صرف ترقی پسند ہی نہیں ہوتے، شرفائے شہر بھی ان محفلوں میں بلائے جاتے ہیں۔

معاف کیجیے، ہم نے چوہدری صاحب کی اتنی خوبیاں بیان کر ڈالیں لیکن یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ

افسانہ نگار بھی ہیں۔ دراصل ہم اس گومگو میں ہیں کہ اس ہنر کو خوبیوں میں شمار کیا جائے یا عیبوں میں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ چوہدری صاحب کے افسانوں کا ایک مجموعہ "محبتوں کے چراغ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ افسوس کہ اس چراغ کو قانون کے ظالم ہاتھوں نے بہت جلد بجھا دیا۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ یہ مجموعہ مطبع سے نکل کر جلد ساز کے ہاں پہنچا تھا کہ کسی سخن نافہم نے مخبری کر دی۔ مصنف اور دیباچہ نگار ابراہیم جلیس دونوں کو فحاشی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا اور دونوں "ملزموں" کو تین تین ماہ قید با مشقت اور تین تین ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ نیز کتاب کے تمام نسخوں کو نذر آتش کرنے کا حکم دیا گیا۔ چوہدری صاحب کتاب کے مصنف تھے، اس لیے ان سے جو سلوک بھی کیا جاتا وہ بجا تھا لیکن بے چارے ابراہیم جلیس مفت میں مارے گئے۔ اول تو دیباچہ لکھنا کوئی جرم نہیں تھا، دوسرے دیباچہ انھوں نے لکھا بھی نہیں تھا۔ چوہدری صاحب کو ابراہیم جلیس نے گہرے دوستانہ مراسم کی وجہ سے یہ اجازت دے دی تھی کہ دیباچہ کسی اور سے لکھوا لو، نام میرا درج کر دینا۔ اس واقعے کے بعد ابراہیم جلیس نے چوہدری صاحب سے کہا: "آیندہ کے لیے تم افسانے لکھنا چھوڑ دو اور میں دیباچے لکھنا چھوڑ دوں گا"۔ چوہدری صاحب نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ افسانہ نگاری چھوڑ دی لیکن ترقی پسندی کو اس لیے نہیں چھوڑ سکے کہ روایتی کمبل کی طرح اسے چھوڑنا ممکن نہ تھا۔

اب بہت دنوں بعد چوہدری صاحب نے "میری دنیا" کے نام سے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس سے گزشتہ تیس برسوں میں کچھ نہ لکھنے کی تلافی نہایت عمدگی سے ہو جاتی ہے۔ یہ چوہدری صاحب کی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات قلم بند کیے ہیں اور اپنے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں۔

چوہدری صاحب مشاق افسانہ نگار ہیں، انھیں بات کہنے ہی کا نہیں بات بنانے کا بھی فن آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر انھوں نے تفصیل سے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کا سب سے بڑا کام جلسے کرنا اور جلوس نکالنا تھا۔ ان لوگوں نے کئی کامیاب کانفرنسیں کیں اور کئی کئی میل لمبے جلوس نکالے۔ بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ترقی پسندوں نے ادب کی تخلیق میں بھی حصہ لیا ہے یا نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ادب تخلیق کرنا ترقی پسندوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ ان کا اصل مسئلہ یہ

ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں ادب تخلیق ہو سکے۔ افسوس کہ اب تک ایسے حالات بھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک ادب کی بجائے حالات کا شکار ہو گئی۔

ترقی پسند کانفرنسوں میں کیا کچھ ہوتا تھا' اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جولائی ۵۲ء کی کانفرنس میں دو ایسے شخص بھی آ گئے جن کے بارے میں یہ شبہہ کیا گیا کہ سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ کانفرنس کے پنڈال کے پیچھے جہاں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا' ان دونوں مشتبہ افراد سے چوہدری صاحب کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی تفصیل چوہدری صاحب کی زبان سے سُنیے: "پھر میں یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا (غالباً پاؤں سے اڑنگا دے کر اسے دھکا دیا ہوگا) وہ اپنے پیچھے آموں والے ٹب میں گر گیا۔ اس کے ساتھ میں بھی پانی والے ٹب میں اس کے اوپر تھا۔ دوسرے آدمی نے مجھے اوپر سے مارنا شروع کر دیا۔ احمد راہی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آ کر اسے پکڑ لیا اور اس کی مرمت شروع کر دی (احمد راہی کے بارے میں' اس زمانے میں دوست کہا کرتے تھے کہ شکر ہے کہ یہ شاعر بن گیا ورنہ بھائی دروازہ لاہور کا غنڈا ہوتا) اتنی دیر میں اسٹیج پر سب کو پتا چل گیا کہ پیچھے لڑائی ہو رہی ہے۔ جلد ہی اس جگہ مجید لاہوری' احمد ندیم قاسمی' عبداللہ ملک' ریاض روفی بھی پہنچ گئے۔ وہ دونوں اور میں پانی میں بھیگ چکے تھے..... بالکل بھیگے ہوئے چوہے لگ رہے تھے"۔

اس اقتباس میں جو الفاظ قوسین میں ہیں وہ بھی چوہدری صاحب کے ہیں۔ کسی اور بات کا تو کیا ذکر ہمیں تو احمد راہی کے شاعر ہونے کا علم بھی اسی اقتباس سے ہوا ہے۔ افسوس کہ اس زمانے میں ویڈیو فلم کا رواج نہ تھا' ورنہ ترقی پسندوں کے ذخیرۂ نوادر میں اس واقعے کی فلم بیش بہا اضافہ ہوتی۔

چوہدری صاحب نے اپنے اہلِ قبیلہ کی روش کے برخلاف اپنی کتاب کو کتاب مناقب نہیں بنایا بلکہ اہلِ قبیلہ کی خامیوں کی طرف واضح اشارے کیے ہیں۔ چوہدری صاحب نے حق گوئی و بے باکی کا حق جس طرح ادا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی ایک کانفرنس ۵۲ء میں ہوئی تھی' دوسری ۸۶ء میں۔ ان دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے چوہدری صاحب فرماتے ہیں: "سوچتا ہوں کہ ۱۹۵۲ء اور ۱۹۸۶ء میں کتنا فرق ہے' سوچ کا' کام کا' خلوص و دیانت کا۔ اس وقت کسی کو کندھا مار کر آگے آنے کا شوق نہ تھا' نہ ہی چھوٹے بڑے کا جھگڑا تھا۔ سب اجتماعی مقصد کے لیے ترقی پسند نظریے کی ترقی و ترویج کے لیے مل جل کر کام کرتے تھے۔ کسی

کو ذاتی نام و نمود کی ہوس نہ تھی، کوئی لالچ نہ تھا۔ ۱۹۸۶ء میں بہت کچھ بدل گیا۔ لوگوں نے ترقی پسندی کی آڑ میں اپنی ذات کا ڈھنڈورا پیٹا اور گروہ بندی کو ختم کرنے کی بجائے اور ہوا دی"۔

اگر چوہدری صاحب ذرا سے غور و فکر سے کام لیتے تو انھیں پرانے اور نئے ترقی پسندوں میں فرق کی وجہ معلوم ہو جاتی۔ پرانے ترقی پسندوں میں کم از کم یہ خوبی تھی کہ وہ سرکاری مخبروں سے ہاتھا پائی کرتے کرتے پانی کے ٹب میں غریقِ رحمت ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے، اور اب یہ حال ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں سرکاری مخبر ہی باقی رہ گئے ہیں، اصلی ترقی پسند دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لیے تو استاد لاغر مراد آبادی نے پچھلے دنوں یہ تجویز پیش کی تھی کہ انجمن میں جہاں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں، وہاں نام کی تبدیلی بھی عمل میں آنی چاہیے۔ نیا نام انجمن ترقی پسند مخبرین ہونا چاہیے۔ ہمیں اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔ نام میں کچھ نہیں رکھا۔ اصل چیز کام ہے اور کام جاری رہنا چاہیے۔

دو ڈھائی سال پہلے لندن میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی منائی گئی تھی۔ چوہدری صاحب اس زمانے میں لندن ہی میں تھے۔ اس جوبلی کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: "یہ سارا ایک مخصوص لابی کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس میں ہم خیال لوگوں کو بلایا گیا۔ جن سے کچھ اختلاف تھا، انھیں نظر انداز کیا گیا۔ وہ لوگ جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے لیے برس ہا برس محنت، لگن اور دیانت سے کام کیا ہے، وہ اس کھلی دھاندلی اور ناانصافی کو کیوں کر برداشت کر سکتے تھے.... یہی کچھ کراچی میں ہوا۔ ہم کس سے فریاد کریں، ہم تو دونوں جگہ لٹے، انگلینڈ میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ برے بھی بنے اور اچھے بھلے دوستوں کو بھی گنوایا"۔

ہماری دلی ہمدردیاں چوہدری صاحب کے ساتھ ہیں۔ اگر ان دونوں کانفرنسوں میں بھی وہ اپنی قوتِ بازو کا اسی طرح مظاہرہ کرتے جس طرح ۵۲ء کی کانفرنس میں کیا تھا تو صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی۔

یوں تو ساری کتاب ہی دلچسپ ہے لیکن مصنف نے اپنے بعض دوستوں کے جو شخصی خاکے لکھے ہیں ان کی بات ہی اور ہے۔ ابراہیم جلیس، فارغ بخاری، ریاض روفی اور ظہیر کاشمیری وغیرہ کی ایسی خوبصورت قلمی تصویریں شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر چوہدری صاحب خاکہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ کریں۔ ترقی پسندی تو اور لوگ بھی کر سکتے ہیں، ایسی

خاکہ نگاری کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

کتاب کا دیباچہ پروفیسر عتیق احمد نے لکھا ہے۔ پروفیسر صاحب نے دیباچہ کیا لکھا ہے' ترقی پسندی کی قبر پر لات ماری ہے' فرماتے ہیں: "اس کتاب کا اصل موضوع ترقی پسند فکر' ادب اور تحریک کا وہ سفر ہے جو ہماری چالیس سالہ تاریخ کا ناگزیر عنصر ہوتے ہوئے بھی آج ماضی سے کچھ زیادہ ہی بڑے طمطراق اور بلند بانگ لہجے کے ساتھ پاکستان سے غداری اور نمک حرامی بتایا جارہا ہے"۔

پروفیسر صاحب کی اس ژولیدہ بیانی سے ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ترقی پسندوں کو غداری اور نمک حرامی کا الزام بھی دیا جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے' ترقی پسند تحریک کے کسی بڑے سے بڑے مخالف نے بھی اس قسم کی کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ معلوم نہیں پروفیسر صاحب کو اس کا علم کیسے ہوا؟ شاید ذاتی علم کے زور پر انھوں نے یہ بات لکھی ہوگی' مگر ایسی باتوں سے اجتناب ہی کرنا چاہیے کیونکہ بعض سادہ لوح اس قسم کے بیانات کو اعترافات کا درجہ دے دیتے ہیں۔

(۲۲/ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

تحسینِ ناشناس

ناصر زیدی شاعری میں تو منفرد انداز رکھتے ہی تھے، مراسلہ نگاری میں بھی انھوں نے نئی راہ نکالی ہے۔ ان کے ہر خط کی پیشانی پر ان کی تصویر ہوتی ہے تا کہ مکتوب الیہ ہم جیسا ناخواندہ ہو تو صورت دیکھ کر خط کے مضمون کو سمجھ جائے۔ اور خط کا مضمون ایسا دلچسپ ہوتا ہے کہ وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی۔ کاش وہ غزل گوئی چھوڑ کر صرف مکتوب نگاری پر توجہ فرمائیں۔ ان کی غزلیں تو ساز اور منّی بیگم کی آواز کے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں لیکن مکاتیب سے محظوظ ہونے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنایا تھا، لیکن ناصر زیدی نے اچھا خاصا ڈراما بنا دیا ہے۔ ان کا تازہ ترین مراسلہ یا ڈراما ملاحظہ فرمایئے :

"۱۳ جون ۱۹۸۵ء کو نشر کیے جانے والے ٹی وی پروگرام 'نیلام گھر' میں منّی طارق عزیز نے نئے شادی شدہ جوڑوں میں سے خواتین کو اپنے پسندیدہ شعر سنانے کو کہا۔ ایک خاتون نے یہ شعر سنایا :

کھول کے بند دریچہ ناصر
ڈوبتے چاند کا منظر دیکھو

یہ شعر پسند کرنے کے انعام میں خاتون کو پانچ سو روپے کے پرائز بانڈ سے نوازا گیا۔ منّی طارق عزیز نے اس شعر کو تین بار ناصر کاظمی مرحوم سے منسوب کر کے مجھے اور میرے مداحوں کو ذہنی اذیت پہنچائی کیوں کہ یہ شعر میرا یعنی ناصر زیدی کا ہے۔ ایک بار احسان دانش مرحوم نے کہا تھا :

مشاعروں میں یہ اکثر ہوا ہے اے دانش
ہمارا شعر ہو اور مرحبا کسی کو ملے

میرے ساتھ یہی عمل ٹی وی والے مسلسل کر رہے ہیں کچھ عرصہ قبل میری ایک مشہور غزل :

تھوڑا سا مسکرا کے نگاہیں ملایئے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتایئے

منّی بیگم سے "محفلِ شب" میں گوا کر ناصر کاظمی سے منسوب کی گئی تھی۔ اور اب یہ شعر مرحوم کے نام کر دیا گیا ہے۔ میرے اسی شعر پر میرے اولین مجموعۂ غزل "ڈوبتے چاند کا منظر" کا نام بھی ہے اور اس مجموعے کا تعارف "نیلام گھر" ہی میں خود میری موجودگی میں آج سے آٹھ نو سال قبل مسمّی طارق عزیز نے یہ کہتے ہوئے کرایا تھا: "خوب صورت شاعر خوب صورت شاعری"۔ میرا یہ مجموعہ پروگرام کے کمپیئر مسمّی طارق عزیز، اسکرپٹ ایڈیٹر محبّی مدبر رضوی اور پروڈیوسر عزیزی تاجدار عادل کے پاس اسی زمانے سے موجود ہے اور مذکورہ مقطع والی غزل اس میں دیکھی جا سکتی ہے"۔

ناصر زیدی کی شاعری کی طرح ان کی شکایت بھی معقول ہے۔ طارق عزیز کو چاہیے کہ وہ اپنی ادبی استعداد میں کم از کم اتنا اضافہ ضرور کر لیں کہ انھیں ناصر زیدی اور ناصر کاظمی کا فرق معلوم ہو سکے۔ آج وہ ناصر زیدی کا شعر ناصر کاظمی کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں، کل اسی شعر کو وہ غالب اور میر سے منسوب کر سکتے ہیں۔ کیا نیلام گھر اِس لیے جاری کیا گیا ہے کہ ہمارے بڑے شاعروں کی عزت اور شہرت کو نیلام کیا جائے"؟

شعر سنانے والی خاتون کو پانچ سو روپے کے پرائز بانڈ انعام میں ملے تھے۔ ناصر زیدی نے اس کا ذکر طنزیہ لہجے میں کیا ہے، جیسے یہ خاتون انعام کی نہیں جرمانے کی مستحق ہوں۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا، آیندہ کے لیے طارق عزیز کو چاہیے کہ نیلام گھر میں شعر سنانے والوں کو پہلے سے بتا دیا کریں کہ ناصر زیدی کا شعر سنانے پر جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ مزید گزارش یہ ہے کہ جرمانے کی رقم ناصر زیدی کو دے دی جائے تا کہ انھیں یہ معلوم ہو کہ ان کی شاعری، دوسروں کے لیے نہ سہی، خود اُن کے لیے فائدے سے خالی نہیں۔

ناصر زیدی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ طارق عزیز نے اپنے طرزِ عمل سے ان کے مداحوں کو ذہنی اذیت پہنچائی ہے۔ اس اذیت میں ہم برابر کے شریک ہیں کیوں کہ ہم ناصر زیدی کے مداحوں میں شامل ہیں۔ طارق عزیز سے ہم یہ پوچھنے کی جسارت کریں گے کہ کیا اپنے مداحوں سے ناصر زیدی کے حُسنِ سلوک میں کوئی کمی رہ گئی تھی جو آپ بھی انھیں ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے میدان میں آ گئے"؟

ناصر زیدی کے مداح واقعی بڑی اذیت میں مبتلا ہیں۔ ایک تو اردو کے تمام اچھے شعر پہلے ہی سے دوسرے شاعروں سے منسوب ہیں' اور جو دو چار بُرے بھلے شعر خود ناصر زیدی نے بصد دقت تصنیف کیے تھے' وہ بھی دوسروں سے منسوب کیے جا رہے ہیں۔ اگر طارق عزیز اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو ہم مداحانِ ناصر زیدی اپنے سکونِ دل کی خاطر قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہو جائیں گے اور پھر دیکھیں گے کہ طارق عزیز ہماری دل آزاری کے لیے کس طرح من مانی کرتے ہیں۔

ناصر زیدی نے اس کی بھی شکایت کی ہے کہ آٹھ نو برس پہلے نیلام گھر کے ایک پروگرام میں ان کی موجودگی میں طارق عزیز نے ان کے مجموعۂ کلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا : "خوب صورت شاعر' خوب صورت شاعری"۔ شکایت کا لہجہ بتا رہا ہے کہ جنابِ شاعر تحسینِ ناشناس پر سکوتِ سخن شناس کو ترجیح دیتے ہیں۔ نیز وہ یہ جانتے ہیں کہ صورت شناس' معنی شناس نہیں ہوتا' اس لیے کسی شاعر کی شخصی جمالیات اور شعری جمالیات کا ساتھ ساتھ ذکر کرنا' شخص اور شاعر دونوں کو آزمائش میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ طارق عزیز اپنی خطابت کی اس سنگین (جمالیات کے حوالے سے رنگین) غلطی کا ازالہ کریں۔ کسی غلطی کے ازالے کے لیے آٹھ نو سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ طارق عزیز کا فرض ہے کہ وہ نیلام گھر میں ناصر زیدی کو دوبارہ مدعو کریں اور ان کی موجودگی میں اپنے سابقہ بیان پر دلی معذرت پیش کریں۔ طارق عزیز کو معلوم ہونا چاہیے کہ اپنی غلطی پر اڑے رہنا سمجھ دار لوگوں کا شیوہ نہیں۔ غلطی تسلیم کر لینا عظمت کی دلیل ہے۔ ہماری اس تجویز پر عمل کرنے کے بعد طارق عزیز کے پاس عظمت ہو نہ ہو اس کی دلیل ضرور ہو گی جو بوقتِ ضرورت کام آئے گی۔

ناصر زیدی نے اپنے خط کے آخری پیراگراف میں ٹی وی کے تین اہل کاروں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک "مسمّی" ہے دوسرا "محبّی" اور تیسرا "عزیزی"۔ اس فرق مراتب کے باوجود ناصر زیدی نے ان تینوں سے یکساں سلوک کیا ہے۔ یعنی انھیں اپنے دیوان کے ایک ایک نسخے سے نوازا ہے۔ افسوس کہ تینوں اہل کاروں نے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ انھیں معلوم ہو جاتا کہ مذکورہ شعر کس کی ملکیت ہے۔ ٹی وی کے اہل کاروں کی بد ذوقی اور ناخواندگی پر ہمیں حیرت ہے۔ جب یہ مفت ملنے والی کتابیں نہیں پڑھتے تو خرید کر کیا پڑھتے ہوں گے۔

آخر میں ہم ٹی وی کے اربابِ اقتدار سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے اہل کاروں کی مناسب

تربیت کریں تا کہ انھیں ادب کے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں معلوم ہو سکیں۔ اگر وہ کوئی غلطی کریں تو اس کی سزا ضرور دی جائے تا کہ وہ آیندہ کے لیے محتاط ہو جائیں۔ طارق عزیز سے ناصر زیدی کے سلسلے میں جو غلطی ہوئی ہے اس کی سزا ہم تجویز کیے دیتے ہیں۔ موصوف کے لیے لازم قرار دیا جائے کہ وہ ناصر زیدی کے تمام مجموعوں کا اول تا آخر یعنی لفظ بلفظ بلکہ تحت الفظ و بعد ازاں ترنم سے مطالعہ کریں اور پھر بہ شرطِ ہمت و سلامتی نیلام گھر میں ان کے پانچ اچھے شعر اپنے ناظرین کو سنائیں۔ اگر ناصر زیدی کے مجموعوں سے اس مقصد کے لیے اشعار دستیاب نہ ہو سکیں تو غالب کے شعر ناصر زیدی سے منسوب کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ غالب اور ناصر زیدی کے کلام میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں ایک ہی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، بس ذرا لفظوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔

(۲۶ر جولائی ۱۹۸۵ء)

ریختی اور ریختہ

سعادت یار خاں رنگین کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا۔ وہی مشہور شاعر جس نے انشاء اللہ خان انشا کی رفاقت میں ریختی میں نام پیدا کیا اور اِس قسم کے شعر کہہ کر عوام کے دلوں اور ادب کی تاریخ میں اپنے لیے جگہ بنائی:

جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو
ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

اِن سعادت یار خان رنگین کے خاندان میں، رنگین کی وفات کے تقریباً نوے برس بعد ایک بچہ پیدا ہوا جس نے اپنے جدِّ امجد کی طرح ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ فرق یہ ہے کہ رنگین ریختی کے استاد تھے اور بچہ استادِ ریختہ کے منصب پر فائز ہوا۔ والدین نے اُس کا جو نام رکھا تھا، اُس میں تخلص کا اضافہ اِس عزیز نے خود کرلیا اور چودہ برس کی عمر میں جب وہ احسان دانش کے حلقۂ شاگرداں میں شامل ہوا تو اُس نے اپنا تعارف سید محمد انور نرگس بخاری کی حیثیت سے کرایا۔ احسان دانش نے کہا: "بھلا نرگس بھی کسی مرد کا تخلص ہوتا ہے"؟ یوسف ظفر کی تجویز پر نیا تخلص منتخب کیا گیا اور پھر یہ شاعر آگے چل کر شہرت بخاری کے نام سے مشہور ہوا۔

شہرت بخاری قیامِ پاکستان کے بعد اُبھرنے والے غزل گو شاعروں میں اِس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے صنفِ غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو مزید گرنے سے بچایا اور کلاسیکی انداز میں چند اچھی غزلیں لکھیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اپنے گہرے دوست ناصر کاظمی کی طرح غزل میں کوئی

منفرد انداز پیدا نہ کر سکے۔ اِس میں شہرت بخاری کا کوئی قصور نہیں۔ غزل ہی ایسی کڈھب صنفِ سخن ہے کہ اِس میں کوئی الگ راستہ نکالنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ ایک ہی راستے پر چلتے رہنا غزل گو شاعروں کی مجبوری ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر اِس مجبوری کی حدود میں رہتے ہوئے کس حد تک "مختاری کی تہمت" اٹھاتا ہے۔ شہرت بخاری کے ہاں سات آٹھ شعر ایسے ضرور ملتے ہیں جو اُن کی خوش گوئی اور خوش ذوقی کی دلیل کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ اِس پر حیران ہوں کہ اتنے مشہور شاعر کے ہاں کام کے صرف سات آٹھ شعر ملتے ہیں۔ ہمارے نزدیک حیران ہونے کی بات یہ ہے کہ سات آٹھ شعر بھی کس طرح دست یاب ہو گئے جب کہ شہرت بخاری کے جدِّ امجد سعادت یار خان رنگین نے تقریباً ایک لاکھ شعر کہے مگر اُن میں کام کا ایک بھی نہیں۔ ہاں مزے کے شعر ملتے ہیں جن میں سے دو اوپر درج کیے گئے ہیں۔ شہرت بخاری نے اِس طرف توجہ نہیں کی ورنہ وہ بھی "مزے دار" شاعر بن سکتے تھے۔

سات آٹھ شعروں کے ساتھ ایک اور چیز بھی شہرت بخاری کا نام زندہ رکھے گی اور وہ ہے اُن کی تصنیف "کھوئے ہوؤں کی جستجو"۔ یہ ضخیم کتاب یادوں اور یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ شہرت بخاری نے اپنے حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں اور اپنے حوالے سے بعض شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کا نام اُس کے موضوع سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔ شہرت بخاری نے بعض گمشدہ شخصیات ہی کو نہیں، اپنے آپ کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسروں کو تو کسی حد تک تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اپنا سراغ نہیں لگا سکے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس جہت میں تلاش کرنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

آپ بیتی لکھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لکھنے والے کا حافظہ قابلِ اعتماد ہو۔ شہرت بخاری اِس شرط کو پورا نہیں کرتے۔ اِس سلسلے میں خود موصوف کا تحریر کردہ ایک واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ایک مرتبہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ فلم دیکھنے کے بعد ------ "میں اُس کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوا، چلتا رہا، پھر میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے جھٹکے سے چھڑایا۔ میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اب جو دیکھا تو میرے سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہ کوئی اور خاتون تھی۔ وہ بولی تو کچھ نہیں مگر اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا..... ایسا صرف اِس لیے ہوا کہ مجھے یاد نہیں تھا کہ اُس کے کپڑوں کا رنگ کیا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر میں کیسے

اپنی نظر پر اعتماد کر سکتا ہوں اور ایسی چیزوں کے بارے میں کیوں کر یقین کر سکتا ہوں جن کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں"۔

یہ اعتراف حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم اِس پر صرف اِس قدر اضافہ کریں گے کہ جو شخص اپنی بیوی کو کپڑوں کے رنگ سے پہچانتا ہو' اور یہ رنگ بھی اُسے یاد نہ رہے تو ایسے شخص کو صرف شعر کہنے چاہییں' وقائع نگاری نہیں کرنی چاہیے۔

شہرت بخاری نے یوں تو اِس کتاب کو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ذیلی فصلیں بھی قائم کی ہیں' لیکن مواد کے اعتبار سے کوئی خاص ترتیب نظر نہیں آتی۔ جو واقعہ جہاں یاد آیا' لکھ دیا اور اگر دوبارہ یاد آگیا تو تب بھی لکھنے میں تکلّف نہیں کیا۔ بعض ابواب مکمل طور پر شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ یہی شخصی خاکے اِس کتاب کی جان ہیں۔ کاش شہرت بخاری آپ بیتی کے چکّر میں نہ پڑتے صرف شخصی خاکے لکھتے۔ سید عابد علی عابد' یوسف ظفر' احسان دانش' ناصر کاظمی اور بعض غیر معروف لوگوں کے بارے میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے' اِس سے اُن شخصیات کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اپنے گھریلو ملازم (مختار) کا جو خاکہ اُنھوں نے لکھا ہے' اُسے اردو کے اچھے شخصی خاکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

شہرت بخاری کو خوابوں سے اور محیّر العقول واقعات سے خاصی دلچسپی ہے۔ جہاں حافظہ بالکل ساتھ چھوڑ دیتا ہے' وہاں وہ خواب نگاری فرماتے ہیں اور جہاں خواب بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' وہاں اپنے اور دوسروں کے محیّر العقول واقعات تحریر کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس قسم کے ایک طویل واقعے کا کچھ حصہ آپ بھی سنیے ------- "مڑ کر دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گنوار سا مرد سر پر یہ بڑا سا گٹھا اُٹھائے مسجد میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک بیل تھا..... یہ حیران ہوئے کہ کیسا بد تمیز انسان ہے کہ بیل کو مسجد میں لیے آرہا ہے۔ پھر جو دیکھا تو ایک عورت' اُس کے سر پر بھی بڑی سی گٹھڑی' ایک بچے کو انگلی سے لگائے داخل ہوئی۔ یہ تینوں اُن سے چند گز کے فاصلے پر آکر بیٹھ گئے۔ مرد نے پگڑا تارا اور بیوی سے کہا: "بھوک لگی ہے سخت"۔ اُس نے کہا: "گٹھڑ میں روٹیاں ہیں' کھالے"۔ گٹھڑ کھولا تو اُس میں سیکڑوں روٹیاں۔ وہ چند نوالوں میں کھا گیا۔ پھر کہا: "بھوک ابھی ختم نہیں ہوئی"۔ اُس نے گٹھڑی کھولی۔ اُس میں بھی لاتعداد روٹیاں..... وہ اُنھیں بھی چٹ کر گیا۔ مگر اُس کی بھوک قائم تھی..... اُس نے بیل کو گرایا' چھری پھیری' چند ہی منٹ میں کچا چٹ کر گیا۔ کہنے

لگا: "معلوم نہیں کیا بات ہے' آج پیٹ ہی نہیں بھر رہا"۔ عورت نے غصے میں کہا: "اب کہاں سے لاؤں' یہ مردوا بیٹھا ہے' اِس سے تیرا پیٹ بھر جائے گا"۔ اُس نے خوش ہو کر کہا: "ارے ہاں تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا' یہ تو بڑے مزے کا ہو گا....."

اِس واقعے کے مرکزی کردار کی طرح شہرت بخاری نے بھی بعض عزت داروں کی عزت سے پیٹ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً بعض اہلِ علم کے بارے میں اُنھوں نے جو لغو اور بے سروپا باتیں لکھی ہیں' اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا غزل گوئی کی طرح کردار کشی کے فن میں بھی طاق ہے۔ کتاب لکھتے وقت موصوف کو اِس کا احساس نہیں تھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں' شاید کتاب پڑھتے وقت ہو جائے۔ لیکن اِس کی توقع ذرا کم ہی ہے کیوں کہ جناب شہرت کے بارے میں سنا ہے کہ وہ لکھنے کے معاملے میں نہ سہی' پڑھنے کے معاملے میں خاصا بلند معیار رکھتے ہیں۔

وہ اپنی نازیبا باتوں پر معذرت طلب کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جس کا اندازہ اِس واقعے سے کیا جا سکتا ہے۔ "اہلِ پشاور کے کیا کہنے' ایسے مہمان نواز لوگ تو شاید ہی کسی شہر میں ملتے ہیں۔ پردیسی سے اُن کا سلوک خاص ہوتا ہے۔ اُس کی زیادتیوں کو بھی برداشت کر جاتے ہیں۔ دائرۂ ادبیہ کی ایک نشست میں کسی مسئلے پر بات ہو رہی تھی.... میرے منھ سے کوئی نازیبا بات نکل گئی۔ سید ضیا جعفری مرحوم اکڑ گئے۔ غصے سے اُن کا چہرہ تمتما اٹھا.... کمال ضبط کے بعد سید صاحب نے صرف اتنا کہا: "شاہ صاحب اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آپ سید ہیں اور پردیسی بھی' تو میرا چاقو آپ کے دل میں اُتر جاتا.... میں نے معذرت چاہی اور کہا کہ میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ لفظ سنتے ہی جعفری صاحب کھڑے ہو گئے' میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور گلے لگاتے ہوئے کہا: "آدمی کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے"۔

اگر سید ضیا جعفری زندہ ہوتے تو وہ شہرت بخاری کی کتاب کے بعض حصے پڑھ کر یہ ضرور کہتے: "آدمی کو سوچ سمجھ کر بات لکھنی چاہیے"۔

اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں شہرت بخاری نے دلچسپ باتیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً جس زمانے میں وہ "مجلسِ زبانِ دفتری" میں ملازم تھے' وہاں اُن کی مصروفیات کی تفصیل اُنھیں کی زبان سے سنیے: "میں نے تقریباً چار برس ملازمت کی جو برائے نام تھی۔ اتنا آرام زندگی میں کہیں حاصل نہیں ہوا۔ اِس محکمے کا کام ایک ایسا لغات تیار کرنا تھا جو اردو کے سرکاری زبان بننے میں مد ثابت ہو سکے.... مگر میرا کام یہ تھا کہ میں صبح دفتر جاؤں' تھوڑی دیر اِدھر اُدھر پھروں' دیگر مترجمین

سے اِدھر اُدھر کی ہانکوں، چائے پیوں اور میز پر پڑ کر سو جاؤں، دوپہر کو اُٹھوں کھانا کھانے گھر جاؤں اور پھر اکثر واپس نہ آؤں" ---- حیرت ہے کہ شہرت بخاری کی قابلِ رشک کارکردگی کے باوجود اردو اب تک سرکاری زبان نہیں بن سکی!

مجلسِ دفتری زبان تو شاید اب موجود نہیں، لیکن کروڑوں روپے کی سرکاری امداد حاصل کرنے والے کئی اردو اداروں میں آج بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو کبھی مجلسِ دفتری زبان میں ہوتا تھا۔ اردو کا تو کوئی کام نہیں ہوتا، بہت سے "اردو دوستوں" کو اِدھر اُدھر کی ہانکنے اور دفتری میزوں کے اوپر اور نیچے لمبی تان کر سونے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

اور اب آخر میں ایک دلچسپ اقتباس: "ماں کے پیار کی طلب مجھ میں اب تک اتنی شدید ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اِس کا کیا علاج کروں۔ کبھی کبھی جب فرخندہ (بیوی) موڈ میں ہوتی تھی تو میں اُس کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹ جاتا تھا۔ اب تو یہ موقع بھی فراہم نہیں ہوتا۔ بچے ہر وقت چوکیداری کرتے ہیں۔ وہ کم بخت پل بھر کو تنہائی نہیں دیتے۔ اُنھیں معلوم ہی نہیں کہ اُن کا باپ ابھی تک ایک منّا سا بچّہ ہے، بالکل منّا سا..."

آخری بات بچوں کو معلوم نہ سہی، کتاب پڑھنے والے ہم جیسے پیرانِ نابالغ کو تو معلوم ہے۔

(۱۴/ مئی ۱۹۸۷ء)

شرحِ ناخواندگی میں اضافہ

جن دو چار لکھنے والوں کے بارے میں ہم بادلِ ناخواستہ اچھی رائے رکھتے ہیں' ان میں انیس ناگی بھی شامل ہیں۔ بادلِ ناخواستہ اس لیے کہ جب کبھی ہم کسی لکھنے والے کے متعلق اچھی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو ہمارے پڑھنے والوں کی رائے ہمارے بارے میں مزید خراب ہو جاتی ہے' لہٰذا ہم عام طور پر احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے محتاط ہونے کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہم نے آج تک میر و غالب کی تعریف سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ غیر محتاط ہونے کا ثبوت آپ کے سامنے ہے کہ آج کے کالم کا پہلا جملہ انیس ناگی کی تعریف میں ہے اور باقی کالم بھی اسی رنگ میں لکھنے کا ارادہ ہے' بہ شرطے کہ کوئی مصلحت مانع نہ ہوئی۔

انیس ناگی میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں جن کا علم انھیں کو ہو گا لیکن تین خوبیوں کا ہمیں بھی علم ہے۔ پہلی یہ کہ وہ دوسروں کے حوالے سے بات نہیں کرتے' اپنی بات کہتے ہیں اور اپنے انداز میں۔ شاعری ہو فکشن یا تنقید' ان کے ہاں تقلید یا روش عام کی پیروی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے زندگی کی چھوٹی بڑی حقیقتوں کو فکری سطح پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں اسلوب کا کھردرا پن ضرور ملتا ہے لیکن یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہو تو بھی وہ بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔

انیس ناگی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ عالمی ادب سے ان کی گہری شناسائی ہے۔ انھوں نے عالمی ادب کے کئی عمدہ نمونوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ ترجمے اتنے اچھے ہیں کہ انھیں دیکھ کر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انیس ناگی کو طبع زاد کاروبار بند کر کے صرف تراجم پیش کرنے چاہییں۔ وہ اس طرح بہتر طور پر ادب کی خدمت کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں

ہے۔ انیس ناگی کو تراجم کے ساتھ ساتھ طبع زاد کام بھی کرتے رہنا چاہیے تاکہ انھیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ ادب کے عالمی معیار تک پہنچنے میں ہمیں کتنی صدیاں درکار ہوں گی۔

انیس ناگی کی تیسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب خود ہی لکھتے ہیں کہ اتنی تیز رفتاری سے کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ خود ہی چھاپتے ہیں کہ اتنی جلدی کوئی دوسرا نہیں چھاپ سکتا۔ مقتدرہ قومی زبان نے شرر، عزیز احمد اور منٹو وغیرہ کی کتابیات شائع کی ہیں، اسی طرح اگر انیس ناگی کی کتابیات بھی شائع ہو جاتی تو ہم ان کی کتابوں کی صحیح تعداد بتا سکتے تھے۔ فی الحال قیاساً" ہی عرض کیا جا سکا ہے کہ وہ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے کتابوں کی تعداد کچھ زیادہ نظر آتی ہے، لیکن کتابوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ موصوف نے بہت کم لکھا ہے۔ وہ چاہتے تو اس فرصتِ عمر میں بلا تکلف اتنی ہی اور کتابیں بھی لکھ سکتے تھے اور ہماری شرح ناخواندگی میں دگنا اضافہ کر سکتے تھے۔ قومی سطح پر ہماری شرحِ خواندگی بہت کم ہے لیکن یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ انیس ناگی کی کتابوں کی وجہ سے ہماری شرحِ ناخواندگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پچھلے مہینے انیس ناگی کی کئی کتابیں ایک ساتھ شائع ہوئی ہیں تو ہم نے ان کی تلاش میں کراچی کی کتابوں کی تمام دکانوں کی سیر کر ڈالی۔ خاصی مشکل سے ایک دکان سے ان کی دو کتابیں ملیں۔ ہم نے جب بڑے اشتیاق سے ان کتابوں کو خریدا تو دکان دار نے حیرت سے ہمیں دیکھا۔ ہم نے اس حیرت کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا: "یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کی کتابیں کس قسم کے لوگ خریدتے ہیں"۔ اس غیر متوقع صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ابھی پر تول ہی رہے تھے کہ دکان دار نے نہایت دردناک لہجے میں کہا۔ "ان کتابوں کا ایک ایک نسخہ میرے پاس اور بھی ہے، وہ بھی آپ لے جایئے"۔ دکان دار کی یہ خواہش ہم ضرور پوری کر دیتے لیکن کتابوں کی قیمتیں اتنی زیادہ تھیں کہ دکان دار پر رحم کھانے کے بعد خود ہماری حالت قابلِ رحم ہو جاتی۔

"بے خوابی کی نظمیں" ۸۰ صفحوں کی کتاب ہے۔ ۶۸ صفحے نظموں کے ہیں جن میں سے ہر صفحہ نصف کے قریب خالی ہے۔ آخری ۱۲ صفحوں میں انیس ناگی کی شاعری پر اصغر ندیم سید کا مضمون ہے۔ ان ۱۲ صفحوں کو بھی خالی سمجھا جائے تو قاری کے ہاتھ بمشکل ۴۰ صفحے آتے ہیں۔ گویا ۴۰ روپے میں ۴۰ صفحے۔ اشیائے ضرورت کی حد تک مہنگائی کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن شاعری

کون سی کھانے پینے اور اوڑھنے کی چیز ہے کہ اسے اتنا مہنگا بیچا جائے۔ کتاب کا نام "بے خوابی کی نظمیں" شاید اسی رعایت سے رکھا گیا ہے کہ خریدنے والوں کی نیند اُڑ جائے گی۔ لیکن ہم خریداروں سے گزارش کریں گے کہ وہ کتاب کی قیمت کی وجہ سے بے خوابی کا شکار نہ ہوں بلکہ نظموں کی خواب آور فضا سے محظوظ ہوں۔ اس مجموعے میں انیس ناگی کی کئی خوبصورت نظمیں شامل ہیں۔

انیس ناگی کی دوسری کتاب "غالب ایک شاعر' ایک اداکار" ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں بڑے بڑے دعوے کیے گئے ہیں۔ غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے' انیس ناگی اسے سوختنی قرار دیتے ہیں اور خود انیس ناگی نے جو کچھ لکھا ہے اسے صحیح مان لیا جائے تو غالب گردن زدنی قرار پاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں جو غالب میں موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ "میگیلو مینیا" میں مبتلا بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں مریض خبطِ عظمت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو وہ کچھ سمجھنے لگتا ہے جو وہ نہیں ہوتا۔ اپنی تعریف مبالغہ آرائی سے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انیس ناگی نے سب سے بڑی دلیل یہ دی ہے کہ غالب نے اپنی کتاب "پنج آہنگ" کا منظوم اشتہار لکھ کر خود تشہیری کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ خود تشہیری اگر جرم ہے تو انیس ناگی کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے عہد کے تقریباً تمام ادیب غالب سے بڑھ کر جرائم پیشہ ہیں۔ وہ اپنی تعریف میں خود ہی نہیں لکھتے' دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں اور اس قسم کی گمراہ کن تحریروں کو بڑے فخر سے اپنی کتابوں میں شامل کرتے ہیں۔

انیس ناگی کا خیال ہے کہ غالب کے اپنی بیوی سے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ دلیل یہ دی کہ دن بھر تو غالب قلعۂ معلّٰی میں رہتے تھے اور شام کو شراب پیتے اور دوستوں سے گپ بازی کرتے تھے۔ استاد لاغر مراد آبادی نے یہ سن کر فرمایا: "یہ عجیب و غریب منطق ہے۔ آج کل کے اکثر ادیب صبح سے شام تک دفتروں میں رہتے ہیں اور پھر رات کے ایک بجے تک پاک ٹی ہاؤس قسم کے ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں۔ کیا ان سب کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ ان کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار ہے"؟ استادِ گرامی کے اس سوال کا جواب انیس ناگی ہی دے سکتے ہیں۔ دو بڑوں کے درمیان بحث میں دخل دینے کی ہم جسارت نہیں کر سکتے۔

انیس ناگی نے غالب پر جو فردِ جرم عائد کی ہے وہ یہ ہے:

۱ ۔ وہ خود غرض اور خود پرست تھے۔ کھانا کھاتے وقت کوئی مہمان گھر میں آجاتا تو اُسے کھانے کے لیے نہ پوچھتے۔ اگر وہ قیام کی غرض سے آتا تو کسی اور کے گھر ٹھہرا دیتے۔

۲ ۔ ان کا تاریخ اور سوشیالوجی مطالعہ ناقص تھا۔

۳ ۔ وہ پیشہ ور شاعر تھے جو اپنے ہر قصیدے کا معاوضہ اور ہر غزل کی داد چاہتے تھے۔

۴ ۔ میرن صاحب اور میر مہدی مجروح جیسے نابالغ اور ناپختہ چھوکروں سے گپ بازی کرتے تھے۔

۵ ۔ وہ ایک شاعر اداکار تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک شاعر کی داخلیت بھی تھی اور ایک اداکار کی نمایش پسندی بھی۔

۶ ۔ وہ شاعری کی تخلیق کے لیے مالی آسودگی کو ایک شرط تصور کرتے تھے۔

انیس ناگی نے یہ فردِ جرم بہت سوچ سمجھ کے اور بڑی محنت سے تیار کی ہے جس کی تائید بلا سوچے سمجھے اور بغیر کسی محنت کے کی جاسکتی ہے۔ غالب کے اداکار ہونے میں کیا شک ہے۔ وہ کئی فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ سہراب مودی والی فلم تو عالمی شہرت رکھتی ہے جس میں غالب نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بے مثال مظاہرہ کیا ہے۔ اس فلم میں کام کرنے کا غالب کو خاصا معقول معاوضہ ملا تھا۔ اسی معاوضے کی رقم سے سہراب مودی نے مرزا غالب کے مزار کی موجودہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔

غالب کے مطالعے کے ناقص ہونے والی بات بھی درست ہے۔ تاریخ اور سوشیالوجی تو کیا' وہ ساختیات تک سے ناواقف تھے۔ حالانکہ وہ بآسانی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے اس علم کی ابتدائی باتیں معلوم کر سکتے تھے۔ افسوس کہ غالب نے اپنے ہی شہر کے ایک بڑے عالم کے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ جبکہ ایک عالم ڈاکٹر صاحب کے علم سے فیض یاب بلکہ سیراب ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ علم کا دریا ہیں' جب اس دریا میں سیلاب آتا ہے تو بستیوں کی بستیاں سیراب ہو جاتی ہیں۔ غالب کی بدقسمتی ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر نارنگ کے دریائے علم کو دریائے معاصی سمجھ کر اپنا سرِدامن بھی تر نہ کیا۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ غالب تو ڈاکٹر نارنگ کی پیدائش سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے پھر وہ ڈاکٹر صاحب سے ساختیات کا علم کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ جب غالب مرنے کے بعد فلموں میں کام کر سکتے ہیں تو ڈاکٹر نارنگ کے سامنے

زانوے تلمذ کیوں نہیں تہ کر سکتے؟

انیس ناگی نے غالب کی نثر پر جو مضمون لکھا ہے' اس کا حاصل یہ ہے: "غالب عظیم الشان نثر تخلیق کرتے جو اکثر حالتوں میں نثری نظم میں منتقل ہو جاتی ہے"۔ ہمارا خیال ہے کہ انیس ناگی کو اتنی سنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ غالب لاکھ گناہ گار سہی' برا آدمی سہی' لیکن اتنی بڑی سزا کا ہرگز مستحق نہیں تھا کہ اس کی نثر کو نثری نظم میں منتقل کر دیا جائے۔

اس کتاب میں انیس ناگی نے بعض انکشافات بھی کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ غالب کی اردو کلیات غدر سے پہلے شائع ہو گئی تھی۔ حیرت ہے کہ ماہرینِ غالبیات میں سے کسی کو اس کلیات کی اشاعت کا علم نہیں ہے۔ اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے:

"کلکتے میں غالب کے قیام کے دوران ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ وہ ان کا قتیل کے شاگردوں سے ادبی مجادلہ تھا۔ یہ وہ لایعنی واقعہ تھا جو تنازعے کی صورت میں عمر بھر غالب کے اعصاب پر سوار رہا۔ بعد کے ادبی تذکروں میں اس تنازعے کا بہت چرچا رہا۔ برہانِ قاطع' قاطعِ برہان اور اس قسم کی بے کار سی کتابیں فریقین نے تحریر کیں"۔

یہ اقتباس پڑھ کر ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ:

۱۔ کلکتے میں قتیل کے شاگردوں سے معرکہ آرائی کا برہان قاطع والے جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں' دونوں الگ الگ جھگڑے ہیں' پہلا ۲۹-۱۸۲۸ء کا ہے اور دوسرا ۱۸۵۷ء کے چار پانچ سال بعد کا۔

۲۔ فریقین نے جو کتابیں لکھیں ان میں "برہانِ قاطع" کا نام شامل کرنا لاعلمی کی انتہا ہے۔ یہ کتاب تو غالب کی پیدائش سے پورے ڈیڑھ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔

۳۔ برہانِ قاطع اور قاطعِ برہان کو بے کار سی کتابیں وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے ان کتابوں کو پڑھا نہ ہوتا' کم سے کم دیکھا ہوتا!

ہمیں ان باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ بال کی کھال نکالنا محققوں کا کام ہے' تخلیقی ذہن رکھنے والوں کا نہیں۔ جب دارالسلطنت کلکتے سے دہلی منتقل ہو سکتا ہے تو پھر غالب اور قتیل کے شاگردوں کا جھگڑا بھی کلکتے سے دہلی منتقل ہو سکتا ہے۔ جب برہانِ قاطع کے جھگڑے کے بارے میں ڈیڑھ سو سال بعد انیس ناگی کوئی رائے دے سکتے ہیں تو غالب کی پیدائش سے ڈیڑھ سو سال پہلے اس جھگڑے

سے متعلق کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی جاسکتی؟ یہ بات بھی درست نہیں کہ کسی کتاب کو بے کار قرار دینے کے لیے اس کا پڑھنا یا دیکھنا ضروری ہے۔ جو کتاب ہم نے پڑھی نہیں یا دیکھی نہیں، اس کے بے کار ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اگر وہ کام کی کتاب ہوتی تو ہماری نظر سے ضرور گزرتی۔

انیس ناگی کی زیرِ نظر کتاب کا دیباچہ سعادت سعید نے لکھا ہے جس میں ازراہِ سعادت مندی اس کتاب کو غالبیات میں اہم اضافہ قرار دیا گیا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں سعادت سعید دیباچہ لکھنے کی بجائے اگر کتاب کی پروف ریڈنگ کر لیتے تو اچھا تھا، اس لیے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ہو گا جس پر کتابت کی دو چار غلطیاں نہ ہوں۔ مثلاً کلبیت کی جگہ قلبیت اور بحث و تمحیص کی جگہ بحث و تمحیث جیسی غلطیاں کثرت سے ملتی ہیں۔ شبہہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نئے خیالات اپنے ساتھ ایک نیا نظامِ املا بھی لے کر آئے ہیں۔ سعادت سعید کے دیباچے میں بھی اصل کتاب کی پیروی ملتی ہے۔ مثلاً ایک جملہ ہے "ہمیں یہ کہنے میں باق نہیں ہے"۔ اس میں لفظ "باق" دیباچہ نگار کی "بے باقی" کا عمدہ نمونہ ہے۔ اگر یہ سب کچھ عمداً نہیں ہے تو اِس مفید کتاب کا غلط نامہ ضرور تیار ہونا چاہیے۔ اگر غلط نامے کی ضخامت اصل کتاب سے بڑھ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کتاب کا اپنا مزہ ہے اور غلط نامے کا اپنا مزہ ہو گا۔

(۱۳/ اگست ۱۹۸۷ء)

شہرت اور شاعری کی دوڑ

پچھلے دنوں ایک مشہور شاعر سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے یوں ہی اخلاقاً ان سے پوچھ لیا: "بہت دنوں سے آپ کی کوئی تخلیق نظر سے نہیں گزری"۔ انھوں نے ہمیں یوں گھور کر دیکھا جیسے ہم نے کسی بداخلاقی کا ارتکاب کیا ہو۔ پھر قدرے غصے سے فرمایا : "معلوم ہوتا ہے اخبارات آپ کی نظر سے نہیں گزرتے"۔ ہم خاموش رہے۔ انھوں نے ہماری خاموشی کو لاعلمی تصور کرتے ہوئے اس کے ازالے کے لیے فرمایا : "اگر آپ اخبارات دیکھتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اس سال سب سے زیادہ تخلیقی کام میں نے کیا ہے۔ میرے سات انٹرویو چھپے ہیں۔ بائیس خبریں میرے حوالے سے شائع ہوئی ہیں' اور بے شمار ادبی رپورٹوں میں میرا ذکر موجود ہے"۔

اب ہمارا خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ عرض کیا : "یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ بتایئے کہ آپ کی کوئی نظم یا غزل بھی شائع ہوئی"؟ انھوں نے فرمایا : "نظم یا غزل کی اشاعت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصل چیز یہ ہے کہ خود شاعر شائع ہو۔ اب یہی سب سے بڑا تخلیقی کام ہے"۔

بات سچی تھی' اس لیے ہم نے بحث کو آگے نہ بڑھایا۔ بحث کو ہم آگے بڑھا بھی کیسے سکتے تھے کہ پچھلے دو مہینوں میں شاعرہ پروین شاکر کے بارے میں اخبارات میں اتنا کچھ شائع ہوا ہے جس سے ہمیں یقین آچکا ہے کہ اب فن سے زیادہ فن کار کی اہمیت ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو شاعرۂ موصوفہ سلمہا کی تین درجن سے زیادہ رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصویریں' اتنی ہی ان کے حوالے سے خبریں اور ادبی رپورٹیں اور پانچ چھ انٹرویو ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس دشت کی سیاحی کچھ افتخار عارف ہی کو راس آئی ہے' لیکن اب معلوم ہوا کہ افتخار عارف شاعری اور مشاعروں میں کتنے ہی آگے نکل جائیں' پبلک ریلیشننگ میں ابھی گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔

انھیں تو تصویر کھنچوانے کا ڈھنگ نہیں آتا تو چھپوانے کا کیا آئے گا۔

یہ بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ اب تک افتخار عارف کی جتنی تصویریں بھی ہماری نظر سے گزری ہیں، ان میں وہ شرمائے شرمائے سے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ساری تصویریں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کھینچی ہوں۔ لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ڈاکٹر نارنگ تصویریں نہیں کھینچتے، دامنِ تنقید کو حریفانہ کھینچتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے افتخار عارف کی جو تصویریں دیکھی ہیں، وہ ان کی شاعری پر ڈاکٹر نارنگ کے مضمون کی اشاعت کے بعد کی ہوں۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ تمہید خاصی طویل ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ یہ کالم تمہید ہی تمہید میں اپنے انجام کو پہنچے، ہمیں اپنے موضوع کے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔

حال ہی میں ایک اخبار میں پروین شاکر کا ایک دلچسپ انٹرویو چھپا ہے، اتنا دلچسپ کہ اس کے سامنے شاعرہ کا تازہ مجموعہ "خود کلامی" اچھی خاصی "تلخ کلامی" نظر آتا ہے۔

محترمہ سے پہلا سوال امجد اسلام امجد نے کیا جو یہ تھا : "قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں کو ادبی حوالے سے شہرت ملی ان میں پروین شاکر کا نام سرفہرست ہے۔ سو مجھے پروین شاکر سے پوچھنا یہ ہے کہ آپ کا جو فنی ارتقا ہے اس میں یہ دباؤ یا پریشر جو شہرت کا ہوتا ہے، اس نے آپ کو کہاں تک مدد دی ہے"۔

اگر سائل یعنی دستِ سوال دراز کرنے والے ہم ہوتے تو "قیامِ پاکستان" کی بجائے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بات شروع کرتے کیوں کہ ہماری سیاسی جدوجہد کا آغاز ۱۸۵۷ء ہی سے ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان تو اس جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان کو حد قرار دینے سے شہرت کا دورانیہ مختصر ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد فلاں شاعر سے بہتر شاعر پیدا نہیں ہوا، تو اس بات میں اتنا اثر نہیں ہو گا جتنا اس میں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد فلاں شاعر سے بہتر.....

خیر یہ تو ایک نظریاتی بحث تھی، ہمیں امجد اسلام امجد کا سوال پسند آیا، شہرت کے دباؤ کے تحت شاعری کرنا بالکل نئی بات ہے۔ یہ تو سنا تھا کہ بعض لوگ حالات کے دباؤ کے تحت غلط کام کرتے ہیں، یہ اب معلوم ہوا کہ شہرت کے دباؤ کے تحت بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد اب آپ شاعرہ کا جواب ملاحظہ فرمائیے : "میرے خیال میں شہرت ذرا پہلے میرے گھر چل کر

آگئی تھی' اس کو دیر سے آنا چاہیے تھا.... جلدی شہرت ملنے میں نفع و نقصان دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ فائدے کا پلہ بھاری رہتا ہے"۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کہ شہرت کو دیر سے آنا چاہیے تھا۔ اگر شہرت دیر سے آتی تو شاعری بھی دیر سے شروع ہوتی۔ مجموعے بھی دیر سے چھپتے۔ گویا معاملہ بیسویں صدی کے اختتام یا اکیسویں صدی کے شروع تک پہنچ جاتا۔ ظاہر ہے اس وقت تک ہم جیسے عمر رسیدہ اور سرد و گرمِ زمانہ چشیدہ شائقینِ ادب کی دائمی مفارقت کو ایک عرصہ گزر چکا ہوتا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبل از وقت شہرت سے ادب کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو' ہم جیسے شائقینِ ادب کو ضرور یہ فائدہ پہنچا ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہرت کا دباؤ کیا ہوتا ہے اور شہرت اور شاعری کی دوڑ میں شہرت کس طرح آگے نکل جاتی ہے۔

رہی نفع و نقصان کی بات تو ہماری رائے یہ ہے کہ جب خود شاعری ہی نفع بخش کام نہیں ہے تو اس کے ذریعے حاصل کی ہوئی شہرت کو نفع و نقصان کے پیمانوں سے ناپنا درست نہیں۔ شہرت کے سلسلے میں ہمیشہ یہی اصول ہونا چاہیے کہ جیسی ملے' جہاں سے ملے' جس قدر ملے' قبول کر لینی چاہیے۔

ایک سوال کے جواب میں شاعرہ نے کہا : "بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے شاعر بڑے غیر ذمہ دار ہیں۔ گھر میں بھی اور باہر بھی۔ اسی وجہ سے ان کا امیج خراب ہوا ہے"۔ ہم شاعر نہیں ہیں' لہٰذا اس الزام کی تائید یا تردید کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ تاہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ محترمہ اگر اپنی برادری کے بارے میں اتنی سخت الزام تراشی سے اجتناب کرتیں تو بہتر تھا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم بعض شاعروں کو جانتے ہیں جو اس حد تک ذمہ دار ہیں کہ گھر میں یا گھر سے باہر اپنی کسی حرکت سے شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری سے بھی ان کے شاعر ہونے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے سوال کیا : "آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ.... آپ کالج کی لڑکیوں کی شاعرہ ہیں۔ اگر اس کو آپ کی شاعری پر بطور لیبل چسپاں کیا جائے تو آپ اس سے کس قدر متفق ہیں"۔ شاعرہ نے اس کا جواب دیا: "خوشبو میں زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جو نوجوان نسل کی نمایندگی کرتی ہیں' لیکن جو اس کے بعد کی نسل کے لوگ ہیں ان کو بھی میں نے کبھی اپنی شاعری

سے بددل نہیں دیکھا"۔

اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا۔ بلا تشبیہ عرض ہے کہ ایک شاعر نے ایک محفل میں اپنا کلام سنایا، سامعین میں سے کوئی دل گرفتہ رونے لگا۔ شاعر نے اس سے کہا: "کیا آپ میری شاعری سے بددل ہوگئے ہیں"؟ اس شخص نے جواب دیا: "آپ کی شاعری سے نہیں، میں زندگی سے بددل ہو گیا ہوں کہ کیسا کیسا کلام سننا پڑتا ہے"۔

عطاء الحق قاسمی نے سوال کیا: "خوشبو آپ کی پہلی کتاب تھی۔ اس میں آپ نے بہت ساری چیزیں رد کی تھیں یا ساری کی ساری چیزیں شامل کردی تھیں"۔ اس کے جواب میں پروین شاکر نے بتایا کہ انھوں نے اپنی بہت سی تخلیقات رد کی ہیں اور انھیں "خوشبو" میں شامل نہیں کیا۔ اس پر عطاء الحق قاسمی نے کہا: "شاعر کو یہ حق ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی چیزیں پیش کرنے سے پہلے خود ہی ان کو رد کردے"۔

یہاں بھی ایک لطیفہ یاد آرہا ہے۔ ایک شاعر نے اپنا مجموعۂ کلام ایک نقاد کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا: "میں نے اپنا آدھا کلام رد کردیا ہے اور آدھا اس مجموعے میں شامل کیا ہے"۔ نقاد نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی سہولت ہوگی کہ انھیں بھی آپ کا آدھا کلام ہی رد کرنا پڑے گا"۔

(۲۸/ جون ۱۹۸۵ء)

سفرنامہ یا تذکرۃ النسا

وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ نظیر صدیقی کی کتابیں جاسوسی ناولوں کی طرح بہ کثرت چھپتی تھیں۔ ابھی ایک کتاب کا بوجھ ذہن سے اترتا نہیں تھا کہ دوسری کتاب کی چمک دمک سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ تقریباً ہر چھٹے مہینے ان کی کوئی نہ کوئی کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے لیے طبع آزمائی کا موقع مہیا کرتی تھی۔ ہم نے نظیر صدیقی کے بارے میں اتنے کالم لکھے ہیں کہ اگر انھیں یک جا کر دیا جائے تو ایک اچھا خاصا "نظیر نامہ" مرتّب ہو سکتا ہے۔ چوں کہ اس نام کی ایک کتاب پہلے سے موجود ہے جو مخمور اکبر آبادی نے نظیر اکبر آبادی کے بارے میں لکھی ہے' اس لیے استاد لاغر مراد آبادی نے ہماری مجوزہ کتاب کا نام "غلط نامۂ نظیر" تجویز کیا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ نظیر صدیقی سے ہمارے خوش گوار تعلقات ہیں۔ ہم دوستوں کے غلط نامے مرتب نہیں کرتے' ان کی غلطیوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

ادھر ایک عرصے سے نظیر صدیقی کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ ہم نے اس پر تشویش کا اظہار کیا تو انھوں نے بتایا اقبال اور رادھا کرشنن کے موضوع پر انگریزی میں ان کی ایک کتاب دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ پبلشر نے انھیں کتاب کا ایک ہی نسخہ بھیجا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے لیے اپنے وسائل سے کتاب کا ایک نسخہ حاصل کرلیں۔ ہم نے عرض کیا' ہمارے وسائل محدود ہیں' جب ہم اپنے ملک کے کسی مصنف کو کتاب لکھنے سے منع نہیں کرسکتے تو کسی غیر ملکی ناشر کو کیسے مجبور کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی شائع کردہ کتاب ہمیں بھیجے۔ نظیر صاحب نے فرمایا' ویسے بھی وہ کتاب انگریزی میں ہے' آپ کے سر کے اوپر سے گزر جائے گی۔ ہم نے عرض کیا آپ کی اردو کتابیں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ فرمایا' لیکن عن قریب آپ کو ایک ایسی کتاب ملے گی جسے پڑھ

کر آپ خوش ہوں گے۔ ہم نے کہا، ہم تو آپ کی ہر کتاب پڑھ کر خوش ہی نہیں ہوتے بلکہ دورانِ مطالعہ ہنستے بھی رہتے ہیں۔

واقعی چند روز بعد نظیر صدیقی کی نئی کتاب "دو سفرنامے" ہمارے ہاتھ میں تھی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں دو سفروں کی روداد ہے۔ پہلا سفر بمبئی اور کلکتے کا ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب مصنف بی اے کے طالب علم تھے اور ڈھاکے میں رہتے تھے۔ دوسرا سفر ۱۹۸۰ء کا ہے جب ایک تربیتی یا تعلیمی کورس میں شرکت کے لیے وہ اسلام آباد سے لندن گئے تھے۔

پہلے سفرنامے کا خلاصہ یہ ہے کہ ۷/ اگست ۱۹۵۰ء کو پاکستانی وقت کے مطابق تین بجے دن بذریعہ ہوائی جہاز جنابِ مصنف ڈھاکے سے روانہ ہوئے، اور اُسی دن ہندوستانی وقت کے مطابق تین ہی بجے کلکتے پہنچ گئے۔ ہندوستان اور پاکستان میں وقت کے آدھ گھنٹے کے فرق کی وجہ سے نظیر صدیقی کو یہ فائدہ ہوا کہ وقت صرف کیے بغیر سفر کا مرحلہ طے کرلیا۔ لیکن اس قسم کا کوئی فائدہ سفرنامہ پڑھنے والوں کی قسمت میں نہیں ہے۔ انھیں کلکتے پہنچنے تک کی تفصیلات جاننے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نظیر صدیقی نے کلکتے میں چھ دن گزارے۔ دو ادیبوں سے مختصر ملاقاتیں کیں اور باقی سارا وقت چڑیا گھر اور عجائب گھر وغیرہ میں گزارا۔ ان جگہوں پر نظارے بہت تھے اور آنکھیں صرف دو۔ لہٰذا جنابِ موصوف بقول خود "حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں" گنگناتے ہوئے بادل ناخواستہ بمبئی پہنچے۔ اس شہر نے انھیں فوراً اپنا اسیر بنالیا، اور وہ یوں کہ کچھ مرہٹی اور گجراتی عورتیں دھوتی میں ملبوس نظر آئیں جنھیں موصوف نے ہندو پنڈت سمجھا کیوں کہ "بعض پنڈتوں کے سر بھی عورتوں کی مانند زلف دراز کے حامل ہوتے ہیں"۔ لیکن جب انھیں بتایا گیا کہ یہ پنڈت نہیں عورتیں ہیں تو اُن کے ذہن کو ایک دھچکا سا محسوس ہوا۔ بعد میں ایک مرتبہ دل کو بھی دھچکا پہنچا کیوں کہ انھوں نے کچھ پنڈتوں پر عورتوں کا قیاس کرلیا تھا۔

بہرحال بمبئی میں ان کا خاصا وقت اسی قسم کے مشاغل میں گزرا۔ ان کے مشاہدات و تجربات میں بڑی "ندرت" پائی جاتی ہے۔ مثلاً: "میں نے بمبئی کی عورتوں کو روزانہ زندگی میں جس قدر قیمتی اور زرق برق کپڑے پہنے دیکھا اتنا کسی تہوار کے موقع پر بھی دوسرے شہروں کی عورتوں کو پہنتے نہیں دیکھا تھا۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بمبئی کے نسوانی حسن میں 'روئے جمیل' سے زیادہ لباس

حریر' کو دخل ہے۔ چنانچہ جب مجھے کسی نسوانی چہرے کو دیکھ کر مایوسی ہوتی تو تلافی کے لیے میں اس کے لباس کو دیکھنے لگتا"۔ شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے مومن خاں مومن نے کہا تھا:

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

نظیر صدیقی نے بمبئی کی عورتوں اور پنڈتوں سے متعلق اپنی مصروفیات سے کچھ وقت بچا کر بمبئی کے ترقی پسند ادیبوں میں بھی دلچسپی لی۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کی ہفتہ وار ادبی نشستیں باقاعدگی سے ہوتی تھیں۔ نظیر صاحب ایک ایسی نشست میں جا پہنچے۔ وہاں انھیں کیفی اعظمی' کرشن چندر' وشوامتر عادل' عصمت چغتائی' راجندر سنگھ بیدی اور بعض دوسرے ترقی پسندوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وشوامتر عادل سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ جلسے کے اختتام کے بعد جوتے پہن رہے تھے۔ اس ملاقات کا حال نظیر صدیقی نے اس طرح بیان کیا ہے : "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ عادل نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ ذرا ٹھہریئے میں جوتے پہن لوں۔ عادل جوتے پہن کر کسی اور سے مصروف گفتگو ہوگئے اور میں ان کے قریب کھڑا رہا"۔ نظیر صاحب نے اس ملاقات کی مزید تفصیلات نہیں بتائیں۔ کاش وہ کم از کم اتنا ہی بتا دیتے کہ ترقی پسندوں کے جلسے میں جوتوں سمیت شرکت کی اجازت کیوں نہیں تھی۔

بیدی سے ملاقات کی تفصیل یہ ہے کہ نظیر صدیقی نے ملاقات کے لیے وقت مانگا' انھوں نے معذرت کی: "اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی کھڑے ہیں ان کو الوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن جانا ہے"۔ نظیر صدیقی نے "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" پر عمل کرتے ہوئے بیدی کے چھوٹے بھائی سے مصافحہ کیا اور اور اُن سے بیدی کے نجی حالات معلوم کیے۔ صدیقی نے "نجی حالات" کی تفصیل نہیں بتائی۔ شاید "ناگفتہ بہ" قسم کے ہوں گے۔

ترقی پسندوں کے جلسے میں عصمت چغتائی سے بھی ملاقات ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے: "میں نے ان کو سلام کیا اور غیر شعوری طور پر مصافحے کے لیے میرا ہاتھ ان کی طرف بڑھ گیا مگر جواب میں ان کا ہاتھ نہیں بڑھا تو میں نے احساسِ خفت کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا"۔ عصمت چغتائی نے ازرہ کرم ملاقات کے لیے انھیں اپنے گھر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچے۔ عصمت چغتائی کے بھتیجے نے انھیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ایک گھنٹے تک نظیر صدیقی محترمہ کا انتظار کرتے رہے۔ پھر بھتیجے نے بتایا کہ وہ بہت مصروف ہیں۔ کچھ لوگوں سے بعض اہم مسائل پر

گفتگو ہو رہی ہے۔ نظیر صدیقی نے بھتیجے سے ملاقات کو غنیمت سمجھا اور اُس سے مصافحہ کر کے وہاں سے چلے آئے۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ عصمت کی طرح ان کے بھتیجے نے کوتاہ دستی سے کام نہیں لیا بلکہ بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اگر عصمت کی طرح وہ بھی مصافحے کے لیے ہاتھ نہ بڑھاتے تو نظیر صاحب کو دوبارہ خفت ہوتی' اور چالیس برس بعد یہ واقعہ پڑھ کر ہمیں بھی نظیر صاحب کے نیاز مند کی حیثیت سے شریکِ خفت ہونا پڑتا۔ عصمت چغتائی کے بھتیجے کی نظر سے اگر یہ سطریں گزریں تو وہ ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں کہ انھوں نے ہم دونوں کو خفت سے بچالیا۔

دوسرا سفر نامہ لندن کا ہے۔ ۲۰/ اپریل ۱۹۸۰ء کو دن کے ساڑھے بارہ بجے نظیر صدیقی راولپنڈی سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ سفر کی تیاری کے سلسلے میں تکلیف دہ تفصیلات (قاری اور مصنف دونوں کے لیے) بیان کرنے کے بعد نظیر صاحب یہ بتاتے ہیں کہ جہاز میں ان کے برابر کی سیٹ پر ایک انگریز خاتون بیٹھی تھیں۔ دونوں ہم سفر تھوڑی سی دیر میں اتنے بے تکلف ہو گئے کہ ذاتی حالات سے لے کر مذہب اور جنسیات تک ہر موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ یہ محترمہ بیوہ تھیں۔ نظیر صدیقی نے ان سے دوسری شادی کے بارے میں پوچھا۔ محترمہ نے بتایا کہ مناسب آدمی ملے گا تو یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ افسوس کہ یہ مناسب آدمی انھیں موجودہ ہوائی سفر کے دوران بھی نہ ملا۔ بہرحال نظیر صدیقی کے سفر اور صبر کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا اور وہ لندن پہنچ گئے۔

لندن میں بھی یوسف خان کمبل پوش کی طرح نظیر صدیقی کی توجہ کا مرکز خواتین ہی تھیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جن دنوں نظیر صدیقی لندن میں تھے وہاں کے سارے مرد یا تو کسی خوف کی وجہ سے گھروں میں دبکے بیٹھے رہتے تھے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے۔ اسی لیے سفر نامے میں مردوں کا ذکر آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ لندن کی خواتین بڑی فراخ دل اور متواضع تھیں۔ ایک لفٹ میں بہت بھیڑ تھی۔ ایک خاتون نظیر صاحب کے ساتھ کھڑی تھی۔ نظیر صاحب نے کوئی جملہ کسا تو وہ کہنے لگی: "تم بڑے شریر لڑکے ہو"۔ نظیر صاحب اپنے لیے "لڑکے" کا لفظ سن کر بہت خوش ہوئے۔ یہ واقعہ پڑھ کر ہمیں نظیر صاحب سے بھی زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ لندن کی خواتین کس درجہ مردم شناس ہیں۔

ایک محفل میں سفر نامہ نگار نے اپنا تعارف کرایا تو ایک خاتون نے کہا: "آپ جب اپنا تعارف

کرا رہے تھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ کی شخصیت سے شاعری کا چشمہ بہہ رہا ہے"۔ افسوس کہ یہ چشمہ لندن میں ہی بہہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر صاحب نے لندن سے آنے کے بعد شاعری ترک کردی ہے۔

جملے بازی میں نظیر صدیقی بھی لندن کی عورتوں سے کم نہیں ہیں۔ ایک خاتون نے ان سے کہا: "افسوس میں شاعرہ نہیں ہوں"۔ نظیر صاحب نے برجستہ فرمایا: "آپ شاعرہ کیوں کر ہو سکتی ہیں آپ کو تو شاعری کا موضوع ہونا تھا"۔ وہ عورت بھی خاصی سخن فہم تھی۔ کہنے لگی: "مگر خدا نہ کرے کہ میں آپ کی شاعری کا موضوع بنوں"۔ خاتون کا یہ جواب نظیر صدیقی نے سفرنامے میں نہیں لکھا۔ ہمیں دیگر ذرائع سے معلوم ہوا ہے۔

لندن کے کوئی صاحب نظیر صاحب کے لیے پریشانی کا سبب بنے۔ اس پر ایک خاتون نے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ وہ صاحب آپ کے لیے مسئلہ بن گئے ہیں"۔ نظیر صدیقی نے جواب دیا: "میرے لیے تو اصل مسئلہ آپ ہیں"۔ یہ سن کر وہ خاتون کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ لندن کی خواتین کتنی خوش اخلاق ہیں کہ رونے کے مقام پر بھی ہنس دیتی ہیں۔

اس سفرنامے کے بعض حصے بڑے دردناک ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایک خاتون سے اپنے تعلقِ خاطر کا ذکر کرتے ہوئے نظیر صدیقی لکھتے ہیں: "اس کے ساتھ میرے بڑھتے ہوئے لگاؤ کا انجام وہی ہوا جو زندگی بھر بعض شخصیتوں سے میری عقیدت اور محبت کا ہوتا رہا ہے۔ یعنی دوسری جانب سے تدریجی بے تعلقی۔ وہ میرے لگاؤ کی متحمل نہ ہو سکیں۔ میں انھیں دوست بنانے کا آرزو مند تھا۔ وہ میری ٹیوٹر سے زیادہ کچھ بننے پر رضامند نہ تھیں"۔ ہمیں نظیر صدیقی سے دلی ہمدردی ہے اور مذکورہ خاتون سے بھی کہ وہ بہرحال کچھ عرصے نظیر صدیقی کی ٹیوٹر کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں۔

سفرنامے میں کہیں کہیں مُردوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ساقی فاروقی اور افتخار عارف کا۔ اس فہرست میں خود مصنف کا نام نامی بھی شامل کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں صرف ان مُردوں کا ذکر مقصود ہے جنھیں زیرِ نظر سفرنامے میں خواتین کے حوالے سے نہیں، ادب کے حوالے سے یاد کیا گیا ہے۔ نظیر صدیقی نے لندن پہنچتے ہی ساقی فاروقی اور افتخار عارف کو اپنے ورودِ مسعود کی اطلاع دی۔ دونوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خوشی سے لوٹ پوٹ ہو گئے جیسے وہ اسی دن کے

انتظار میں برس ہا برس سے زندگی کے دن کاٹ رہے ہوں۔ ان دونوں کی خوشی کا اظہار اُن واقعات سے ہوتا ہے جو نظیر صدیقی کی لندن سے واپسی کے فوراً بعد سننے میں آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے۔ ساقی فاروقی نے لندن میں نظیر صدیقی کو کیٹس کا مکان دکھایا۔ مکان کے اردگرد پھیلے ہوئے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساقی نے کہا: "یہ وہ باغ ہے جس کے درختوں سے اُڑنے والی بلبلوں کے لیے کیٹس نے بے پناہ نظمیں لکھیں"۔ نظیر صدیقی نے بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا اور پھر پوری سنجیدگی سے بولے: "کس درخت سے اُڑی تھی وہ بلبل"؟

تنقید کے ساتھ ساتھ لطیفہ گوئی میں بھی نظیر صدیقی کا جواب نہیں۔ ساقی کے ذکر میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "ساقی نے انگریزی میں بھی شعر گوئی شروع کر دی ہے۔ اس وقت تک چار پانچ نظمیں کہہ چکے ہیں۔ میں نے ان کی ایک نظم خود ان کی زبان سے سنی تھی۔ میں انگریزی شاعری پر رائے دینے کا اہل نہیں لیکن مجھے ساقی کی نظم بڑی زوردار محسوس ہوئی۔ مجھے یہاں تک محسوس ہوا کہ اتنا زور اُن کی کسی اردو نظم میں بھی نہیں ہے"۔

ایک طرف تو نظیر صدیقی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ انگریزی شاعری پر رائے دینے کے اہل نہیں ہیں، دوسری طرف یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ ساقی کی انگریزی نظم نہ صرف بڑی زوردار ہے بلکہ اتنا زور اُن کی کسی اردو نظم میں بھی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ ساقی فاروقی نے اپنی انگریزی نظم نظیر صدیقی کو خاصی زوردار آواز میں سنائی تھی، موصوف آواز کی بجائے نظم کو زوردار سمجھ بیٹھے۔

ساقی فاروقی نے لندن کی ایک ادبی محفل میں نظیر صدیقی سے شکایت کی کہ آپ نے پروین شاکر پر پچاس صفحوں کا مضمون لکھا لیکن مجھ پر پانچ صفحے بھی نہیں لکھے۔ اوپر کی پانچ سطروں میں نظیر صدیقی نے اس شکایت کا بخوبی ازالہ کر دیا ہے۔

(۱۳/ اپریل ۱۹۸۹ء)

ساختیات اور خُود ساختیات

ہندوستان سے ہمارے سیاسی تعلقات کیسے ہی ہوں' ادبی مراسم نہایت خوشگوار ہیں۔ یہاں کے ادیب وہاں اور وہاں کے ادیب یہاں کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ادب' ادب نہیں رہا' سیروسیاحت کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اس صورت حال سے بہت سے جعلی ادیبوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ جنھیں اپنے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا' وہ دوسرے ملک میں جاکر "مشاہیر" میں اپنا شمار کراتے ہیں۔ وہاں ریڈیو کی اردو سروس میں خارج از آہنگ انٹرویو دیتے ہیں' یہاں مشاعروں میں خارج از وزن و معنی شعر سنا کر سامعین کا مذاق اور اپنا گلا خراب کرتے ہیں۔ بعض "مشاہیر" سفر نامے بھی لکھتے ہیں جنھیں لکھنے کے لیے صرف ارادے کی' اور پڑھنے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان سے آنے والے ادیب کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جنھیں تفریحی مقاصد کے لیے بلایا جاتا ہے۔ وہ "اسی مے خانے کی مٹی اسی مے خانے میں" کے مصداق مشاعروں میں صرف یا خرچ ہو جاتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو "تبادلے" کی اسکیم کے تحت تشریف لاتے ہیں۔ جس طرح بعض ممالک میں قیدیوں کا تبادلہ ہوتا ہے' اسی طرح پاک و ہند کے درمیان غیر سرکاری سطح پر ادیبوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ کچھ پاکستانی ادیب اپنے وسائل یا اثرات سے کچھ ایسے ہندوستانی ادیبوں کو ادبی جلسوں میں مدعو کرتے ہیں جو اپنے ملک میں باوسیلہ اور بااثر ہوتے ہیں۔ پھر وہ جوابی کارروائی کے طور پر اپنے پاکستانی دوستوں کو ہندوستان بلا کر حساب برابر کر دیتے ہیں۔

کچھ ہندوستانی اہلِ قلم ایسے ہیں جو صرف علمی و ادبی مقاصد کے تحت تشریف لاتے ہیں۔ وہ علمی و ادبی مجالس میں شرکت کرتے ہیں' اہلِ علم سے ملاقاتیں کرتے ہیں' پاکستان کی ادبی صورت

حال کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت خوش گوار اثر چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، جیلانی بانو، علی جواد زیدی، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور دوسرے کئی اہل قلم شامل ہیں۔ اس فہرست میں ڈاکٹر نارنگ کا نام دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگ زیر لب مسکرائیں اور یہ کہیں کہ وہ تو ادب سے زیادہ تعلقاتِ عامہ کے حوالے سے سفر کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ڈاکٹر نارنگ علم کا سمندر ہیں۔ اس سمندر میں تعلقاتِ عامہ کی حیثیت محض ایک گلیشیر کی سی ہے۔ گلیشیر کا کام صرف اتنا ہے کہ بھولے بھٹکے جہاز اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہیں۔ ڈاکٹر نارنگ اپنے علم سے لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں، تعلقاتِ عامہ سے حریفوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ جب پاکستان تشریف لاتے ہیں تو یہاں کی ادبی دنیا میں زلزلہ سا آجاتا ہے۔ عام زلزلے سے زیر زمین سطح پر ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ قصۂ زمین بر سرِ زمین کے قائل ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے لوگ بے تاب ہوتے ہیں اور وہ خود بھی سراپا اشتیاق بن جاتے ہیں۔ ہر ایک سے اس طرح ملتے ہیں جیسے صرف اسی سے ملنے کے لیے انھوں نے زحمتِ سفر اٹھائی ہو۔ پچھلے ہفتے کراچی میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر نارنگ کے حوالے سے خلوص و محبت کے بے مثال مناظر دیکھنے میں آئے۔ اس مرتبہ موصوف کی آمد کا سبب عالی صاحب تھے۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ مئی کے دوسرے ہفتے میں کسی عرب امارت میں عالی صاحب کا جشن منایا گیا۔ نارنگ صاحب نے اس جشنِ طرب میں شرکت کی اور اُن کی شان میں ایک خوبصورت مقالہ پڑھا۔ اس مقالے میں عالی صاحب کی اتنی تعریف تھی کہ ان کے لیے اکیلے واپس آنا مشکل ہو گیا، لہٰذا نارنگ صاحب انھیں کراچی چھوڑنے آئے۔

کراچی میں نارنگ صاحب کا قیام ایک ایسے علاقے میں تھا جو شہر سے بہت دور ہے۔ اس لیے خیال تھا کہ وہ ہجوم عاشقاں سے محفوظ رہیں گے اور عالی صاحب کے بارے میں مقالہ لکھنے سے جو تھکن ہوئی ہے، اس کا ازالہ کریں گے۔ لیکن سننے میں آیا کہ صبح کاذب ہی سے عشاق ان کے ہاں پہنچ جاتے تھے، کوئی اخبار کے لیے انٹرویو لیتا تھا، کوئی اپنی کتاب رائے کے لیے پیش کرتا تھا اور کوئی اپنے ہاں مدعو کرنے کے لیے تحریری درخواست سامنے رکھتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے بھی انھیں اپنے ہاں مدعو کیا حالاں کہ ترقی پسند مصنفین، ڈاکٹر نارنگ سے اتنا ہی پرہیز کرتے ہیں جتنا

خالص ادب سے۔ لیکن ڈاکٹر عالیہ امام بہت فراخ دل ہیں' وہ خاص خاص رجعت پسندوں کو بھی شایانِ توجہ سمجھتی ہیں۔ خود ڈاکٹر نارنگ بھی فراخ دلی میں کچھ کم نہیں۔ ترقی پسندوں سے وہ ایسی محبت سے ملتے ہیں جیسے ساتھ کے کھیلے ہوں۔ ایک محفل میں انھوں نے پروفیسر ممتاز حسین کو اپنا معنوی استاد بھی کہہ دیا۔ اس پر استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا: "ساختیات کے ماہر ہیں' ساختیات میں لفظوں سے بحث ہوتی ہے' معنوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس لیے معنوی استاد کا مطلب ہے لفظی استاد"۔

نارنگ صاحب کے اعزاز میں یوں تو کئی جلسے ہوئے اور بے شمار نجی دعوتوں میں انھوں نے شرکت کی لیکن انجمن ترقی اردو کا جلسہ بہت شان دار تھا (انجمن اب جلسے کرنے ہی کے لائق رہ گئی ہے) وسیع ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بلکہ بقول شخصے 'تل تو بڑی چیز ہے ڈاکٹر نارنگ جیسے ماہر لسانیات کے جلسے میں کوئی مصوتہ یا مصمتہ دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ موصوف کی تقریر کا موضوع ساختیات تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی ساری تحریروں کا موضوع یہی تھا۔ ساختیات عام دلچسپی کی چیز نہیں' اس لیے عام لوگوں نے "ساختیات" کو "خود ساختیات" قسم کی چیز سمجھا۔ بعض اہلِ علم نے نارنگ صاحب پر اعتراضات بھی کیے۔ نارنگ صاحب نے ہر اعتراض کا مدلل جواب دے دیا اور جہاں کوئی دلیل نہ ملی وہاں وہ طلاقتِ لسانی سے غالب آگئے۔ نارنگ صاحب تحریر ہی میں نہیں' تقریر میں بھی بے مثال ہیں۔ وہ ایسے خوب صورت انداز میں تقریر کرتے ہیں کہ سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔ سامعین کی اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نارنگ صاحب جو جی میں آتا ہے' کہہ جاتے ہیں اور اس طرح ثابت کر دیتے کہ وہ ساختیات ہی کے نہیں "خود ساختیات" کے بھی ماہر ہیں۔

محمد حسین آزاد نے "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" میں غالب کے بارے میں لکھا ہے:

"بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے"۔ ڈاکٹر نارنگ نے بھی ساختیات کا نقارہ اس زور سے بجایا ہے کہ سننے والوں کے کان گنگ اور دماغ ماؤف کر دیے ہیں۔ سمجھنے والے خاموش ہیں اور نہ سمجھنے والے واہ وا اور سبحان اللہ کا شور مچا رہے ہیں۔

نارنگ صاحب کی کراچی میں موجودگی کے دوران' انتظار حسین نے بھی لندن جاتے ہوئے چند

گھنٹوں کے لیے کراچی میں قیام کیا۔ لندن کے اردو مرکز میں ان کے ساتھ ایک شام منائی جارہی ہے۔ کراچی کی ایک دعوت میں ڈاکٹر نارنگ اور انتظار حسین کی ملاقات ہوئی۔ کسی نے انتظار حسین سے پوچھا: "آپ لندن اکیلے جارہے ہیں یا آپ کے ساتھ کوئی مقالہ نگار بھی جارہا ہے"؟ انھوں نے ڈاکٹر نارنگ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا: "میں جمیل الدین عالی کی طرح صاحبِ مقدور نہیں ہوں کہ نوحہ گر کو ساتھ رکھوں"۔

نارنگ صاحب کا نیا تنقیدی مجموعہ "ادبی تنقید اور اسلوبیات" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ نہایت فکر انگیز مقالات کا مجموعہ ہے۔ اردو میں ایسے تنقیدی مجموعے کم شائع ہوئے ہیں جن میں روایتی تنقید سے ہٹ کر بات کی گئی ہو۔ اس میں میر، انیس اور اقبال کے اسلوبیاتی تجزیے ہیں۔ فیض و عالی کے معنیاتی نظام کے جائزے ہیں۔ شہریار، بانی، ساقی، فاروقی اور افتخار عارف کی شاعری کے توصیفیے ہیں۔ نثری نظم کی شناخت بتائی ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی نثر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو خصوصاً ساقی فاروقی اور افتخار عارف کو یہ مجموعہ ضرور پڑھنا چاہیے کہ ان کی شاعری کی اتنی تعریف کسی دوسری جگہ نہیں ملے گی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان دونوں پر لکھتے ہوئے قلم توڑ دیا ہے۔ انھوں نے یہ اچھا ہی کیا، اگر وہ خود قلم نہ توڑتے تو اس کتاب کے پڑھنے والے توڑ دیتے۔

اس کتاب کے تقریباً سبھی مضمون ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ البتہ پہلا مضمون (ادبی تنقید اور اسلوبیات) ہمارے لیے نیا ہے۔ اس مضمون کے پہلے پیراگراف کا کچھ حصہ اس لائق ہے کہ ہمارے قارئین کی نظر سے بھی گزرے۔ اس میں نارنگ صاحب نے اپنے مزاج کے خلاف، اپنے تین ہم عصروں کی "ساختیات و پرداختیات" پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں: "اردو کے ایک جدید نقاد جنھوں نے بالقصد تنقید کو خار زار بنایا ہے تا کہ لوگ آبلہ پائی کی لذت سے آشنا ہو سکیں، اس بات کا اکثر ماتم کرتے ہیں کہ جدیدیت ایک مشعلہ بکف بغاوت تھی لسانی نقادوں نے اسے ٹھنڈا کردیا..... ایک اور کرم فرما ہیں جنھیں اونچی سطح سے بات کرنے کا مرض ہے گویا انوار انھیں پر نازل ہو رہے ہوں، وہ اخلاقیات تنقید کی دہائی دیتے ہوئے نہیں تھکتے، حالانکہ ادبی ریاکاری کو آرٹ بنانے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ ان کے نزدیک دانشوری یہی ہے کہ اسلوبیات کے بارے میں جملے بازی کرتے رہیں اور یوں اپنے احساسِ کمتری کے زخموں کو سہلاتے رہیں۔ تنقید نگار تو خیر

سمجھ میں آتا ہے کیوں کہ بقراط بننے کا اسے حق ہے لیکن اس لائقِ احترام قبیلے میں ایک سربر آوردہ تخلیق کار بھی ہیں جو فکشن میں اپنی ناکامیوں کا بدلہ تنقید سے لیتے رہتے ہیں اور تنقید میں بھی لسانی تنقید کو برا بھلا کہہ کر اپنی بھکشوؤں والی بے تعلقی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا کرنے سے ان کے فکشن کا بھلا ہو سکتا ہے تو لسانی تنقید کو ان کی معصومیت پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے"۔

نارنگ صاحب نے اشاروں کنایوں میں بات کی ہے۔ اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کن حضرات کی شان میں کف در دہاں ہیں۔ اگر ہمارا یہ کالم باقر مہدی، ظ۔ انصاری اور جوگندر پال کی نظر سے گزرے تو اُن سے درخواست ہے کہ وہ اس عقدے کو سلجھانے میں ہماری مدد کریں۔

(۸/ جون ۱۹۸۹ء)

ادبِ عالیہ امام

"مزدور تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہو رہا تھا"۔

"آفتاب کی کرنیں بہت دور دور تک اپنی کرنوں کا جال پھیلا رہی تھیں"۔

"انھوں نے صرصر و سموم سے روغن غذا حاصل کی"۔

"اسلام کا تقدس بے معنی ہے اگر اقتدار چراغوں کی زد پر ہے"۔

ان جملوں میں زبان و بیان کا حسن اور اسلوب کی جو انفرادیت ملتی ہے' اس کی بنا پر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ کس کے اشہبِ جہندۂ قلم نے میدانِ وسیعِ بیان میں یہ گل کترے ہیں (موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی) ممکن ہے بعض لوگوں کا دھیان میر امن دہلوی اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرف جائے لیکن ایسی فصیح و بلیغ اردو لکھنا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم اپنے کالم کی تمہید کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر نہیں کرنا چاہتے' اس لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ جملے ڈاکٹر عالیہ امام کے ہیں جو ہم نے ان کی کتاب "شاخ ہری اور پیلے پھول" سے کشید کیے ہیں۔ ان جملوں کے انتخاب کے لیے ہم نے دیوان حافظ سے فال نکالنے کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ آنکھیں بند کرکے ورق گردانی کی اور چار جگہ شہادت کی انگلی رکھ دی۔ مذکورہ چار جملے بس اتنی سی محنت کا حاصل ہیں۔ ان چار جملوں کو محمد حسین آزاد کی زبان میں شہادت گاہِ اردو کے چار ستون سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب سے ہم نے فال ہی نہیں نکالی' اسے پڑھا بھی ہے۔ بلکہ استاد لاغر مراد آبادی کو بھی یہ کتاب پڑھوا دی ہے۔ استاد نے کتاب پڑھنے کے بعد معاوضہ طلب کیا۔ ہم نے عرض کیا' استاد یہ کتاب ہے' مشاعرہ نہیں جو آپ پڑھنے کا معاوضہ طلب فرما رہے ہیں۔ استاد نے

فرمایا: "جب کاتب لکھنے کا معاوضہ لیتا ہے، پریس والا چھاپنے کی اجرت وصول کرتا ہے، جلد ساز اپنا محنتانہ طلب کرتا ہے تو قاری کو اس کی محنت کے صلے سے کیوں محروم کیا جائے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب کے پڑھنے میں جتنی محنت میں نے کی ہے، اتنی مصنّفہ نے اس کے لکھنے میں نہیں کی"۔

ہم نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو استاد نے کہا: "کتاب پڑھنے کے دوران بار بار یہ خیال آتا رہا کہ ڈاکٹر صاحبہ نے اسے کیوں لکھا ہے اور میں کیوں پڑھ رہا ہوں۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ عقدہ حل ہوا کہ یہ محض اس لیے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کے صبر کا امتحان لیا جائے"۔

استاد کی یہ بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ ہمیں تو یہ کتاب بہت پسند آئی ہے۔ اس کا ہر صفحہ معلومات کا خزینہ ہے بہ شرطے کہ اسے دوسرے صفحے سے مربوط نہ سمجھا جائے۔ ن م راشد نے ایک شاعر کے بارے میں کہیں لکھا تھا کہ اس کی نظموں کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی بجائے آخر سے شروع تک پڑھا جائے تو مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس پر یہ اضافہ کریں گے کہ اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی زیرِ نظر کتاب کو آخری صفحے سے شروع کر کے پہلے صفحے پر ختم کیا جائے تو کتاب کے لطفِ خواندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام بقول خود ادیبہ ہیں، ماہرِ موسیقی ہیں، خطیبہ ہیں، دانش ور ہیں اور سیاست دان ہیں۔ گویا اُن کی شخصیت ایک گل دستہ ہے جس میں رنگ برنگے پھولوں کا اجتماعِ ضدین ہے۔ انھوں نے بقول خود لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس ڈگری کے لیے انھوں نے جو مقالہ لکھا تھا، وہ فیض احمد فیض مرحوم کو برائے اشاعت دیا گیا تھا۔ اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دلِ ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ محترمہ کے پاس ڈگری رہ گئی اور وہ چیز گم ہو گئی جس کی بنا پر یہ ڈگری ملی تھی۔ سنا ہے فیض صاحب جس کتاب کی عدم اشاعت کو اردو کے حق میں مفید سمجھتے تھے، اس کا مسودہ عموماً اُن سے گم ہو جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پاکستان آنے کے بعد محترمہ نے بقول خود کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں اور کئی کالجوں میں ملازمت کی کوشش کی مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں ملازمت سے محروم رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزمائے گئے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ سرسید گرلز کالج میں پرنسپل کی جگہ کے لیے انٹرویو دینے گئیں تو اُن سے کہا گیا آپ تو بہت قابل ہیں، یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں، بہتر ہو گا کہ آپ انٹرویو لینے والوں کے پینل میں شامل ہو جائیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی جگہ کسی اور کو پرنسپل بنوا دیا۔ پھر ایک مرتبہ فیض صاحب نے بڑی کوشش کر کے انھیں پی آئی اے میں ملازمت دلوا دی لیکن تیسرے مہینے جس طرح بغیر وجہ بتائے ملازمت ملی تھی، اسی طرح بغیر وجہ بتائے انھیں ملازمت سے علاحدہ کر دیا گیا۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی کتاب میں خود بیان کی ہیں۔ جب حالات ایسے ہوں اور بے روزگاری کے سائے بڑھتے چلے جائیں تو آدمی زندگی کا راستہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ نے بھی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا اور سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ غالب کی کوئے ملامت کی طرح کوئے سیاست میں بھی داخلہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جسے کہیں اماں نہ ملے، اسے یہاں سایۂ دیوار مل جاتا ہے۔

"شاخ ہری اور پیلے پھول" ڈاکٹر عالیہ امام کی آپ بیتی ہے۔ اس ادبِ عالیہ کو انھوں نے دوستوں کے اصرار پر تخلیق کیا ہے۔ دیباچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب مجھ سے میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ میں اپنی یادداشتیں تحریر کروں تو مجھے ان کی شوخیِ طبع اور حسِ مزاح خاصی واضح نظر آئی۔ میں اور اپنی یادداشتیں؟ جگ ہنسائی کے علاوہ اور کیا"؟

محترمہ کا یہ اعتراف صدق و خلوص پر مبنی ہے۔ ایسے ہی صدق و خلوص کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ کتاب کا نام تلاش کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیباچے کی ابتدائی سطروں ہی میں "شوخیِ طبع" اور "جگ ہنسائی" کی ترکیبیں موجود تھیں، انھیں بے تکلف کام میں لایا جا سکتا تھا۔ اس طرح کتاب کے نام اور مطالب میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی۔

کتاب کے شروع میں "مایۂ ناز" نقاد محمد علی صدیقی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

"تنقید کی دنیا میں محمد علی صدیقی ادبی سلیقے، تخلیقی رکھ رکھاؤ اور حکیمانہ ہمہ گیری کی علامت ہیں۔ وہ فن کار کے وجود میں اتر کر ادب اور سماج کے رشتے ڈھونڈتے اور ترسیل کی ناکامی میں عجزِ بیان کا سراغ لگانا جانتے ہیں... اس شبنمی مزاج ادیب کی کاوشوں سے میری یہ حقیر کوشش ممکن ہو سکی"۔

"حکیمانہ ہمہ گیری" والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ صدیقی صاحب کی تحریریں "تنقیدی حکمتِ عملی" کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں لیکن یہ "تخلیقی رکھ رکھاؤ" کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ رکھ رکھاؤ کے لغوی معنی ہیں، دیکھ بھال اور خاطرداری کا برتاؤ۔ گویا تخلیقی رکھ رکھاؤ کا مطلب یہ ہوا کہ محمد علی صدیقی تنقید نہیں لکھتے دوسروں کی خاطرداری کرتے ہیں۔ کم از کم ہم اِس بات کو تسلیم نہیں

کر سکتے۔ محمد علی صدیقی پر اس قسم کا الزام لگانا ادبی کفر ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد علی صدیقی "ترسیل کی ناکامی میں عجزِ بیان کا سراغ لگانا جانتے ہیں"۔ نقاد کو سراغ رساں کے منصب پر فائز کر دینا ڈاکٹر عالیہ امام کا معجزۂ بیان ہے، ورنہ صدیقی صاحب سب سے پہلے خود ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں "ترسیل کی ناکامی" کا سراغ لگاتے۔

آخری جملے کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر صدیقی صاحب کی کاوشوں سے ڈاکٹر عالیہ امام کی حقیر کوشش کیوں کر ممکن ہو سکی؟ ظاہر ہے کہ صدیقی صاحب نے اس کتاب کا مسودہ تیار کیا ہو گا نہ اس کی کتابت کی ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نوک پلک درست کی ہو گی۔ لیکن اس کا بھی کوئی داخلی ثبوت نہیں ملتا۔ اب یہ صدیقی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کے رائیگاں جانے کا سبب کیا ہے۔

کتاب کا نام اگرچہ "شاخ ہری اور پیلے پھول" ہے لیکن یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ہری شاخ نظر نہیں آتی ہے نہ کوئی پیلا پھول۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو غیر متعلق باتوں کا جھاڑ جھنکار۔ کہیں موسیقی کی تاریخ اس طرح بیان کی جا رہی ہے کہ اگر پڑھنے والے کو موسیقی سے دلچسپی ہو تو یہ دلچسپی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کہیں اشتراکیت پر صفحوں کے صفحے اس طرح سیاہ کیے گئے ہیں کہ سیاہ و سفید کا فرق مٹ گیا ہے۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ یومِ میر انیس، جشنِ مجنوں، جشنِ رئیس امروہوی اور پاک و ہند مشاعروں کی رودادوں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس قسم کی رودادیں اخباروں کے ادبی صفحات پر تو برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن ان کو کسی کتاب کی ضخامت میں اضافے کا سبب بنانا ڈاکٹر عالیہ امام ہی کا حوصلہ ہے۔ یہاں تک بھی معاملہ غنیمت ہے، جلیے مصنفہ نہ سہی، کتاب تو آگے بڑھ رہی ہے، لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر محمود حسین کی ایک طویل تقریر نظر آئی جس کا موضوع میر انیس ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ اس تقریر کا زیرِ نظر کتاب سے کیا تعلق ہے۔ آخر اس عقدے کو استاد لاغر مراد آبادی نے حل کیا اور بتایا کہ یہ سہوِ قلم ہے۔ جس کاتب نے یہ کتاب لکھی ہے، وہ ڈاکٹر محمود حسین کی تقریروں کا مجموعہ بھی کتابت کر رہا تھا۔ غلطی سے ایک تقریر ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں شامل ہو گئی۔ ہم نے عرض کیا: "اتنا طویل سہوِ قلم پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے"۔ انھوں نے فرمایا: "آپ نے تو ایک ایسی کتاب بھی دیکھ لی ہے جو بہ تمام و کمال سہوِ قلم کا نتیجہ ہے"۔ معلوم

نہیں لاغر صاحب کا اشارہ کس طرف تھا۔

زیر نظر کتاب کے وہ چند صفحات جن سے مصنّفہ کی ذات پر روشنی پڑتی ہے' بے حد دلچسپ ہیں۔ ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض نے انھیں "طوطیِ پاکستان" کا خطاب دیا تھا۔ اردو میں طوطی بولنے کا محاورہ شاید اِسی واقعے کے بعد مروج ہوا ہے۔ ایوب خان نے ڈاکٹر عالیہ امام کو وزارت اور سفارت کی پیش کش کی تھی۔ بھٹو ان محترمہ کو خوب صورت مقرر اور اسکالر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی وزارت ان کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ آغا شاہی بھی انھیں سفیر بنانے پر مصر رہے۔ لیکن محترمہ نے ان تمام پیش کشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس سے محترمہ کے اعلیٰ کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہاں تو وہ معمولی معمولی ملازمتوں کے لیے پریشان رہتی تھیں' اور کہاں بڑے بڑے عہدے ان کی نظر میں حقیر تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ محترمہ اگر ان عہدوں کو قبول کر لیتیں تو ایوب خان اور بھٹو کے اقتدار کی میعاد کم ہو جاتی۔ اس خیال کی تصدیق علامہ نیاز فتح پوری کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ علامہ نے فرمایا تھا: "عالیہ ارے عالیہ .... مجھے اگر ایسی بیوی مل جاتی تو اَب تک میری سترہ اٹھارہ برسیاں اطمینان سے ہو جاتیں"۔ (علامہ کا یہ جملہ خود مصنفہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۱ پر درج کیا ہے)

لیکن یہ مذاق کی بات تھی۔ علامہ کی اصل رائے کچھ اور تھی جس کا اندازہ ان کی ایک رباعی سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نیاز فتح پوری ڈاکٹر عالیہ امام سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ محترمہ کے شوہر کاظم امام صاحب تو گھر پر موجود تھے لیکن خود محترمہ غائب تھیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مجلس میں شرکت کرنے گئی ہیں۔ علامہ یہ فی البدیہہ رباعی لکھ کر چھوڑ آئے:

ہیں عالیہ آج کل مجالس کی نقیب
ملتا ہی نہیں پتا کہیں دور و قریب
کل تک تو مجھے ڈر تھا فقط کاظم سے
لو ہو گئے حسین بھی اب اپنے رقیب

ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں سب سے دلچسپ اور معنی خیز رائے بیگم جوش ملیح آبادی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے جوش صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ وہ اکثر ان کے ہاں جاتی تھیں۔ یہ بات بیگم جوش کو پسند نہ تھی۔ ایک روز ان کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا۔ آگے کا قصہ ڈاکٹر عالیہ کی زبانی سنیے:

"میری طرف سے پیٹھ پھیر کر جوش صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو دوسروں کے کارخانے میں دخل دیں"۔ لفظ 'کارخانے' کو اس خوب صورتی سے بیگم جوش ہی استعمال کر سکتی تھیں۔

ڈاکٹر عالیہ امام کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے' اس کی تفصیل انھیں کی زبان سے سنیے:

"ہمارے کنبے کی پور پور میں کلاسیکی موسیقی کی انگوٹھیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اسی لیے گھر میں ہر پندھرواڑے طبلے پر ٹکوریں مچلتیں' سارنگی کے تار کانپتے' ستار پر جھالا بجتا۔ خورشید فریدی کی پائلیں کھنکتیں' چچا' ماموں' خالہ' پھوپھی سبھی جھوم جھوم کر گل باری کرتے۔ کرشن کنھیا کی مُرلی بجتی' امی کو ابا سے زیادہ موسیقی پر عبور تھا۔ موسیقی کے ذریعے کنبے کی لڑکیوں کی تربیت بھی مقصود تھی"۔

یہ تربیت آگے چل کر بہت کام آئی۔ محترمہ کے دولت خانے پر انواع و اقسام کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ایک ایسی ہی محفل کا دلچسپ حال محترمہ نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے: "ہمارے گھر پر فیض صاحب کی دعوت ہوئی۔ فیض صاحب سرِشام طلوع ہوئے۔ اس محفل میں مہدی صاحب ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے.... اندر جا کر دیکھا تو ہمارے بھائی صاحب (بہنوئی) گھر والوں پر برس رہے تھے.... عالیہ کا گھر اس لائق نہیں رہا کہ کوئی شریف آدمی اس میں قدم رکھے... سید زادی کہلاتی ہیں اور گھر پر جام پر جام ٹکرائے جا رہے ہیں... میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر آگئی۔ فیض صاحب مجھے دیکھتے ہی پریشان ہو گئے.... بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟... بھائی صاحب گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں آپ لوگوں کی وجہ سے' کہتے ہیں پینا قطعاً حرام ہے۔ فیض صاحب بہت ہی سکون کے عالم میں بیٹھے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے' تو کیا ہوا' ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ بھائی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ یہ تو عالیہ کی غلطی ہے۔ مجھے پہلے سے بتایا نہیں کہ آپ تشریف لا رہے ہیں۔ ہم تو کسی کی عبادت میں مخل نہیں ہوتے۔ تو پھر آپ کیوں؟ یہ جملہ سنتے ہی بھائی صاحب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ وہ سب سے آگے بیٹھے ہوئے فیض صاحب کے کلام پر داد دے رہے ہیں"۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی شادی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بھی دلچسپی اور عبرت سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے ان کی شادی کی بات چیت الہ آباد کے غیور قاسم نامی ایک صاحب

سے چلی۔ یہ صاحب ویسے تو خاصے معقول تھے لیکن پرانی فکر اور فرسودہ روایات میں گندھے ہوئے تھے' اس لیے انھیں مسترد کر دیا گیا۔ پھر کان پور کے ایک وکیل سلطان نیازی امیدوار ہوئے۔ یہ صاحب محترمہ کی سیاسی و سماجی مشغولیات کو جاری رکھنے کے خلاف تھے' لہٰذا انھیں بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تا کہ زندگی سکون سے گزار سکیں۔ پھر کاظم امام صاحب میدان میں آئے۔ بقول ڈاکٹر عالیہ امام: "ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں وقت گزرتا گیا۔ دلچسپیوں کے دائرے وسیع ہوتے گئے۔ پھر صاحب زادے سویڈن چلے گئے۔ میرے گھر والے خوش تھے۔ بات صحیح رخ پر جارہی تھی کہ اچانک خط آیا۔ مجھے انجنیئرنگ کا کورس کرنا ہے' وقت کی کمی ہے' شادی ابھی نہیں کرنا ہے۔ خط ملتے ہی ہم پر اوس پڑ گئی۔ اب تک تو کسی نے بھی اس طرح کی جرأت نہیں کی تھی۔ جس ملک کو چاہا تسخیر کیا اور پھر اُسے مفتوح کے حوالے کر دیا۔ ہماری انا ریزہ ریزہ ہو گئی..... میں سخت الجھن میں گرفتار ہو گئی.... خطوں کی بارش کر دی۔ ہر خط میں گلاب باڑی لگائی۔ پھول مہکے' خوشبو دور دور تک پھیل گئی... کاظم نے مجھے سویڈن لے جانے کی تیاری مکمل کرلی"۔

کاظم امام صاحب نے نیکی کا یہ کام کیا کہ ڈاکٹر صاحبہ کو سویڈن لے جانے کی بجائے پاکستان لے آئے اور یوں اہلِ پاکستان کو موصوفہ کے علم اور بصیرت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے روس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ ایوب خان اور بھٹو اگر محترمہ کو سفیر بناتے تو یقیناً روس بھیجتے' لیکن زیرِ نظر کتاب پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے محترمہ پاکستان میں روس کی سفیر ہوں۔

روس سے اُن کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے کتاب میں اپنے والد مرحوم کی تصویر کے بعد جو تصویر شامل کی ہے' وہ گورباچوف کی ہے۔ کسی آپ بیتی میں مصنّف یا مصنّفہ کے والد کی تصویر کا شامل کیا جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کسی اور کے والد (وہ گورباچوف ہی کیوں نہ ہوں) کی تصویر کی شمولیت فہم سے بالا ہے۔ معلوم نہیں جوابی کارروائی کے طور پر گورباچوف نے اپنی سوانح عمری میں محترمہ کی تصویر شامل کی ہے یا نہیں!

(۲۱/۲۸ مئی ۱۹۸۷ء)

ادب اور پبلک ریلیشننگ

ایک زمانہ تھا کہ کوئی معرکے کی ادبی تخلیق منظرِ عام پر آتی تھی تو ادبی دنیا میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی تھی۔ قہوہ خانوں سے لے کر ادبی محفلوں تک جدھر جائیے اسی کا چرچا ہوتا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا ادیب یا ادب دوست اس تخلیق کے بارے میں رائے دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن جب سے معرکے کی ادبی تخلیقات کا سلسلہ بند ہوا ہے، افتخار عارف منصۂ شہود پر آ گئے ہیں۔ سال کے سال جب وہ پاکستان آتے ہیں تو ادبی دنیا میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جدھر جائیے انھیں کا ذکر، انھیں کا چرچا، انھیں کی تعریف، انھیں کی برائی۔ اور اس میں بھی یہ التزام کہ پچھلے سال جنھوں نے تعریف کی تھی، اس سال وہ اپنے کیے پر نادم نظر آتے ہیں۔ جنھوں نے برائی پر کمر باندھی تھی، وہ اب ہاتھ باندھے دکھائی دیتے ہیں۔ خدا جانے افتخار عارف میں کیا بات ہے کہ وہ بیک وقت لوگوں کی پسند اور ناپسند کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان کا حال تو نثری نظم جیسا ہو گیا ہے کہ اگر دو آدمی حق میں بیان دیتے ہیں تو چار حق گوئی پر اتر آتے ہیں۔

افتخار عارف کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے مجموعۂ کلام کی غائبانہ تقریبِ رونمائی ہو چکی ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ مصنفین خود ہی اس قسم کی تقریبات کا انتظام کرتے ہیں اور شروع سے آخر تک موجود رہتے ہیں تا کہ کوئی مقرر گفتنی اور ناگفتنی کے فرق کو نظر انداز نہ کر دے۔ افتخار عارف کا کمال یہ ہے کہ وہ خود تو لندن میں بیٹھے رہے اور لاہور اور کراچی میں ان کی کتاب کی رونمائی کے جلسے ہوتے رہے۔ لاہور میں کشور ناہید نے انتظام کیا اور کراچی میں محسن بھوپالی وغیرہ نے (لفظ "وغیرہ" کو محسن بھوپالی کا نیا تخلص نہ سمجھا جائے۔ مراد یہ ہے کہ اس کام میں کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ قانونی زبان میں "اعانتِ جرم" اسی کو کہا جاتا ہے۔)

افتخار عارف نے پچھلے دس بارہ روز کراچی میں گزارے۔ ان کی آمد سے پہلے ہی طرح طرح کی خبریں، سنسنی خیز افواہوں کی طرح پھیل گئیں۔ ان کے دوستوں اور طرف داروں نے مشاعروں، ادبی نشستوں، ظہرانوں، عصرانوں اور عشائیوں کے دعوت نامے ہی نہیں، خبریں اور تصویریں بھی پیشگی چھپوا ڈالیں۔ ایسی مستعدی تو سرکاری محکمۂ اطلاعات نے بھی کبھی نہیں دکھائی۔ افتخار عارف کے اربابِ اطلاعات اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ موصوف خوش قسمت ہیں کہ انھیں اپنے دوستوں کا خلوص ہی نہیں، پبلسٹی کے ذرائع بھی میسر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ خلوص کی عمارت پبلسٹی کے ستونوں کے سہارے قائم ہے۔

ان کے اعزاز میں دعوتیں دینے والے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے جس کے نتیجے میں انھیں ایک ایک دن میں دو دو ظہرانوں میں اور تین تین عشائیوں میں شرکت کرنی پڑی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اسلوبِ شعر کی طرح اسلوبِ انہضام بھی انفرادی خصوصیات کا حامل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مدیر "افکار" جناب صہبا لکھنوی نے بھی ان کے اعزاز میں دعوت کام و دہن کا انتظام کیا، حالانکہ صہبا صاحب اچھے اچھے مہمانوں کو دعوتِ فکر پر ہی ٹرخا دیتے ہیں۔

۶/ اپریل کو کراچی کے ایک ہوٹل میں افتخار عارف کے دوستوں نے تقریب ملاقات کا اہتمام کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُسی دن اور اُسی وقت لاہور میں پروین شاکر کے تیسرے مجموعۂ کلام "خود کلامی" کی تقریب رونمائی تھی جس کا اہتمام دبستان فنون کی طرف سے کیا گیا تھا، اور جس کے دعوت نامے کراچی میں اس کثرت سے تقسیم ہوئے کہ اگر تمام مدعوئین شرکت کا ارادہ کر لیتے تو کراچی سے لاہور تک کئی اسپیشل ٹرینیں چلانی پڑتیں۔ پروین شاکر کی تقریب کا دعوت نامہ ہمیں بھی ملا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں تھا، اس لیے ہم اُن کی "خود کلامی" سے محظوظ نہ ہو سکے۔ مجبوراً افتخار عارف کی خوش کلامی سے مستفید ہونا پڑا۔ گندم اگر بہم نہ رسد بُھس غنیمت است۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ کراچی میں ایسی شان دار ادبی تقریبیں کم ہی منعقد ہوئی ہوں گی۔ ادیبوں اور ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والوں میں سے شاید ہی کوئی ہو گا جو وہاں موجود نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پبلک ریلیشنگ پر کوئی سیمینار ہو رہا ہے۔

افتخار عارف لوگوں سے اس خوش اسلوبی سے گلے مل رہے تھے جیسے لندن میں وہ اسی کام کی

ٹریننگ لیتے رہے ہوں۔ یہ تقریب اس وقت باقاعدہ جلسے کی صورت اختیار کر گئی جب بعض لوگوں نے خاموش رہنے پر مضمون پڑھنے اور تقریریں کرنے کو ترجیح دی۔ بزرگوں میں سے پروفیسر ممتاز حسین نے اور خُردوں میں سے شاہدہ حسن نے افتخار عارف کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیکن نصیر ترابی، طاہر مسعود اور آصف فرخی ایسے سنگ دل نکلے کہ سامعین سے خود ہی خراجِ تحسین وصول کرتے رہے۔ ان تینوں کے مضامین روایتی انداز کے نہیں تھے۔ اس لیے کہ موضوع کی تعریف میں خاصے بخل سے کام لیا گیا تھا۔

پروفیسر ممتاز حسین نے فرمایا کہ افتخار عارف بہت سنجیدہ آدمی ہیں۔ ان پر پبلک ریلیشنگ کا الزام غلط ہے۔ شاید پروفیسر صاحب سمجھتے ہیں کہ سنجیدہ آدمی پبلک ریلیشنگ سے سروکار نہیں رکھتا۔ حالانکہ پبلک ریلیشنگ کا کام ہی ایسا ہے کہ اگر سنجیدگی سے انجام نہ دیا جائے تو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا۔ سنجیدہ لوگ ہی اس میدان میں کامیاب ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ افتخار عارف نے بین الاقوامی ادب کا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی یہ رائے خود اُن کے وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل ہے۔ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ پروفیسر صاحب ہر وقت کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتے ہیں، اب معلوم ہوا ہے کہ انھیں چہرہ خوانی یا قیافہ شناسی سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ اسی لیے تو وہ صورت دیکھ کر معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں شخص نے بین الاقوامی ادب پڑھا ہے یا نہیں۔ تاہم ہماری ناقص رائے میں پروفیسر صاحب کا علمِ قیافہ شناسی ابھی ادھورا ہے، ورنہ جہاں انھوں نے بین الاقوامی ادب کا مطالعہ کرنے کا ذکر کیا تھا، وہیں یہ بھی فرما سکتے تھے کہ افتخار عارف نے بین الاقوامی ادب تخلیق کیا ہے۔ پروفیسر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ آیندہ اس وقت تک افتخار عارف کے بارے میں لب کشائی نہ کریں جب تک وہ قیافہ شناسی کے اپنے ادھورے علم کو مکمل نہ کر لیں۔

نصیر ترابی نے یوں تو بہت سی دلچسپ باتیں کیں لیکن اس پر خاص طور پر زور دیا کہ افتخار عارف لندن جا کر بہت بدل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لباس میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ لیکن ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ افتخار عارف جیسے لندن جانے سے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ پہلے بھی ہر شخص سے انکسار سے ملتے تھے، اب بھی اسی طرح ملتے ہیں۔ پہلے بھی اچھے شعر کہتے تھے، اب بھی ان کے شعر اچھے ہوتے ہیں۔ پہلے بھی وہ لباس مجاز میں جلوہ گر تھے اور اب بھی اسی لباس میں

مگن رہتے ہیں۔ تبدیلی اگر کوئی آئی ہے تو افتخار عارف کے مداحوں میں آئی ہے۔ پہلے صرف ٹی وی پر آنے جانے والے ان کی تعریف کرتے تھے' اب اردو کے وہ ادیب تعریف کرتے ہیں جن کا لندن آنا جانا رہتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اردو کا جو ادیب بھی لندن جاتا ہے' عارف افتخار اردو مرکز میں اس کے اعزاز میں ایک جلسہ ضرور کرتے ہیں جس کا پروگرام تعزیتی جلسوں کی طرح خاصا سنجیدہ ہوتا ہے۔

طاہر مسعود نے اپنے مضمون میں یہ کہا کہ پہلے لندن سے شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈیانا کی خبریں آیا کرتی تھیں' اب افتخار عارف کی خبریں آتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے ہمارے اخبارات سے قصرِ بکنگھم کی اجارہ داری ختم کردی ہے۔ طاہر مسعود کو معلوم ہونا چاہیے کہ افتخار عارف مزید دو چار سال لندن میں رہ گئے تو وہاں کے اخبارات ہی سے نہیں' خود قصرِ بکنگھم سے بھی ان کے مکینوں کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔

طاہر مسعود نے یہ بھی کہا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ افتخار عارف کا تعلق دائیں بازو سے ہے یا بائیں بازو سے' وہ ہر مسلک و مشرب کے لوگوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی اپنی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس رائے سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ افتخار عارف جس مقام پر ہیں' وہاں دوسروں کا بازو' خواہ بایاں ہو خواہ دایاں' ان کے کسی کام نہیں آسکتا۔ خود ان کے بازو سلامت رہیں کہ انھیں کے زور پر اُنھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ استاد امام بخش ناسخ کے بازو بھی کچھ اسی قسم کے تھے جن کا ذکر ان کے اس شعر میں ملتا ہے:

بے قراری کا ہوں پُتلا مثلِ موج اے بحرِ حسن
کیوں نہ ہر بازو کی مچھلی ماہی بے آب ہو

بہرحال طاہر مسعود کو اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے اور کچھ نہیں تو اِسی کا خیال کرنا چاہیے کہ افتخار عارف ان سے عمر میں بڑے ہیں۔ اس طرح کی باتیں سن کر لوگ یہ کہیں گے کہ جب سے افتخار عارف لندن گئے ہیں' نئی نسل اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ اپنے بزرگوں کا بھی احترام نہیں کرتی۔

اس جلسے میں افتخار عارف نہایت صبر اور سکون کے ساتھ اپنے بارے میں سخن گسترانہ باتیں سنتے رہے اور جب وہ خود کچھ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف اتنا کہا: "میں کسی بات کی وضاحت نہیں کروں گا کیونکہ وضاحتوں سے بات مزید مبہم ہو جاتی ہے۔ ہاں لباس کے سلسلے میں یہ بتا دوں کہ

میں نے اس وقت جو کپڑے پہن رکھے ہیں، وہ نصیر ترابی کے عنایت کردہ ہیں"۔ بات درست تھی کیونکہ افتخار عارف کی شخصیت لباس کی وجہ سے جاذب نظر نہیں تھی، لباس ان کی شخصیت کی وجہ سے جاذب نظر ہو گیا تھا۔

آخر میں نصیر ترابی کے عنایت کردہ کپڑوں میں ملبوس افتخار عارف نے اپنی چند نئی غزلیں سنائیں جنھیں سن کر ایک صاحب نے کہا: "جو شخص ایسی عمدہ غزلیں کہہ سکتا ہے، اسے پبلک ریلیشننگ کی کیا ضرورت ہے"۔ ہمیں اس خیال سے صد فی صد اتفاق ہے کیونکہ جس شخص کی یہ رائے ہے، اتفاق سے وہ خود ہمیں تھے۔

(۱۲/ اپریل ۱۹۸۵ء)

شاعری یا کلامِ موزوں

اس کے باوجود کہ ہمارا عہد بڑی شاعری کا عہد نہیں ہے' اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اخترالایمان ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ راشد اور فیض کے انتقال کے بعد تو بڑوں میں صرف وہی رہ گئے ہیں۔ حضرت وامق جونپوری بھی بفضلِ خدا موجود ہیں اور ۸۲ برس کی عمر میں ویسے ہی شعر کہہ رہے ہیں جیسے پچاس برس قبل کہتے تھے۔ لیکن ان کی بڑائی عمر کی وجہ سے ہے۔ عمر میں بڑا ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ شاعر کو مشاعروں میں سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا ہے۔ حالاں کہ غور سے دیکھا جائے تو یہ فائدہ نہیں سراسر نقصان ہے۔ آٹھ دس گھنٹوں تک دوسروں کا کلام سننے کے بعد بزرگ شاعر کی باری اس وقت آتی ہے جب وہ اپنا کلام سنانے کے تو کیا اٹھ کر گھر جانے کے بھی قابل نہیں رہتا۔

اخترالایمان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جدید نظم کو فکر و فن کی نئی جہتوں سے آشنا کرایا ہے اور بقول خود اپنے عہد کے آدمی کے روحانی کرب کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ ان کا اسلوب عام شاعروں سے یکسر مختلف ہے۔ بظاہر کھردرا' بباطن ملائم۔ وہ خوابیدہ لفظوں کو جگا کر اس جہانِ معنی کا سراغ دیتے ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ مظفر علی سید کا یہ خیال درست ہے کہ جب ہم جدید شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں عموماً صرف دو آوازیں سنائی دیتی ہیں جو راشد اور فیض کی ہیں جب کہ ایک تیسری آواز بھی موجود ہے جو پہلی دو آوازوں سے کسی طرح کم تر نہیں اور یہ اخترالایمان کی آواز ہے۔

پچھلے دنوں اختر صاحب کراچی تشریف لائے تو انھیں بقولِ میر' مانند جامِ مے' ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کے اعزاز میں اتنی تقریبیں ہوئیں کہ سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ سب سے بڑی بات یہ

ہے کہ وہ کسی خاص گروپ کے منظور نظر نہیں تھے۔ ترقی پسند ہوں یا تنزل پسند' جدیدیے ہوں یا روایتی ادب پرست' سب نے انھیں آنکھوں میں جگہ دی۔ حد تو یہ ہے کہ کراچی کے ڈاکوؤں نے بھی انھیں نظرانداز نہیں کیا۔ جس روز وہ انجمن ترقی اردو کے جلسے میں اپنا کلام سنانے اور اپنے بارے میں مظفر علی سید کا مقالہ سننے کے لیے جارہے تھے تو راستے میں ڈاکوؤں نے اسلحے کے زور پر ان کی کار چھین لی جس کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ کراچی کے اخباروں میں شائع ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکو اختر صاحب کی بیاض چھیننے آئے تھے لیکن جب معلوم ہوا کہ موصوف بیاض رکھتے ہی نہیں' تمام کلام ان کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے تو ڈاکو غصے میں کار چھین کر لے گئے۔... گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است۔

بیاض چھیننے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سلسلے میں بعض ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اختر صاحب کراچی کی ہر تقریب میں کم از کم پچاس نظمیں ضرور سناتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس پر کچھ لوگوں نے سوچا ان کی بیاض ان سے لے لی جائے۔ مگر ان سادہ لوحوں کو معلوم نہ تھا کہ اختر صاحب بیاض بردار شاعر نہیں ہیں۔ ان کا حافظہ بے مثال ہے۔ انھیں اپنا سارا کلام اسی طرح یاد رہتا ہے جس طرح بعض شاعروں کو اپنے معاصرین کے عیوب ازبر ہوتے ہیں۔

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں۔ اصل بات جس کی خاطر ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں یہ ہے کہ اختر صاحب خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار آدمی بھی ہیں۔ گفتگو وہ بہت اچھی کرتے ہیں۔ اتنی اچھی کہ بعض اوقات سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری زیادہ فکر انگیز ہے یا ان کی گفتگو۔ کراچی کی کئی محفلوں میں انھوں نے گفتگو کا جادو جگایا۔ بہت سے اخباروں رسالوں میں ان کے انٹرویو شائع ہوئے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ان ساری گفتگوؤں کو کتابی صورت میں مرتب کر دیا جائے۔ اختر صاحب کی شاعری کی کلیات "سروسامان" کے نام سے چھپی ہے۔ ان کی گفتگوؤں کا مجموعہ "بے سروسامان" کے نام سے چھاپا جاسکتا ہے۔ یہ نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ اختر صاحب نے اپنے انٹرویوز میں اپنے معاصرین کو شاعری کے اعتبار سے بے سروسامان ثابت کیا ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے اختر صاحب کی وہ طویل گفتگو ہے جو رسالہ "طلوعِ افکار" کراچی کے دسمبر ۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اختر صاحب نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو کچھ کہا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے صرف بڑے شاعر ہی نہیں' اکیلے شاعر بھی ہیں۔

یعنی ان کے علاوہ کوئی قابل ذکر شاعر موجود نہیں ہے۔ ترقی پسند شاعروں کو انھوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ: "اکثر ترقی پسند احباب کی شاعری VERCIFICATION یعنی کلام موزوں سے آگے نہیں جاتی"۔ مجاز، فیض، مخدوم اور فراق کو تو وہ کسی حد تک شاعر مان لیتے ہیں لیکن باقی سب کی شاعری انھیں "تخلیقی شاعری سے باہر کی چیز نظر آتی ہے"۔

انھوں نے دو نمایندہ ترقی پسند شاعروں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے نام لے کر ایسی باتیں کہی ہیں جن کی توقع کسی بھی بامروت شخص سے نہیں کی جاسکتی۔ سردار جعفری کو شاعر نہیں "موزوں طبع" قرار دیا ہے اور کیفی اعظمی کے بارے میں فرمایا ہے: "ایک اور شاعر ہیں کیفی اعظمی، بڑا نام ہے ان کا، آئے دن ان کے جشن ہوتے رہتے ہیں۔ ترقی پسندوں کے مقبول شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری بھی دوستی ہے لیکن شاعری کے معاملے میں انھیں GENUINE شاعر نہیں سمجھتا۔ ان کے ہاں VERCIFICATION کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اب آپ اپنی کوشش اور اپنے گروپ کی کوشش سے تو شاعر نہیں بن سکتے۔ یہ تو خداداد معاملہ ہے۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ایسے بے شمار لوگ ہیں جو پروپیگنڈے کے زور پر راتوں رات شہرت حاصل کر لیتے ہیں لیکن ایسی شہرت کس کام کی اور وہ کتنے دن چل سکے گی"۔

ترقی پسندوں سے ہمیں بھی بہت سی شکایات ہیں مثلاً ایک شکایت یہ ہے کہ جب شعر و شاعری کے بغیر بھی آدمی ترقی پسند بن سکتا ہے تو پھر شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن اختر صاحب کی ناراضی کچھ ذاتی قسم کی معلوم ہوتی ہے۔ کیفی اعظمی کو وہ ایک طرف اپنا دوست بھی کہہ رہے ہیں اور دوسری طرف ان کے شاعر ہونے سے انکار بھی کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں دوستوں کے عیبوں کو خوبیوں میں شمار کیا جاتا تھا، افسوس کہ اب خوبیاں بھی عیب بن جاتی ہیں۔ اس گفتگو کے دوران اختر صاحب نے یہ بھی کہا: "ابھی تک تو میری شاعری پر لوگوں کی توجہ خاطر خواہ نہیں ہو رہی ہے، ترقی پسندوں نے تو خیر دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا ہے حالاں کہ میری شاعری ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ترقی پسندانہ مزاج رکھتی ہے"۔ ترقی پسندوں نے اختر صاحب کو نظر انداز کیا تھا، انھوں نے سارے ترقی پسندوں کو خارج از آہنگ قرار دے کر معاملہ کو برابر کر دیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

اختر صاحب کا یہ شکوہ بے جا ہے کہ لوگوں نے ان کی شاعری پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ظاہر

ہے "لوگوں" سے مراد نقاد ہیں۔ اختر صاحب کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کی شاعری نقادوں کے غلط تخمینوں سے محفوظ رہی۔ ان کو آج جو مقام حاصل ہے وہ ان کی شاعری کی وجہ سے ہے' ورنہ نقاد یہ دعویٰ کرتے کہ یہ سب کچھ ان کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے۔

اختر صاحب صرف ترقی پسندوں ہی سے ناخوش نہیں' دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی ان کی رائیں خاصی دلچسپ ہیں۔ فیض سے انھیں یہ شکایت ہے کہ ان کی شاعری میں سجاوٹ کا عنصر زیادہ ہے۔ وہ سجاوٹ ہی میں الجھ کر رہ گئے' اصل معنویت تک نہیں پہنچ پائے۔ ن۔ م۔ راشد کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: "ایک طرح کا بڑبولا پن ان میں بہت ہے۔ غیر ضروری بلند آہنگی پیدا کرنے کی شعوری کوشش نے ان کی شاعری کو مجروح کیا ہے"۔ میرا جی کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا ہے' لیکن انھیں راشد کے مقابلے پر GENUINE شاعر مانا ہے۔ اس سے مقصود میرا جی کی تعریف نہیں' راشد کی مزید تنقیص ہے۔

مجید امجد کے بارے میں کہا ہے: "وہ تو ہماری کاپی کرتے رہے ہیں۔ ان پر ہماری چھاپ رہی ہے۔ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ بہتر مستقبل رکھتے تھے"۔ اس قولِ برحق سے یہ معنی بھی نکالے جاسکتے ہیں کہ مجید امجد کی زندگی نے وفا اس لیے نہ کی کہ وہ اختر الایمان کے نقال تھے۔ لیکن ہمیں اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ اختر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے' اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر مجید امجد کی زندگی وفا کرتی تو وہ ان کے نقال کی حیثیت سے بہتر مستقبل رکھتے تھے۔

اختر صاحب نے ازرہِ سخن پروری' ناصر کاظمی کو اچھا شاعر مان لیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ غزل ہی میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ مطلب یہ کہ اگر وہ غزل کے حصار سے باہر نکل کر نظمیں بھی لکھتے تو زیادہ اچھے شاعر ہوتے۔ ممکن ہے اس بات پر کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ غالب بھی تو غزل میں محصور ہو کر رہ گیا تھا' پھر وہ اتنا اچھا اور بڑا شاعر کس طرح بن گیا؟ مفروضہ معترض کی خدمت میں عرض ہے کہ اختر صاحب نے غالب کو بھی نہیں بخشا۔ حالاں کہ غالب کے ساتھ کسی "معاصرانہ چشمک" کا امکان نہیں ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

اختر صاحب اس شعر کے بارے میں فرماتے ہیں: "اب اس بات کا نہ تو کوئی سیاق ہے نہ

سباق۔ لیکن اگر اسی پہلو کو نظم کا پیکر ملتا تو وہ کتنی بڑی نظم ہوتی اور انسان کی تمنا اور زندگی کی نارسائیوں سے کیا خوبصورت ڈراما وجود میں آتا"۔

افسوس کہ اختر صاحب غالب کے زمانے میں نہ ہوئے' ورنہ ان کے مشورے پر وہ سیاق و سباق کے بغیر باتیں نہ کرتا اور اپنی ساری توجہ "بڑی بڑی" نظمیں لکھنے پر صرف کر دیتا!

ساقی فاروقی بھی موضوعِ گفتگو بنے اور ان کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں ہوئیں:

سوال : ساقی فاروقی جدید حسیت کے شاعر ہیں۔ علامتی طرز اظہار بھی رکھتے ہیں۔ آپ ان میں کیا امکانات دیکھتے ہیں؟

جواب : ابھی تو خیر وہ لکھ رہے ہیں۔ ابھی انھوں نے اپنی شناخت نہیں بنائی۔ راشد کی انگلی پکڑ کر چلنے کی کوشش ان کے امکانات کو کم کرتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے اندر کے پاور فل شاعر کو باہر آنے دیں۔

سوال : لیکن وہ مصرع کہنے میں بہت محنت کرتے ہیں۔

جواب : صرف محنت سے کیا ہوتا ہے بھائی!

ہمارے نزدیک اس گفتگو کا سوائے اس کے کوئی مقصد نہیں کہ ساقی فاروقی کی کردار کشی کی جائے۔ اول تو یہ پوچھنا درست نہیں کہ اختر صاحب کو ساقی میں کیا امکانات دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کسی اور کو کوئی چیز نظر نہیں آتی وہاں بے چارے اختر صاحب کو کیا دکھائی دے گا۔ اس سوال کا جو جواب دیا گیا' وہ بھی بڑی حد تک نامناسب ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ساقی نے ابھی تک اپنی شناخت نہیں بنائی۔ اب تک ساقی نے سوائے شناخت کے اور بنایا ہی کیا ہے۔ شاعری تو ضمنی چیز ہے جو شناخت بنانے کے دوران خود بخود بنتی چلی گئی۔

اختر صاحب کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ راشد کی انگلی پکڑ کر ساقی چل رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کی نہیں تعریف کی بات ہے۔ ساقی دوسرے شاعروں کی طرح چھلانگیں نہیں لگاتے بلکہ درجہ بدرجہ بلندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آج وہ راشد کی انگلی پکڑ کر چل رہے ہیں کل پہنچا پکڑیں گے اور پرسوں راشد کے کاندھوں پر سوار ہو جائیں گے۔ جس طرح آج یہ کہا جاتا ہے کہ احمد فراز کے رنگ میں فیض شعر کہتے تھے' اسی طرح کل یہ کہا جائے گا کہ ن۔م۔ راشد' ساقی فاروقی کے مقلد تھے۔

اختر صاحب کا یہ مشورہ بھی صائب نہیں ہے کہ ساقی اپنے اندر کے پاور فل شاعر کو باہر آنے دیں۔ اول تو یہی یقینی نہیں ہے کہ ساقی کے اندر کوئی پاور فل شاعر موجود ہے۔ اگر ہو بھی تو اُس کا باہر آنا مناسب نہیں۔ ساقی کسی کو اپنے سے زیادہ پاور فل ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ خواہ مخواہ جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ لوگ طعنے دیں گے کہ ساقی کو کیا ہو گیا ہے' پہلے افتخار عارف سے لڑتا تھا' اب اپنے اندر کے پاور فل شاعر کو باہر نکال کر اس سے لڑ رہا ہے۔

سوال کرنے والے نے یہ کہہ کر کہ ساقی مصرع کہنے میں بڑی محنت کرتے ہیں' اپنی دانست میں ساقی کی تعریف کی ہے' حالاں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساقی مکمل نظم یا مکمل غزل پر محنت نہیں کرتے صرف مصرعے پر محنت کرتے ہیں۔ مصرعے پر محنت کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی صبح و شام یہی کام کرتے ہیں۔ ان کا ہر مصرع ان کی محنتِ شاقہ کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن جب غزل میں یہی مصرعے آمنے سامنے آجاتے ہیں تو استاد کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔

اختر صاحب نے محنت والی بات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی نہلے پر دہلے کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ صرف محنت سے کیا ہوتا ہے' عجیب سی بات ہے۔ حالاں کہ اختر صاحب کو آج شاعری میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ ان کی محنت ہی کا نتیجہ ہے۔ اسی گفتگو کے دوران انھوں نے خود اپنی محنت کی روداد ان لفظوں میں بیان کی ہے: "یہ نظم اب جو ہم کہہ رہے ہیں تو اس تک آتے آتے بڑا زمانہ لگا ہے۔ بیچ میں ایک پیریڈ ایسا بھی آیا جب میں نے افسانہ نگاری بھی ترک کر دی تھی اور شاعری سے بھی جی اچاٹ رہنے لگا تھا۔ لیکن طبیعت کچھ نہ کچھ کرنے پر اکساتی تھی۔ چنانچہ ہم نے کسرت شروع کر دی۔ پہلوانی کرنے لگے۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگانے لگا۔ میلوں دوڑتا پھرتا۔ سر منڈوا دیا۔ غرض عجب واہی تباہی صورت حال درپیش تھی"۔

افسوس کہ ساقی فاروقی نے غلط سمت میں محنت کی۔ خود تو سر نہ منڈوایا' دوسروں ہی کے سر مونڈتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آج اختر صاحب کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ ساقی جس قسم کی محنت کرتے ہیں' اس کے نتیجے میں اچھی شاعری وجود میں نہیں آتی۔

(۲۵/ جنوری ۱۹۹۰ء)

طبع آزمائی یا طالع آزمائی

لوگ آپ بیتی کیوں لکھتے ہیں؟ اس سلسلے میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ بیتی ایک ایسا ذریعۂ اظہار ہے جس میں جھوٹ بولنے کی زیادہ سے زیادہ گنجایش پائی جاتی ہے اور یہ خوف بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس جھوٹ کو پکڑے گا' اس لیے وہ لوگ آپ بیتی ضرور لکھتے ہیں جنھیں عملی زندگی میں سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنے کے مواقع ذرا کم ملتے ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ آپ بیتی ہی واحد ذریعۂ اظہار نہیں ہے جس میں جھوٹ بولنے کی خواہش پوری کی جاسکے۔ یہ کام اور بھی کئی طریقوں سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تنقید لکھی جاسکتی ہے کہ اس میں جھوٹ تو کیا' اپنے ضمیر کے خلاف لکھنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ شاعری کی جاسکتی ہے جس میں خیالی محبوب سے ایسے ایسے فرضی واقعات منسوب کیے جاتے ہیں جو اگر کسی اصلی فرد سے منسوب کیے جائیں تو وہ مارے شرم کے خودکشی کرلے اور شاعر اعانتِ جرم کے الزام میں قانون کی زد میں آجائے۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ جو لوگ زندگی میں کچھ نہیں کرپاتے' وہ اس کی تلافی کے لیے آپ بیتی لکھتے ہیں' اور بہت سے قومی اور بین اقوامی واقعات کے پس منظر میں اپنی ذات کی جھلکیاں دکھا کر نہایت انکسار سے یہ مژدہ سناتے ہیں:

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

ہمیں اس میں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ آپ بیتی تو لکھی ہی جاتی ہے اپنی ذات کی جھلکیاں دکھانے کے لیے' ان جھلکیوں کی وجہ سے اگر بعض قومی اور بین اقوامی واقعات صفحۂ قرطاس پر محفوظ ہو جائیں تو کیا برا ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ بیتی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں لکھنے والا اپنے چہرے کے اصلی خدو خال دیکھتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہی لوگ آپ بیتی لکھتے ہیں جو آئینہ دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتے' اس لیے وہ آپ بیتی کے چوکھٹے میں اپنی ایسی تصویر لگا دیتے ہیں جس کے خدو خال اصل سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ دونوں رائیں انتہا پسندانہ ہیں۔ آپ بیتی لکھ کر کوئی اپنی اصل صورت دیکھنا چاہتا ہے نہ مسخ شدہ' یہ تو بس دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ زیادہ تر لکھنے والوں کے لیے اور کبھی کبھار پڑھنے والوں کے لیے۔

ہمیں آپ بیتیوں سے بے حد دلچسپی ہے۔ جونھی اس نوعیت کی کوئی کتاب چھپتی ہے' ہم اسے پڑھ ڈالتے ہیں۔ اس طرح جہاں ہمیں ایک طرف یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ آپ بیتیاں لکھنے والوں نے اپنی زندگیاں کس طرح اعلیٰ مقاصد کی خاطر صرف کیں' وہیں دوسری طرف ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھ پڑھ کر اپنی زندگی کس طرح ضائع کر رہے ہیں۔ یہ احساس پچھلے کچھ دنوں سے زیادہ ہی ہو گیا ہے کیونکہ اس دوران میں پے در پے کئی آپ بیتیاں ہماری نظر سے گزری ہیں۔

پہلی آپ بیتی مرزا جعفر حسین کی ہے جو "کشمکشِ حیات" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے' اور وہیں سے شائع ہو سکتی تھی کیونکہ کوئی دوسرا شہر اس کی اشاعت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس میں زیادہ تر لکھنؤ کی مقامی سیاست ہے جس سے شاید اب خود لکھنؤ والوں کو بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کتاب میں کچھ مواد عام دلچسپی کا بھی ہے۔ خصوصاً وہ حصے جن میں مصنف نے اپنی زندگی کے رنگین واقعات بیان کیے ہیں۔ ان رنگین واقعات کو بوڑھے چونچلوں نے رنگین تر بنا دیا ہے۔

دوسری آپ بیتی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی ہے "رو میں ہے رخشِ عمر" جس میں انھوں نے برصغیر کے سیاسی حالات کو بھی اپنے ذاتی اور نجی حالات کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں عام دلچسپی کا اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ خصوصاً تجارتی اداروں کے اشتہار جو بڑے اہتمام سے شامل کیے گئے ہیں۔ آپ بیتی تو خود ہی مصنف کا اشتہار ہوتی ہے اس میں دوسروں کے اشتہار بھی شامل کر لینا بڑی فراخ دلی اور عالی حوصلگی کی بات ہے۔

تیسری آپ بیتی "عشرتِ فانی" ہے جو عشرت رحمانی کی تصنیف ہے اور ہر اعتبار سے اس لائق ہے کہ انھیں کی تصنیف کہلائی جا سکے۔

اس مختصر صحبت میں یہ ممکن نہیں کہ مذکورہ تینوں کتابوں پر گفتگو کی جائے۔ لہٰذا فی الحال عشرت رحمانی کی کتاب کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔

عشرت رحمانی ہمارے بزرگ ادیبوں میں سے ہیں۔ یہ بزرگی انھوں نے سن و سال اور علم و فضل دونوں کے ذریعے حاصل کی ہے۔ ان کی پوری زندگی ریڈیو اور اسٹیج پر گزری ہے۔ لائبریریوں کے وہ کبھی قریب سے بھی نہیں گزرے۔ اس کے باوجود انھوں نے لائبریریوں کو باثروت بنانے کا فریضہ دوسرے ادیبوں سے بڑھ کر انجام دیا ہے۔ یعنی ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتّب کی ہیں۔ تاریخ و سیرت، تنقید و تحقیق، ناول، ڈراما، شاعری، غرض کہ ادب کی شاید ہی کوئی صنف ہو گی جس میں انھوں نے طبع آزمائی یا طالع آزمائی نہ کی ہو۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کثیرالتصانیف مصنفین کچھ عرصے تک تو خود ہی لکھتے ہیں، پھر تائیدِ غیبی کے سہارے کام چلنے لگتا ہے۔ لیکن عشرت صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی ساری کتابیں انھوں نے خود ہی لکھی ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں بلکہ بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ ان کے پڑھنے میں بھی کوئی دوسرا جناب مصنف کا شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کی آپ بیتی ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔ اسے پڑھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے اور اگر قاری سمجھ دار ہو تو عبرت بھی حاصل کر سکتا ہے۔

عشرت رحمانی صاحب نے آپ بیتی کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے : "میری اب تک کی اکہتر سالہ زندگی میں جو بے شعوری اور شعور کے دور سے گزری نہ میں نے بہ خیالِ خویش کوئی ایسا شاندار کارنامہ انجام دیا جس پر ناز کروں، اور آپ سے دعویٰ کروں کہ میری یہ حقیر خود نوشت ایسی حیرت انگیز اور دلچسپ و دل پذیر داستان حیات ہے کہ اس کے پڑھنے اور ختم کرنے کے لیے آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی یا اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔ یہ میری بے ربط اور بے ڈھنگی زندگی کی مسلسل یا غیر مسلسل جیسا بھی سمجھیے، ایک معمولی سی سرگزشت ہے۔ قارئین شاید اس صورت میں مجھ سے یہ سوال کریں کہ پھر یہ میں نے کیوں لکھی اور کیوں چھپی، تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کا ذمہ دار میں نہیں، اس لیے جواب دہی سے بری الذمہ ہوں"۔

آگے چل کر انھوں نے آپ بیتی لکھنے کی ذمہ داری اپنے بعض دوستوں خصوصاً ڈاکٹر عبادت

بریلوی پر ڈالی ہے۔ معذرت خواہی کا یہ انداز نہایت دلچسپ ہے۔ عشرت صاحب کو شاید یہ خوف ہوگا کہ حشر کے دن اس کتاب کے لکھنے پر پوچھ گچھ ہوگی۔ لہٰذا انھوں نے ذمہ داری ڈاکٹر عبادت بریلوی پر ڈال دی۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب سے دلی ہمدردی ہے کہ انھیں حشر کے دن اپنی کتابوں کے لکھنے کا جواز پیش کرنے کے ساتھ ساتھ عشرت صاحب کی کتاب کا دفاع بھی کرنا پڑے گا۔

عشرت صاحب نے اپنی کتاب کو "معمولی سی سرگزشت" کہا ہے۔ یہ محض انکسار ہے۔ بڑے سائز کے ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتاب کو کسی طرح بھی "معمولی" نہیں کہا جا سکتا۔ یہ غیر معمولی طور پر ضخیم کتاب ہے اور اس میں شبہہ نہیں کہ دلچسپ بھی ہے۔ اس میں رام پور کلکتہ، دلی، لکھنؤ، ڈھاکا، کراچی، راولپنڈی اور لاہور میں گزارے ہوئے دنوں کی یادیں پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں اس طرح لے لیتی ہیں کہ وہ کتاب کو شروع سے آخر تک یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ اس میں بہت سے ادیبوں اور ریڈیو اور اسٹیج سے وابستہ افراد کا تذکرہ ہے۔ بعض ادیبوں (مثلاً امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی وغیرہ) کے بارے میں بڑی نادر معلومات ملتی ہیں۔ تقریباً پون صدی پر محیط اس داستان حیات میں ہر مذاق کے قاری کو اپنی دلچسپی کا سامان مل جاتا ہے لیکن کہیں بے جا اجمال اور کہیں غیر ضروری تفصیل کھٹکتی ہے۔ عشرت صاحب کے بعض اہم ادیبوں (نیاز فتح پوری، احتشام حسین، کرشن چندر وغیرہ) سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ ان کا ذکر صرف نام گنوانے کی حد تک ملتا ہے۔ حالانکہ عشرت صاحب ان کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ غیر ضروری تفصیلات سے کتاب کو "گراں بار" کرنے کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ رسالہ "شمع" دہلی کے ادارے کی طرف سے ایک ہفتہ وار اخبار "آئینہ" جاری کیا گیا تھا جس کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری تھے۔ عشرت صاحب نے "آئینہ" کے مالکان اور ظ۔ انصاری کے اختلافات پر کئی صفحے ضائع کیے ہیں۔ عشرت صاحب کو یہ سب کچھ لکھتے ہوئے شاید یاد نہیں رہا کہ وہ آپ بیتی لکھ رہے ہیں نہ کہ ظ۔ انصاری کی سوانح عمری۔

بعض جگہ عشرت صاحب نے قومی، بین اقوامی اور ذاتی حالات کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ خاصی دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً انھوں نے ۱۹۵۸ء کو ایک "انقلاب انگیز سال" کہا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ اس سال مصر میں فوجی انقلاب آیا، پاکستان میں ایوب خان نے مارشل لا لگایا اور خود جناب عشرت نے دوسری شادی کی۔ ہمارے خیال میں ۱۹۵۸ء کے "انقلاب انگیز سال" ہونے کے لیے آخری وجہ کافی تھی۔ ناصر اور ایوب خان کے کاموں کی اس

بابرکت کام کے سامنے کوئی اہمیت نہیں۔

یہ کتاب اس اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں کتابت کی غلطیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اتنی تو اردو کی کتابوں میں معنوی اغلاط بھی نہیں ہوتیں۔ شاید ہی کوئی صفحہ ہو گا جس پر کم از کم چھ سات غلطیاں نہ ہوں۔ حد تو یہ ہے کہ ابواب کے عنوانات میں بھی یہ خصوصیت برقرار رکھی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشرت صاحب نے یہ کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کی فرمائش پر تصنیف ہی نہیں کی، اس کی کتابت کے لیے بھی انھیں کو زحمت دی ہے۔

(۲۹/ مئی ۱۹۸۶ء)

شاعری یا ہفت خوانِ رستم

ایک زمانہ تھا کہ جب کسی شاعر کے اوصاف بیان کیے جاتے تھے تو سب سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ اس کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر کسی شاعر کا مجموعہ شایع نہ ہوا ہو تو اُسے شاعر کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں شاعر کے مجموعے سے اس کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا تھا' اب خامیاں سامنے آجاتی ہیں۔ اسی لیے سمجھ دار شاعر اپنا مجموعہ نہیں چھپواتے اور جو شاعر صرف شاعر ہوتے ہیں وہ نہ صرف مجموعہ چھپواتے ہیں بلکہ یکے بعد دیگرے مجموعوں کی قطار باندھ دیتے ہیں۔

ہمارے سامنے کئی ایسی مثالیں ہیں کہ کسی شاعر کے بارے میں اچھی رائے اس وقت خراب ہو گئی جب اس کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہوا۔ دوسرے مجموعے کی اشاعت پر مزید خراب ہو گئی۔ تیسرے مجموعے کے چھپنے کے بعد خرابی ہی خرابی رہ گئی شاعری غائب ہو گئی۔

جون ایلیا کا معاملہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ مجموعۂ کلام کی اشاعت سے پہلے وہ جتنے اچھے شاعر سمجھے جاتے تھے' اشاعت کے بعد وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ہم نے اب تک ان کی نظمیں اور غزلیں فرداً فرداً پڑھی تھیں اور اُن سے ایک خوشگوار اثر قبول کیا تھا۔ اب جو اُن کا مجموعۂ کلام "شاید" پڑھنے کا اتفاق ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے بکھرا ہوا شاعر سمٹ کر ہمارے سامنے آگیا ہو۔ ایسا شاعر جس کے خیالات اپنے ہیں' الفاظ اپنے ہیں اور پیرایۂ بیان اپنا ہے۔ خوبیاں تو الگ رہیں' خامیاں اور گمراہیاں بھی جو ہیں وہ ان کی اپنی ہیں۔ اس معاملے میں بھی وہ کسی کے مقلد یا مرہونِ منت نہیں۔ خود کفیل ہیں۔ اسی لیے اپنا راستہ الگ بنایا ہے۔

جون ایلیا ایک ایسا شاعر ہے جس نے اردو شاعری کی روایات سے انحراف نہیں کیا لیکن روایتی

ہونے سے اپنے آپ کو بچایا ہے۔ جہاں تک قادر الکلامی کا تعلق ہے' موجودہ دور کے دو ایک شاعروں کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ان کا مقابلہ کر سکے۔ اس معاملے میں وہ اپنے حقیقی بڑے بھائی رئیس امروہوی کے حقیقی جانشیں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مرحوم قادر الکلام ہی نہیں' قادر انداز بھی تھے۔ مگر جون ایلیا ہمیشہ سپر انداز رہتے ہیں۔ مزاج ہی ایسا پایا ہے کہ کسی کو نشانہ بنا سکتے ہیں اور نہ خود بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خدا کرے ہمارا یہ کالم ان کی نظر سے نہ گزرے' اور گزرے تو اس کے مطالب ان پر ناخوشگوار اثر نہ چھوڑیں۔

جون ایلیا بلا شبہہ ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر ہیں لیکن حیرت ہے کہ آج تک ان کی شاعری کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ کسی ڈھنگ کے نقاد نے ان کے بارے میں دو سطریں بھی نہیں لکھیں۔ حالاں کہ یہی نقاد معمولی درجے کے شاعروں کی تعریف میں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا سو جون ایلیا کو بھی ان کا حق ملا اور خوب ملا۔ دوبئی میں ان کا جشن منایا گیا۔ اس موقع پر اُن کا مجموعہ "شاید" شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضخیم مجلّہ بھی منظرِ عام پر آیا جس میں ساٹھ ستر ہم عصروں نے انھیں "خراجِ تحسین" پیش کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس خراجِ تحسین کے ڈانڈے "تحسینِ ناشناس" سے جا ملتے ہیں۔

بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ جون ایلیا کی گھر میں نہ سہی' گھر سے باہر قدر ہوئی۔ دوبئی کے جنگل میں مور ناچا' دیکھنے والوں نے دیکھا اور رقصِ بسمل کی داد دی۔ دوبئی جیسے متمدن مقام کو ہم نے جنگل اس لیے کہا ہے کہ وہاں درہم و دینار کے درختوں کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ دنوں سے ہمارے مور یعنی شاعر رقص کرنے کے لیے اسی جنگل کا رخ کر رہے ہیں۔

جون ایلیا کے کلام کے مطالعے سے دل خوش ہوا لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی اس طویل دیباچے کے مطالعے سے حاصل ہوئی جس کے ضمیمے کے طور پر کلام شائع کیا گیا ہے۔ مولانا حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا تھا۔ یہ مقدمہ ایسا مقبول ہوا کہ لوگ دیوان کو بھول گئے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں جون ایلیا کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش نہ آئے۔ شاعروں کو طویل اور دلچسپ دیباچے لکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیوں کہ یہ شاعری کی مقبولیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

جون ایلیا نے دیباچے میں اپنی ذات کے انکشاف کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے مسائل کو بھی پانی کر دیا ہے اور جہاں کہیں عالمانہ زبان استعمال کی ہے وہاں مفاہیم و مطالب بھی پانی پانی

ہوتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں: منطق جب انتاج اور استنتاج کے مندرج عمل میں غیر مندرج ہو جائے تو مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے۔ منطق جب انتاج اور استنتاج کے استخراجی اور استقرائی عمل میں مندرج رہے تو سائنس وجود میں آتی ہے اور منطق جب احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ صورت پذیر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے"۔

ہماری طرح بے شمار لوگوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہو گا کہ شاعری کتنی مشکل سے وجود میں آتی ہے۔ ردیف اور قافیے کی حد تک تو کام آسان ہے لیکن احساس کی مکانیت اور زمانیت میں تخیل اور جذبے کے جمالیاتی آہنگ کے ساتھ منطق کو صورت پذیر کرنا، ہفت خوانِ رستم طے کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اتنی مشقت کے بعد ہی اس قسم کے شعر کہے جاسکتے ہیں:

ڈھونڈتی ہے اک آہو کو
اک مادہ آہو مجھ میں

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

صبح دفتر گیا تھا کیوں انساں
اب یہ کیوں آرہا ہے دفتر سے
نہیں بد تر کہ بدترین ہوں میں
ہوں خجل اپنے نصف بہتر سے

بھاری بھر کم اصطلاحوں میں جون ایلیا نے شاعری کی جو تعریف کی ہے اس سے عام قاری یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جون ایلیا کی شاعری بھی ان کے علم و فضل کی طرح ثقیل ہوگی اور اُس میں بھی حیات و کائنات کے انھیں مسائل سے دھینگا مشتی ہوگی جو دیباچے میں نظر آتے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ جون ایلیا شاعری میں فلسفہ نہیں جھاڑتے، شاعر ہی نظر آتے ہیں اور شاعر بھی ایسے کہ کچی عمر کے پڑھنے والوں پر جادو کر دیتے ہیں۔ "شاید" کے آخری صفحے پر یہ دو قطعے ہیں:

شرم، دہشت، جھجک، پریشانی
ناز سے کام کیوں نہیں لیتیں
آپ، وہ، جی، مگر یہ سب کیا ہے
تم مرا نام کیوں نہیں لیتیں

پسینے سے مرے اب تو یہ رومال
ہے نقدِ نازِ الفت کا خزینہ
یہ رومال اب مجھی کو بخش دیجے
نہیں تو لائیے میرا پسینہ

دیباچے کے اتنے گہرے فلسفے کے بعد اتنی سامنے کی شاعری ایک معجزہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فلسفی پر شاعر بلکہ نوعمر عاشق غالب آگیا ہے۔ دوسرا قطعہ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے یہ بات غلط ثابت ہوجاتی ہے کہ شاعر اپنے خونِ جگر سے شعر لکھتا ہے۔ اعلیٰ شاعری پسینے سے بھی لکھی جاسکتی ہے بہ شرطے کہ شاعر میں لکھنے کی اور خون کی جگہ پسینہ بہانے کی صلاحیت ہو۔ شاید یہی وہ پسینہ ہے جسے علامہ اقبال "عرقِ انفعال" کہا کرتے تھے۔

دیباچے میں جہاں کہیں جون ایلیا نے اپنے بارے میں کچھ لکھا ہے وہاں رنگیلے پیا جان عالم واجد علی شاہ اختر یاد آجاتے ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنی خودنوشت سوانح عمری "محل خانۂ شاہی" (جو "پری خانہ" کے نام سے بھی شائع ہوچکی ہے) میں لکھا ہے کہ انھوں نے پہلا عشق آٹھ برس کی عمر میں کیا تھا۔ جون ایلیا نے بھی اسی عمر میں راہ راست پر چلنا سیکھا۔ فرماتے ہیں: "میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے اہم اور ماجرا پرور سال تھا۔ اس سال میری زندگی کے دو سب سے اہم حادثے پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر کہا:

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

پہلے حادثے پر تو حیرت کی ضرورت نہیں کہ پیدائشی شاعروں کے ساتھ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایسا عمدہ شعر اور آٹھ برس کی عمر میں۔ سعادت یار خاں رنگین تو ساٹھ برس کی عمر میں ایسا شعر نہیں کہہ سکے تھے۔ ہم نے اوپر جون ایلیا کے جو شعر نقل کیے ہیں' انھیں ایک مرتبہ پھر ملاحظہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ موصوف کا رنگ سخن جو آٹھ برس کی عمر میں متعین ہوا تھا زندگی بھر برقرار رہا۔

پہلے حادثے کے سلسلے میں جون ایلیا نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے: "ایک دن کا ذکر ہے وہ لڑکی ہمارے گھر آئی۔ میں اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی فوراً لقمہ نگل لیا۔ محبوبہ کے سامنے لقمہ چبانے کا عمل مجھے انتہائی ناشایستہ' غیر جمالیاتی اور بے ہودہ محسوس ہوا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر شرمندہ ہو جایا کرتا کہ میرے جسم میں مجھ ایسے لطیف لڑکے کے جسم میں بھی معدے جیسی کثیف اور غیر رومانی چیز پائی جاتی ہے۔ اگر آپ تاریخ کے کسی ہیرو کا اور دیوی کا مجسمہ دیکھ کر یہ سوچیں کہ زندگی میں اس شخصیت کے جسم میں معدہ بھی ہو گا اور انتڑیاں بھی تو آپ کے ذہن کو دھچکا لگے گا یا نہیں؟"

مجنوں کے بارے میں بھی یہی سننے میں آیا ہے کہ وہ تہذیبی و جمالیاتی وجوہ سے لیلیٰ ہی کے سامنے نہیں' اوروں کے سامنے بھی کچھ نہیں کھاتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج تک اس کی پسلیوں کو ککڑیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

آٹھ برس کی عمر میں جو دو کام شروع ہوئے تھے وہ زندگی بھر جاری رہے۔ ابتدا میں تو صرف یہ پریشانی تھی کہ شاعر کے پاس معدہ کیوں ہے' بعد میں ایک اور پریشانی بھی لاحق ہو گئی۔ فرماتے ہیں:

"مادے' روح اور ذہن کی تباہی کے بعد میں ایک جاں کاہ ارتباطیت میں مبتلا ہو گیا۔ میری اذعانیت اور ادعائیت بدترین انجام سے دوچار ہوئی تھی۔ اب ایک بیزار کن تشکک تھا۔ محلے کی ایک لڑکی بلکہ شہر کی کتنی ہی لڑکیوں کے شوق اور اس شوق کے اظہار نہ کرنے کی اذیت تھی"۔

اس اذیت کے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی جون ایلیا کو پریشان کرتا رہا' اس کی تفصیل بھی انھیں کے الفاظ میں سنیے: "ایک اور مسئلہ بھی مجھے پریشان کرتا ہے کہ کائنات کی کوئی غایت ہے یا نہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ارسطو اور ہٹلر کے پیدا ہونے کی غایت کیا تھی؟ اگر ہمالیہ شمال کی بجائے جنوب میں واقع ہوتا تو اس میں آخر کیا استحالہ تھا؟ میں شاعر' عاشق اور معشوق کے طور پر ان مظاہر کی توجیہ کرنے کا قطعاً ذمہ دار نہیں ہوں مگر ایک سوچنے والے غیر جذباتی فرد کے طور پر میں یہ

سوال کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے"؟

مقامِ شکر ہے کہ جناب جون ایلیا نے ارسطو اور ہٹلر کے ساتھ اپنا نام نہیں لیا' ورنہ صورت حال مزید تشویش ناک ہو جاتی۔ بہرحال جو شخص بیک وقت شاعر ہو' عاشق ہو اور معشوق بھی ہو' اس کے لیے ایسے دقیق مسائل پر سوچنے کے لیے وقت نکالنا بہت بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا زیادہ کام کیسے کر لیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: "میں ۲۴ گھنٹوں میں ۲۷ گھنٹے کام کرتا ہوں"۔ جون ایلیا یقیناً ۲۴ گھنٹوں میں ۴۸ گھنٹے سوچتے ہوں گے' تب کہیں اتنے بہت سے مسائل کو وہ سلجھا پاتے ہوں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر جون ایلیا ہر وقت سوچتے رہتے ہیں تو پھر شاعری کس وقت کرتے ہوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ سال چھ مہینے میں ایسے چند لمحے ضرور آتے ہوں گے جب موصوف سوچنے کا کام چھوڑ کر شاعری کی طرف توجہ فرماتے ہوں گے۔ جب دنیا کے بے شمار کام بلا سوچے سمجھے انجام دیے جا سکتے ہیں تو شاعری کیوں نہیں کی جا سکتی؟

(۱۷/ مئی ۱۹۹۰ء)

سچّا جھوٹ یا جھوٹا سچ

آپ بیتیوں سے ہمیں خاص دلچسپی ہے۔ جب کسی آپ بیتی کے شائع ہونے کی اطلاع ملتی ہے، ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اُسے جلد سے جلد حاصل کریں اور پڑھ ڈالیں۔ اِس شوق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم جھوٹ بولنے کے مختلف طریقوں سے واقف اور اِس واقفیت سے فائدہ اٹھانے کے لائق ہوگئے ہیں۔ مگر آپ بیتی لکھنے والوں کے سامنے ہم کیا اور ہماری لیاقت کیا! آپ بیتی شاید لکھی ہی اِس لیے جاتی ہے کہ جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کیا جائے تا کہ لکھنے والے کی عظمت کا سکّہ پڑھنے والوں کے دلوں پر بیٹھے۔ قطع نظر اِس سے کہ سکّے کھوٹے بھی ہوتے ہیں، اِس مقصد کے حصول کے لیے طرح طرح کے اسالیب اختیار کیے جاتے ہیں۔ کوئی اپنی خاندانی عظمت جتانے کے لیے دوسروں کے آباواجداد کو اپنے شجرۂ نسب میں درج کرلیتا ہے اور کوئی دوسروں کے کارناموں کو اپنے نامۂ اعمال میں معمولی کام بنا کر شامل کرلیتا ہے۔ سیاست دان یہ بتاتے ہیں کہ کرۂ ارض پر جو اچھا کام بھی ہوا، وہ اُنھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ادیب یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو ادب میں ایک پُر نہ ہونے والا خلا رہ جاتا۔ حد تو یہ ہے کہ فلمی اداکاراؤں نے بھی آپ بیتیوں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُنھوں نے فطری شرم و حیا کی وجہ سے نہایت پاکیزہ زندگی گزاری ہے اور کسی نامحرم کی طرف عام زندگی میں تو کیا فلموں میں بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

اب تک ہماری نظر سے کسی صحافی کی آپ بیتی نہیں گزری تھی۔ مولانا عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" ہم نے پڑھی ہے لیکن مولانا صرف صحافی نہیں تھے اور بہت کچھ بھی تھے۔ اُن کی آپ بیتی کا بڑا حصہ اِسی "اور بہت کچھ" کے حوالے سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور آج ہی ہم ایک صحافی کی آپ بیتی کے مطالعے سے فارغ ہوئے ہیں۔ یہ آپ بیتی عام آپ

بیتیوں سے مختلف ہے اور اِس سے اِس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ آپ بیتیاں دروغ کو فروغ دینے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ اِس آپ بیتی کے لکھنے والے نے بڑی بے دردی اور سفاکی سے اپنا کچا چٹھا بیان کیا ہے۔

ویسے تو یہ موصوف کی صحافتی زندگی کی داستان ہے لیکن کہیں کہیں اُنھوں نے غیر صحافتی حالات و واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً اپنے والدِ بزرگوار کا نام بتائے بغیر اُن کے اعلیٰ کردار کی تصویر کشی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُنھوں نے پریشان حالی و عسرت کے باوجود دیانتدارانہ طور پر زندگی بسر کی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے: "کبھی کبھی والد اور والدہ میں ایسی کمینوں کی طرح تو تکار ہو جاتی کہ مجھ کو ڈر ہوتا کہ کہیں واقعی مار پیٹ شروع نہ ہو جائے۔ پھر ڈر ہوتا کہ کہیں والد طلاق نہ دے دیں والدہ کو"۔ والدین کے طرزِ عمل کو کمینوں کے طور طریقوں سے تشبیہ دینا سعادت مندی نیز صحافتی حقیقت نگاری کی انتہا ہے!

موصوف نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز لکھنؤ کے روزنامہ "حقیقت" سے کیا۔ پھر "قومی آواز" اور بعض دوسرے اخبارات میں کام کیا۔ اردو سے بیزار ہوئے تو انگریزی صحافت کا رخ کیا۔ کئی انگریزی اخباروں میں کام کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔ وہاں تقریباً ۲۰ برس قیام کیا۔ درجنوں چھوٹے بڑے اخباروں میں کام کیا۔ آخری چار برس روزنامہ "ٹائمز" جیسے بڑے اخبار کے شعبۂ ادارت میں گزارے۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو پاک و ہند کے باشندوں کو شاذ و نادر ہی ملا ہے۔

موصوف کو صحافت کا پیشہ اِس لیے پسند آیا کہ اِس میں مفت کھانے پینے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔ بغیر بلائے دعوتوں میں شریک ہونا ایک خوش گوار تجربہ تھا۔ فرماتے ہیں: "مفت خوری، پارٹیوں میں شرکت کرنے، بلا تکلف ہر جگہ پہنچنے اور منتظمین کو خفا ہو کر واپس چلے جانے کی دھمکی دینے کی ایسی عادت پڑی کہ آج تک نہیں چھوٹی"۔

صحافتی زندگی کے ابتدائی دور میں مفت خوری کے ساتھ چوری کا شغل بھی اختیار کیا۔ اِس کی تفصیل خود اُن کی زبان سے سنیے! "دفتر کے ایک کونے میں غیر فروخت شدہ اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ یہ وہ پرچے ہوتے جو ہاکر واپس کر جاتے۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن سیر سوا سیر اخبارات اپنے سینے پر جما کر شیروانی کے پورے بٹن گلے تک بند کر لیتا اور دفتر سے سیدھا نیک بخت بنیے بانکی لال کی دکان کا رُخ کرتا۔ بانکی لال دس بارہ آنے میں یہ ردّی خرید لیتا"۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا محاورہ تو

سنا تھا لیکن سینے پر چوری کا مال جمانے کی بات پہلی بار سننے میں آئی۔ "چوری اور سینہ زوری" کا مفہوم بھی صحیح طور پر پہلی مرتبہ سمجھ میں آیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب مصنف کو اپنے اعزّہ میں "چاروں طرف خون کو کھولا دینے والی ریاکاری" نظر آتی تھی۔ اِس افسوس ناک صورت حال کا ردِّ عمل خاصا خوف ناک تھا۔ فرماتے ہیں: "ابتدائی زندگی کا بیشتر زمانہ محض اِن اعزّہ کی ضد میں، میں نے شراب، جوئے اور حرام کاریوں میں گزارا"۔ اچھائی کا جواب اچھائی سے تو سبھی دے لیتے ہیں لیکن برائی کا جواب برائی سے دینا کسی کسی کا کام ہے۔ مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے شراب نوشی اور قماربازی کے مشاغل کو گھر سے باہر کی بُری صحبت کا نتیجہ نہیں بتایا۔ اِس کارنامے کا سہرا بھی اپنے ہی اعزّہ کے سر باندھا ہے۔

بہرحال یہ وہ حالات تھے جن میں موصوف کی تربیت ہوئی اور اُنھوں نے صحافت کی دنیا کے تجربات حاصل کیے اور ممتاز صحافی کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے کیوں کہ بقول خود، لوگوں کو بہت جلد موصوف کی شرانگیزی (Nuisance Value) کا احساس ہو گیا تھا۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔

انگلستان میں قیام کے دوران اپنے مشاغل کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: "مسائلِ حاضرہ پر یا ادبی و علمی مسائل پر جو کچھ دیکھنے کو ملا وہ شوق کی بنا پر نہیں بلکہ محض تنہائی کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ جب رو چسٹر میں شام کو ساحلی علاقوں کے رنگ برنگے شراب خانوں اور ناچ گھروں میں وقت گزاری کا مشغلہ ہاتھ آیا تو پھر کچھ لکھنے پڑھنے کا اور بھی کوئی سوال نہیں رہ گیا"۔ مصنف خوش قسمت ہیں کہ اُنھیں زندگی بسر کرنے کے بہتر مواقع ملے۔ جو مزہ کتابی چہروں میں ہے وہ کتابوں میں کہاں!

لکھنؤ میں جو پیشہ ورانہ تربیت حاصل کی تھی، وہ لندن میں بھی کام آئی۔ یہاں اُنھوں نے کرائے کے ایک مکان میں کرایا ادا کیے بغیر ڈیڑھ برس قیام کیا۔ وہ کس طرح؟ اِس کی تفصیل خود اُنھیں سے سنیے: "ریجنٹ کورٹ میں میں تقریباً ڈھائی سال رہا۔ ایک سال تو باقاعدہ کرایا دے کر رہا اور باقی ڈیڑھ سال بالکل مفت۔ بات یہ ہوئی کہ عمارت کسی دوسری کمپنی نے خرید لی جس کو میری موجودگی کا اِس وجہ سے علم نہیں ہوا کہ میں نے اپنی کرائے کی کتاب واپس بھیج دی تھی۔ نئی کتاب میرے پاس آئی نہیں اور رینٹ بک کی غیر موجودگی میں کرایا دینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آخر میں چپ چاپ شیفیلڈ سے جنوبی ویلز چلا گیا"۔ شیروانی میں پرانے اخباروں کو چھپانا تو آسان ہے لیکن

ایک پورے فلیٹ کو مالکوں کی نظر سے چھپا کر رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ انگلستان والے اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں، حیرت ہے کہ ایک فلیٹ میں بیٹھے ہوئی صحافی کو نہیں دیکھ سکے۔

جناب مصنف نے درجنوں ملازمتیں کیں۔ جتنی آسانی سے وہ کسی ملازمت کو چھوڑتے تھے اُتنی ہی بلکہ اُس سے زیادہ آسانی سے دوسری ملازمت مل جاتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ملازمت کے حصول میں دقتوں کا سامنا بھی ہوتا تھا اور بے روزگاری کے وقفے طویل اور تکلیف دہ ہو جاتے تھے۔ کتاب میں ایک جگہ انھوں نے اپنی بے روزگاری کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اُن کا نام غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا تھا۔ اِس کی تفصیل اُنھوں نے نہیں بتائی، ممکن ہے کہ انگلستان میں بھی وہ شیروانی کا فراخ دلانہ استعمال کرتے رہے ہوں یا ممکن ہے ملازمت دینے والوں کو معلوم ہو گیا ہو کہ موصوف اردو میں افسانہ نگاری کا شوق فرماتے ہیں۔

بے روزگاری کا زمانہ کس طرح گزرتا تھا، اِس کی تفصیل بھی خاصی دلچسپ ہے: "جہاں کہیں کسی ادارے میں صحافتی جگہ کا آسرا دیکھتا وہاں ایک درخواست داغ دیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ زیادہ تر مدیرانِ جرائد میرے نام سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ پوری طرح بیزار ہو چکے تھے۔ ہر اخبار میں میں نے کم از کم دو تین بار درخواست ضرور بھیجی تھی۔ گارجین میں میں نے ۲۳ بار درخواست بھیجی اور ٹائمز میں ۲۷ بار۔ بلکہ ایک بار تو ٹائمز کے مینجنگ ایڈیٹر نے بہت ہی سختی سے ڈپٹ کر لکھا: "میں آپ کو حتمی طور پر مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی جگہ ہے اور نہ مستقبلِ قریب میں کسی جگہ کے خالی ہونے کا امکان ہے"۔

بے روزگاری کے زمانے میں اُن کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے تھے۔ مثلاً ایک بار اُنھوں نے سوچا کہ اگر انگلستان کے تمام صحافی کسی ہوائی حادثے کا شکار ہو جائیں تو شاید حالات بدل جائیں۔ "جو لوگ مجھ کو اب تک پوچھ نہیں رہے وہی ملازمت کی پیش کش کرنے پر مجبور ہوں گے"۔

اِس آپ بیتی میں مصنف نے ہندوستانی صحافت کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے، وہ دلچسپ ہی نہیں عبرت ناک بھی ہے۔ فرماتے ہیں: "اخباری برادری میں تین طبقے ہوتے ہیں۔ ایک تو بذاتِ خود ایڈیٹر صاحبان جو سرکاری دعوتوں میں گورنروں، وزیروں یا ڈائریکٹر صاحبان سے خلوص برتنے میں مصروف رہتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں نمائندگانِ خصوصی ہوتے ہیں جو کمپنیوں، اداروں اور سفارت

خانوں وغیرہ کی طرف سے خبریں گڑھتے ہیں۔ غیر ملکی دورے کرتے ہیں اور سفارت خانوں سے وہسکی کے پارسل وغیرہ قبول کرتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر بیرونی حکومتوں کی مخصوص خدمات بھی انجام دیتے ہیں جس کے صلے میں کبھی کبھی اُن کو سفید فام سیکریٹریوں یا دوسری آبروباختہ عورتوں سے جو اِسی مقصد کے لیے ملازم رکھی جاتی ہیں، ربط ضبط کا موقع عطا کیا جاتا ہے۔ تیسرے درجے میں اسٹاف رپورٹر قسم کے اصحاب ہوتے ہیں۔ خود شعبۂ ادارت میں اُن کی حیثیت تھرڈ ڈویژن کلرک سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ مگر مقامی جلسوں، دعوتوں اور پریس شو وغیرہ میں یہ ضرورت سے زیادہ اپنی اہمیت منوانے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر جگہ ایک گروہ کی شکل میں پہنچتے ہیں۔ زیادہ تر منتظمین سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اپنی کم مائیگی یا احساسِ کمتری کا بدلہ تباہ کُن تبصرے اور تنقید کی صورت میں نکالتے ہیں۔ اِسی گروہ کے لوگ مجھ کو جلد ہی جاننے لگے اور یہ بات میرے لیے خاصی مفید ثابت ہوئی کیونکہ جب کہیں میں کھانے پینے پہنچتا تو سب اِس مفروضے میں مبتلا رہتے کہ میرے پاس دعوت نامہ تو ہو گا ہی"۔

یہ لکھنؤ کی صورتِ حال تھی۔ جناب مصنف جب دہلی پہنچے تو وہاں اُنھیں ایک نئی دنیا نظر آئی:

"دہلی کے اخباری حلقوں میں امریکی مفادات اور پالیسیوں کی وکالت و تحفظ کے لیے ایک بڑی موثر لابی ہمیشہ سے رہی ہے۔ اِن میں ایسے لوگ آج بھی ہیں جو چھوٹے چھوٹے مفادات (مثلاً شراب، عورت اور غیر ملکی دوروں) کی خاطر پورے ملک و قوم کو گروی رکھ دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ ایک بڑا حلقہ ایسے دلالوں کا بھی ہے جو محض اپنے ڈیل ڈول، قیمتی سوٹ اور کار کے برتے پر اپنے کو جرنلسٹ سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ مشکل میں مبتلا جرنلسٹوں کی چھوٹی موٹی خدمت بھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً سفارت خانوں کی کاک ٹیل پارٹیوں کے دعوت نامے یا ترجمے کا کام لا کر دینا۔ ترجمے کا کام، ایک خاص اصطلاح ہے۔ طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ملک کے سفارت خانے کا دلال کسی مشکل میں مبتلا جرنلسٹ کو خبرنامے یا کتابچے لا کر دیتا ہے جس کے ترجمے کا معاوضہ اُسی دلال کے ذریعے ملتا ہے جو مترجم کے لیے تو اچھا خاصا ہوتا ہے لیکن اصل معاوضے کا ایک چوتھائی ہوتا ہے۔ باقی تین چوتھائی دلال خود ہضم کر جاتا ہے... اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ اِس طریقِ کار سے بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے بھی احتراز کرنا مناسب نہیں سمجھا"۔

ہم نے اتنا کچھ کتاب سے نقل کر دیا لیکن کتاب اور مصنف کا نام تو بتایا ہی نہیں۔ بہتر ہو گا کہ مصنف کے نام سے پہلے اُس کے کچھ بزرگوں کے نام بتا دیے جائیں تا کہ اِن بزرگوں کی روحوں کو

شرمندہ ہونے کا موقع مل سکے۔ اِس صدی کے شروع میں لکھنؤ میں منشی امیر احمد علوی بڑے پائے کے ادیب گزرے ہیں۔ یہ محسن کاکوروی کے نواسے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کی لکھی ہوئی کئی ادبی سوانح عمریاں "یادگار انیس" اور "طرۂ امیر" وغیرہ خاص شہرت رکھتی ہیں۔ امیر احمد علوی کے صاحبزادے مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی بھی خاصے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ زیر نظر آپ بیتی کے مصنف اِنھیں ناظر کاکوروی کے فرزند ہیں۔ ان کا نام ہے قیصر تمکین اور کتاب "خبر گیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ قیصر تمکین افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُن کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ادب میں اُن کا نام افسانوں کی وجہ سے نہیں، اِس حقیقت نگاری کی وجہ سے زندہ رہے گا جس کی تفصیل اوپر کی سطور میں پیش کی گئی ہے۔

(۲۵/ اگست ۱۹۸۸ء)

انشائیے کی تدفین

ویسے تو کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے لیکن یہاں سنجیدہ ادبی تقریبیں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔ سال بھر رونمائی کے جلسے ہوتے ہیں یا سال میں ایک مرتبہ ساداتِ امروہہ والے ایک عدد مشاعرہ کر ڈالتے ہیں۔ مشاعرہ کیا' یہ بھی ایک طرح کی تقریبِ رونمائی ہوتی ہے۔ ایسے ایسے شعرا کو پڑھوایا جاتا ہے جن کے نام اور کلام سے پہلی اور آخری مرتبہ یہیں تعارف ہوتا ہے۔

اِدھر کچھ دنوں سے انجمن ترقی اردو کی وجہ سے شہر میں خاصی رونق نظر آ رہی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ بابائے اردو کے بعد تو خود انجمن 'اردو کا مزار بن چکی ہے' وہ کوئی مثبت کام کیسے کر سکتی ہے؟ اس کا جواب تو مزارِ اردو کے مجاور ہی دے سکتے ہیں' ہمیں تو یہ عرض کرنا ہے کہ انجمن نے بزرگ ادیبوں کی خدمات کا بر سرِعام اعتراف کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ستّر سال سے اوپر کے ادیبوں کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں۔ اس بہانے کراچی سے باہر کے ادیب بھی یہاں آ جاتے ہیں اور یوں کراچی والوں کو افغانی اور ایرانی تارکین وطن کے علاوہ اپنے ہم وطن ادیبوں سے ملاقات کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجمن ترقی اردو نے شام منانے کے لیے ستّر برس کی جو قید لگائی ہے' وہ نامناسب ہے کیوں کہ ادبی خدمات کو جانچنے کا معیار عمر نہیں' ادبی تخلیقات ہیں۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ ہر لکھنے والے کے نزدیک اُس کی ادبی تخلیقات کا معیار نہایت بلند ہوتا ہے۔ اگر انجمن ادبی تخلیقات کے چکر میں پڑ گئی تو پھر یہ انجمن ترقی اردو نہ رہے گی' انجمن ترقی ناقصانِ ادب ہو جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ عمر ہی کو معیار رہنے دیا جائے۔ ہاں اس کی گنجائش رکھی جا سکتی ہے کہ ستّر سال سے کم عمر کے اُن ادیبوں کے ساتھ بھی شامیں منالی جائیں جن کی

تحریریں ستّر سال پہلے کی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً محسن بھوپالی کی عمر ستّر سال سے کہیں کم ہے لیکن وہ اپنی شاعری کے اعتبار سے خوشی محمد ناظر اور چکبست لکھنوی کے ہم عصر بلکہ پیشرو دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح سلطان جمیل نسیم اگرچہ جواں سال ہیں لیکن ان کے افسانے ویسے ہی ہیں جیسے سجاد حیدر یلدرم کے زمانے میں لکھے جاتے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ شامیں منائی جا سکتی ہیں' انھیں کے خرچے پر اور انھیں کی ذمہ داری پر۔

انجمن ترقی اردو اب تک ممتاز مفتی اور ابوالفضل صدیقی جیسے بزرگ ادیبوں کے اعزاز میں جلسے منعقد کر چکی ہے۔ جولائی کے دوسرے ہفتے میں میرزا ادیب کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ایک شان دار جلسہ ہوا۔ میرزا ادیب اُن سدا بہار ادیبوں میں سے ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے ہمارے ادب کو باثروت بنا رہے ہیں۔ اُن کے قلم کی روانی اور تخلیقات کی تازگی پر اچھے اچھوں کو رشک آتا ہے۔ لکھنے کی رفتار ایسی ہے جیسے دونوں ہاتھوں سے لکھ رہے ہوں اور معیار ایسا جیسے ایک ایک لفظ کو محسوس کر کے لکھ رہے ہوں۔ وہ صحیح معنوں میں رجحان ساز ادیب ہیں۔ انھوں نے بیک وقت کئی اصنافِ ادب کو جس طرح آبرومند بنایا ہے' اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ وہ عمر کے اعتبار سے ہی نہیں' خدمات کے اعتبار سے بھی بزرگ یعنی بڑے ہیں۔

ہم نے میرزا ادیب کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ہمارے ذہن میں ان کی بزرگی کی وجہ سے ان کا تصور کچھ اس قسم کا تھا کہ لوگ انھیں سہارا دے کر اٹھاتے اور بٹھاتے ہوں گے اور ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے نوجوان اُن کے لیے عصائے پیری کا کام دیتے ہوں گے۔ لیکن جب انھیں دیکھا تو معاملہ برعکس تھا۔ وہ ماشاء اللہ جوانوں سے بڑھ کر جوان ہیں۔ چہرہ روشن' جسم پھرتیلا' چال کڑی کمان کا تیر۔ وہ ستّر سال سے اوپر کے تو بالکل نہیں لگتے۔ اور اگر ہوں بھی تو اُن کا سال ۳۶۵ دنوں کا نہیں ہو سکتا' اس سے کہیں کم کا ہو گا۔

میرزا صاحب کے جوان بلکہ نوجوان ہونے کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ واقعہ سنایا کہ انجمن کے جلسے میں میرزا صاحب کی بعض تصانیف بھی فروخت کے لیے رکھی گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے یہ کتابیں خریدیں اور میرزا صاحب سے دستخط کرائے۔ کوئی ایک گھنٹے تک میرزا صاحب دستخط کرتے رہے۔ انداز یہ تھا کہ جب کوئی مرد دستخط کراتا تو وہ صرف اپنا نام لکھ دیتے تھے لیکن جب کوئی خاتون دستخطوں کے لیے کتاب پیش کرتی تو میرزا صاحب احمد فراز کا کوئی شعر بھی

ٹانک دیتے تھے۔ ہمیں اس بات کا یقین نہ آیا۔ ہم نے تحسین صاحب سے عرض کیا: "آپ افسانہ طرازی فرما رہے ہیں، ہم نے تو سنا ہے کہ میرزا صاحب کو شعر یاد نہیں رہتے"۔ تحسین صاحب نے جواب دیا: "لیکن خاص خاص موقعوں کے لیے انھوں نے کچھ شعر یاد کر رکھے ہیں"۔ ہم نے کہا: "تو پھر احمد فراز ہی کے شعر کیوں یاد کر رکھے ہیں"؟ انھوں نے فرمایا: "اس لیے کہ احمد فراز کی ساری شاعری ہی خاص خاص موقعوں کے لیے وجود میں آئی ہے"۔

میرزا صاحب کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔ لاہور اور کراچی کے کئی ممتاز ادیبوں نے میرزا صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں مضمون پڑھے۔ لیکن سب سے عمدہ مضمون خود میرزا صاحب کا تھا۔ دراصل یہ میرزا صاحب کا اپنا شخصی خاکہ تھا جو نہایت عقیدت و محبت سے لکھا گیا تھا۔ میرزا صاحب نے بہت سے شخصی خاکے لکھے ہیں، لیکن یہ خاکہ سب سے بازی لے گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرزا صاحب نے جتنے لوگوں کے شخصی خاکے لکھے ہیں، ان میں سے کوئی میرزا صاحب کے اتنا قریب نہ تھا جتنا وہ خود اپنے قریب ہیں۔

میرزا صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اپنی شہرہ آفاق کتابیں "صحرانورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" قلعۂ لاہور کی دیوار کے سائے میں لکھی ہیں۔ وہ اپنے ساتھ دو پیسے کے چنے لے جایا کرتے تھے۔ دن بھر لکھتے رہتے تھے۔ بھوک لگتی تو چنے کھا لیتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا: "حیرت ہے میرزا صاحب نے چنے کھا کر ایسی عمدہ کتابیں لکھیں، ورنہ آج کل کے مصنف ایسی کتابیں لکھتے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوہے کے چنے چبا رہا ہے"۔

تقریب کے دوسرے روز مہمان ادیبوں کے لیے ٹھٹھہ کی شاہ جہانی مسجد اور مکلی کا قبرستان دیکھنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس میں میرزا ادیب، لطیف کاشمیری، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے علاوہ ڈاکٹر حنیف فوق، تقی حسین خسرو، طاہر مسعود اور دوسرے کئی ادیبوں نے بھی شرکت کی۔ اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کسی نے پوچھا: "اتنی شدید گرمی میں آپ نے مکلی کے قبرستان کی سیر کا پروگرام کیوں بنایا ہے"؟ طاہر مسعود نے جواب دیا: "ہم لوگ انشائیے کو دفن کرنے جا رہے ہیں"۔ سائل حیران ہوا اور اُس نے ڈاکٹر انور سدید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اگر یہ بات ہے تو آپ ڈاکٹر صاحب کو ساتھ کیوں لیے جا رہے ہیں؟ یہ تو انشائیے کی تحریک کے

بانیوں میں سے ہیں"۔ طاہر مسعود کا جواب تھا: "تدفین کے وقت کوئی رونے والا بھی تو ساتھ ہونا چاہیے"۔

ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے تعلقات کی خرابی کا سبب بھی انشائیہ ہے۔ ایک مرتبہ اہلِ قلم کانفرنس میں ڈاکٹر انور سدید نے انشائیے پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس پر کئی اعتراضات کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انشائیہ کوئی ایسی اہم صنفِ ادب نہیں ہے جس پر قومی سطح کی کانفرنس میں مقالہ پڑھا جائے۔ ڈاکٹر انور سدید کو یہ بات بری لگی۔ وہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی زبان سے ان کی غزلیں تک سن سکتے ہیں، لیکن انشائیے کی مخالفت نہیں سن سکتے۔ لہٰذا انھوں نے فراقی کا نام دبستانِ فنون کے اراکین کی فہرست میں لکھ لیا۔ اگرچہ تحسین صاحب کا دبستانِ فنون سے کوئی تعلق نہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید کا طریقِ کار یہ ہے کہ جب کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اسے دبستانِ فنون کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کراچی اور ٹھٹھہ میں کئی روز ہم کلام و ہم طعام رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کی پرانی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور نئی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، یعنی ایک دوسرے کے بارے میں اچھی رائے قائم کرلی۔

(۶/ اگست ۱۹۸۷ء)

ترقّی پسند تحریک کی لُٹیا

اگر کوئی شخص ہر وقت یہی کہتا رہے کہ میں عاقل و بالغ ہوں تو اُس کا عاقل و بالغ ہونا مشکوک ہو جائے گا۔ یہی حال پاکستانی ترقی پسندوں کا ہے جن کی ترقی پسندی کی عمارت زبانی دعووں پر قائم ہے۔ ہم نے آج تک کوئی رجعت پسند یا زوال پسند ایسا نہیں دیکھا جو اپنی زبان سے اپنی رجعت پسندی یا زوال پسندی کا ڈھنڈورا پیٹے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں یا انتظار حسین، لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، رجعت پسندی یا زوال پسندی کے فوائد پر گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں نہ دوسروں کا۔

زبانی جمع خرچ سے ترقی پسندوں کو کچھ ایسی دل چسپی ہے کہ ایک عرصے سے انھوں نے لکھنے لکھانے کا کام شروع کرنے سے پہلے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ "گفتگو" تحریر کا نعم البدل بن چکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ "گفتگو" کے نام سے کتاب بھی چھپ گئی ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے: "ترقی پسند تحریک کے نظری مسائل، اثرات اور مخالفین کے اعتراضات پر مشاہرین ادب سے بات چیت"۔

لفظ "مشاہرین" کا استعمال قابل غور ہے۔ ہم سے یہ معما حل نہ ہوا تو استاد لاغر مراد آبادی کو زحمتِ فکر دی گئی۔ انھوں نے فرمایا: "مشاہرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو مشاہرہ لے کر....."۔ ہم نے استاد کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا کہ "مشاہرین" کا "مشاہرے" سے رشتہ جوڑنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ ہم نے عرض کیا: "اس میں کچھ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے"۔ استاد نے فرمایا: "ہاں اس کا بھی امکان ہے۔ آخر خود ترقی پسند تحریک بھی تو ہماری تاریخِ ادب میں کتابت کی ایک غلطی ہی تو ہے"۔

کتابت کی غلطیوں کی بات چل نکلی ہے تو یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ زیرِ نظر کتاب "گفتگو" کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس پر کتابت کی دس بارہ غلطیاں نہ ہوں۔ خصوصاً شعروں پر تو وہ ظلم ڈھائے گئے ہیں کہ اچھے خاصے شعر بھی کیفی اعظمی کے شعر بن کر رہ گئے ہیں۔ کتابت کی ان غلطیوں کی بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کتاب "مشاہرینِ ادب" کی نہیں "مشاہرینِ کتابت" کی بات چیت کا مجموعہ ہے۔

کتاب کا پہلا باب علی سردار جعفری کی بات چیت پر مشتمل ہے۔ جعفری صاحب احتجاجی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں فرماتے ہیں: "تو جناب ہم نے احتجاجی شاعری ضرور کی ہے لیکن بے ایمانی کی بات یہ ہوئی کہ ہم نے ساتھ ہی دائمی شاعری (بھی کی) جسے آپ اچھی شاعری کہتے ہیں۔ اب آپ کرتے یہ ہیں کہ ہماری اچھی شاعری کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور پکڑ لیتے ہیں اس شاعری کو جو ہم نے ہنگامی ضرورتوں کے تحت کی تھی۔ لیکن یہ تو کوئی ادبی دیانت نہیں ہوئی۔ خیر اِس کو چھوڑیے میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ جناب ہماری وہ ہنگامی نوعیت کی شاعری آپ کی اس مہمل شاعری سے بدرجہا بہتر تھی جس کا کوئی مقصد، کوئی ہدف، کوئی رُخ اور کوئی مافی الضمیر نہیں ہوتا"۔

قطع نظر اس سے کہ جعفری صاحب کے مخاطب کون ہیں اور مہمل شاعری کا طعنہ کسے دیا جا رہا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہنگامی ضرورتوں کے تحت شاعری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا اس سے بہتر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ ہنگامی ضرورتوں کے تحت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہمل شاعری کا مطالعہ ہی کر لیا جائے، شاید اسی بہانے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ مہمل شاعری میں کم از کم یہ توقع تو رہتی ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا کبھی نہ کبھی کوئی مفہوم ضرور برآمد ہوگا۔ ہنگامی ضرورتوں والی شاعری سے تو یہ توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

سردار جعفری صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے: "آزاد شاعری کا جو نمونہ راشد اور میراجی نے قائم کیا تھا، وہ آگے چلا نہیں۔ فیض نے میں نے یا دوسرے ترقی پسند شعرا نے آزاد شاعری میں جو آہنگ اختیار کیا ہے، وہ جدید لکھنے والوں کے ہاں تک پہنچتا ہے لیکن راشد اور میراجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے"۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر راشد اور میراجی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے تو پھر

ترقی پسند شاعری تو اپنا سب کچھ کھو چکی ہے۔ لیکن ہمیں اس قسم کی انتہا پسندانہ رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ راشد اور میراجی کی شاعری کی اپنی شناخت تھی تو اُس نے کھوئی' ترقی پسند شاعری کے پاس ہیئی کیا جو وہ کھوئے گی۔

سردار جعفری نے دوران گفتگو کہا: "برنارڈ شا نے ایک مرتبہ بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ میرا درزی ہر سال آکے میرا ناپ لے جاتا ہے۔ تو یہ بات حالات اور ہمارے باہمی رشتے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ حالات جو ہیں وہ برنارڈ شا ہیں اور ہم درزی ہیں"۔

ممکن ہے بعض رجعت پسند یہ کہیں کہ آپ درزی ہیں تو پھر آپ نے مصنفوں کی انجمن کیوں بنا رکھی ہے۔ ان جملے باز رجعت پسندوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ درزیوں کی انجمن بنانے کے لیے ضروری ہے کہ درزی کا کام آتا ہو جب کہ مصنفین کی انجمن بنانے کے لیے اس قسم کے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کتاب کا دوسرا باب سید سبط حسن کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اقبال سے پوچھا: "اچھا صاحب ہمارے ہندوستان کے جو مسائل ہیں ان کا کیا حل ہے"؟ اقبال نے جواب دیا: "سوشلزم' کوئی نہ کوئی شکل سوشلزم کی اپنانی ہی پڑے گی"۔ قطع نظر اس سے کہ سید سبط حسن سے علامہ اقبال کی ملاقات ان کی زندگی میں ہوئی تھی یا بعد میں' یہ واقعہ سید صاحب کو اس وقت کیوں یاد نہ آیا جب انھوں نے اپنا مشہور مضمون "فلسفۂ شاہین" تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے اس قسم کی باتیں لکھی ہیں: "اقبال اقتدار پرست ہے اور دیوانگی کی حد تک اقتدار پرست۔ وہ ہر قوت کا استقبال کرتا ہے۔ ہر صاحب اختیار سے متاثر ہوتا ہے۔ قوت و اقتدار کی مدح سرائی اس کی شاعری کا اضطراری پہلو ہے اور اس دھن میں وہ تحقیق و جستجو اور عقل و تمیز کو بھی خیرباد کہہ دیتا ہے"۔

اس مضمون کا زمانۂ تحریر سید صاحب کی نوجوانی بلکہ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ (پہلے یہ مضمون "پیام" حیدر آباد دکن میں اور پھر "نیا ادب" لکھنؤ میں شائع ہوا تھا) اب پہلے جیسا جوش و خروش باقی نہیں رہا' اس لیے اقبال کے بارے میں سید صاحب کی رائے میں خاصی تبدیلی آگئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں فرماتے ہیں: "Progress..... کا تصور مغرب میں اٹھارویں صدی کے بعد تیزی سے مقبول ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اقبال سے پہلے ہمارے ہاں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ اقبال نے ان

تمام جدید تصورات سے ہمارے فکر و ادب کو متعارف کرایا اور جس کمال خوبی' ہنرمندی' اور فن کاری سے انھیں شعری قالب میں ڈھالا ہے وہ بجائے خود بے مثال ہے۔ بلکہ مجھے معاف رکھیں میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ترقی پسند شاعری اپنی تمام توانائی' دل کشی' نموپذیری اور حقیقت آفرینی کے باوجود ملوکیت' سرمایہ داری' سام راج پر جو کچھ اقبال نے لکھ دیا ہے' اس کے پاسنگ برابر ایک نظم بھی اپنے ہاں سے پیش نہیں کر سکتی"۔

لیجے سید صاحب نے تو ترقی پسند شاعروں کی لُٹیا ہی ڈبو دی۔ بیچارے نصف صدی سے شاعری کر رہے ہیں اور شاعری کا ایک بھی ایسا نمونہ پیش نہ کر سکے جو اقبال کی کسی نظم کے پاسنگ ہوتا۔ سید صاحب کو اتنی بے مروتی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔ حوصلہ افزائی کے خیال سے کم از کم یہی کہہ دینا چاہیے تھا کہ اگلی نصف صدی میں اس کا امکان ہے کہ ترقی پسند ایک آدھ ایسی نظم ضرور لکھ دیں گے جسے کلام اقبال کے "پاسنگ برابر" قرار دیا جا سکے۔

سید صاحب کے پاس ترقی پسند تحریک سے متعلق کچھ اہم کاغذات تھے۔ یہ کاغذات چوری ہو گئے۔ اس پر سید صاحب نے دلی صدمے کا اظہار کرتے ہوئے یہ تفصیلات بتائی ہیں: "جب فیض صاحب ملک سے باہر.... جا رہے تھے تو انھوں نے یہ چند کاغذات مجھے بھجوا دیے تھے۔ حفاظت کے خیال سے۔ اور میں نے انھیں اپنے ایک بیگ میں دوسرے اہم کاغذات کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ ایک روز کوئی چور صاحب دن دھاڑے گھر میں گھس آئے۔ وہ سمجھے کہ بیگ میں کچھ رقم ہو گی' اور اٹھا کر لے گئے اور نہ جانے کہاں پھینک دیا۔ مجھے ان کاغذات کے گم ہو جانے کا انتہائی ملال ہے"۔

سید صاحب کا ملال برحق' لیکن ہم تو عوامی آدمی ہیں' اس لیے ہمیں اس شخص کی محنت کے ضائع جانے کا ملال ہے جس نے سید صاحب کا بیگ اُڑایا' اس توقع پر کہ اس میں رقم ہو گی' لیکن ایسے کاغذات نکلے جو اس کے نزدیک دو کوڑی کے بھی نہیں تھے۔ سید صاحب سے گزارش ہے کہ کاغذات کی گم شدگی کا غم چھوڑیے' انجمن ترقی پسند مصنفین کی فکر کیجیے۔ اسے اپنے بیگ میں نہ رکھیے۔ کسی بنک کے لاکر میں رکھوا دیجیے۔

ترقی پسندوں کی سیاست کا یہ پہلو بہت دل چسپ ہے کہ وہ اردو ہی کے ذریعے شہرت حاصل کرتے ہیں اور اردو ہی کو استعمار کی علامت قرار دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ علاقائی زبانیں بولنے والوں کو یہ غلط احساس دلایا جائے کہ اردو کو زبردستی ان پر مسلط کیا جا رہا ہے' اور اُن کی

زبانوں کے حقوق غصب کیے جارہے ہیں۔ اس طریق کار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک میں انتشار کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ سید صاحب نے بھی ترقی پسندوں کے اس معروف طریقۂ واردات کو اپنایا ہے۔ فرماتے ہیں: "اشتعال کی حد یہ ہے کہ اسے (اردو کو) مقتدرہ زبان' یعنی صاحب اقتدار زبان کہا جارہا ہے"۔ ہمیں سید صاحب جیسے دانشور سے اس غلط بیانی کی توقع نہیں تھی۔ کیا سید صاحب کسی بھی ایسے شخص کی نشان دہی کرسکتے ہیں جس نے اردو کو "مقتدرہ زبان" کہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب مرکزی حکومت کے ایک ادارے "مقتدرہ قومی زبان" کے نام سے دھوکا کھا گئے۔ یہ "نیشنل لینگویج اتھارٹی" کا ترجمہ ہے جیسے کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا ترجمہ "مقتدرہ ترقیات کراچی" ہوگا۔ کیا اس سے بھی سید صاحب یہی مطلب نکالیں گے کہ کراچی صاحبانِ اقتدار کا شہر ہے۔ حالاں کہ اس شہر میں ستر لاکھ محکوم و مظلوم آباد ہیں۔

"گفتگو" میں اور بھی کئی "مشاہرین" کی دل چسپ گفتگو سے صفحوں کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں۔ مگر ہم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس سیاہی یا سیاہ کاری سے اپنے کالم یعنی نامۂ اعمال کو مزید سیاہ کریں۔

(۱۷/ اپریل ۱۹۸۶ء)

خام خیالی یا روشن خیالی

صحافت کو کسی زمانے میں شریفانہ پیشہ کہا جاتا تھا۔ پیشہ تو یہ اب بھی شریفانہ ہے لیکن شرافت وہ نہیں رہی جو اگلے زمانے میں تھی۔ جس طرح گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں روپے کی قیمت گری ہے' اسی طرح شرافت کے معیار میں بھی خاصی تبدیلی آئی ہے۔ پہلے کوئے صحافت میں وہی آتے تھے جنھیں جان و دل عزیز نہیں ہوتے تھے' اب جان و دل کی جگہ ایمان نے لے لی ہے۔ صحافت مشن نہیں رہی' جنسِ تجارت بن گئی ہے۔ اخبار خبروں اور اداریوں سے نہیں' تصویروں اور اشتہاروں سے چلتے ہیں۔ پری رُخوں کی تصویریں نہ ہوں تو دوسرے دن ردی کا بھاؤ بھی گر جاتا ہے۔ حکومت اشتہاروں سے ہاتھ کھینچ لے تو مالکوں کو دن میں تارے اور راتوں کو ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ حکومت اشتہارات کو بطور رشوت تقسیم کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سچ سُننے اور سچ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

وہ دن گئے جب اخبارات کی کوئی پالیسی ہوتی تھی۔ اب ان کے پاس صرف نیوز پرنٹ کا کوٹا ہوتا ہے۔ ایک چوتھائی پر اخبار چھپتا ہے اور باقی تین چوتھائی پر کرنسی نوٹ چھپتے ہیں۔ یعنی زائد نیوز پرنٹ بلیک میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ گویا اخبار چھاپنے میں بھی فائدہ ہے اور نہ چھاپنے میں بھی۔

کسی پالیسی کے نہ ہونے کی وجہ سے اخبارات کا باطن تو دھندلایا رہتا ہے لیکن ظاہری چمک دمک دیدنی ہوتی ہے۔ اخباری صفحات پر قوس قزح کے ساتوں رنگ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے اخبارات' بقول شخصے' مطبع میں نہیں رنگ ریز کی دکان میں چھپتے ہیں۔

ایسے ماحول اور ایسے حالات میں معلوم نہیں الطاف حسن قریشی کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ وہ صحافت کے کوچے میں قدم رنجہ فرمائیں۔ بہرحال یہ مشورہ ہم نے نہیں دیا تھا' اس لیے ہمارے ضمیر

پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔ البتہ آنکھوں پر پچھلے پچیس برسوں میں خاصا بوجھ پڑا ہے کہ ہر مہینے "اردو ڈائجسٹ" پڑھنا پڑتا ہے۔ بُری عادتیں تو ہم میں اور بھی ہیں، لیکن اردو ڈائجسٹ پڑھنے کی عادت سب پر بازی لے گئی ہے۔ خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو ڈائجسٹ کا پڑھنا کوئی بُری بات ہے بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ موجودہ زمانے میں لکھنے والوں کے لیے پڑھنا معیوب سمجھا جاتا ہے، چونکہ ہمارا تعلق لکھنے والوں کے گروہ سے ہے، اس لیے ہم مطالعے کی عادت کو اپنی برائیوں میں شمار کرتے ہیں۔

ہمیں اس پر فخر ہے کہ ہم نے گزشتہ پچیس برسوں میں "اردو ڈائجسٹ" سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہم نہ صرف نزلے اور کھانسی کی دواؤں کا انتخاب اس جریدے میں چھپنے والے اشتہاروں کو دیکھ کر کرتے ہیں بلکہ سیاسی اتار چڑھاؤ کا اندازہ کرنے کے لیے بھی قریشی صاحب کے اداریے اور تجزیے پڑھتے ہیں۔ یہ قریشی صاحب کی تحریروں ہی کا فیضان ہے کہ ہم میں اتنا سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے کہ ہم ہر سیاست دان کو مُشبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جب قریشی صاحب اپنے رسالے کی سلور جوبلی کی صدارت وزیر اعظم اور صدر مملکت سے کراتے ہیں تو ہم قریشی صاحب کو بھی مُشبہے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

قریشی صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی حق گوئی و بے باکی ہے۔ انھوں نے ہر دور میں، یہاں تک کہ ہماری تاریخ کے سیاہ ترین جابرانہ دور میں بھی کلمۂ حق کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں انھیں ہزار طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو عاقبت اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے پکی پکائی روٹی کے پلانٹ پر مفاہمت کر لیتا، مگر قریشی صاحب کی قسمت میں پکی پکائی روٹی تھی ہی نہیں۔ اس لیے وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر لڑتے رہے اور یوں وہ تاریکی کے دور میں روشنی کا استعارہ بن گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جن دو تین صحافیوں نے ملک کے مفاد میں اپنے ذاتی مفادات کو نظر انداز کیا، ان میں قریشی صاحب بھی شامل ہیں۔ ہماری تاریخِ صحافت کے ایک زریں باب کا عنوان "الطاف حسن قریشی" ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ استاد لاغر مراد آبادی تشریف لے آئے۔ انھوں نے نامکمل کالم پر نظر ڈالی، ہمارے تھوڑے لکھے کو بہت جانا اور فرمایا: "ویسے تو آپ کسی کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہتے مگر جب کسی پسندیدہ شخصیت کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو صنعتِ مبالغہ کو اِس حد تک فروغ

دیتے ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے صنعت کار آپ کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں"۔

ہم نے ان تحسین آمیز کلمات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ آخر ہم نے ایسی کون سی بات لکھ دی ہے جس کی وجہ سے آپ نے ہمیں مبالغے کے کارخانے کا مالک یعنی صنعت کار بنا دیا ہے۔

فرمایا: "جن صاحب کی تعریف میں آپ نے کاغذ کی سفیدی کو سیاہی میں تبدیل کیا ہے، وہ تو ہمیشہ کلمۂ حق کی بجائے کلمۂ ضیاء الحق کہتے رہے ہیں۔ اسی خدمت کے صلے میں تو اُن کے ڈائجسٹ میں مضامین سے زیادہ سرکاری اور غیر سرکاری اشتہارات چھپتے رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر مضامین بھی اشتہاری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اشتہاری لوگوں کی تعریف کر کے اپنے قلم کو رسوا نہ کیجیے"۔

ہم نے عرض کیا: "یہ آپ کا خیال ہے جو ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں"۔

کہنے لگے: "جی ہاں! اپنی خام خیالی کے مقابلے پر کسی دوسرے کی روشن خیالی آپ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی"۔

استاد کچھ دیر تک غصے کے عالم میں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے اور ہم ہنس ہنس کر سنتے رہے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کی نصیحتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو وہ یہ کہہ کر اٹھ گئے: "یہ پیٹ پر پتھر باندھنے کی بھی خوب رہی۔ آپ کے ممدوح پیٹ پر پتھر نہیں، سونے کی اینٹیں باندھتے ہیں۔ پتھر انھیں کہاں سے ملتے، وہ تو سارے آپ کی عقل پر پڑ چکے ہیں"۔

یہ جملہ خاصا پتھریلا تھا۔ استاد کے جانے کے بعد کچھ دیر تک ہم عقل کو نہیں، سر کو سہلاتے رہے۔ جب حواس درست ہوئے تو ہم دوبارہ کالم کی طرف متوجہ ہوئے۔

قریشی صاحب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھوں نے نتائج کی پروا کیے بغیر ہر دور میں سیاست دانوں اور حکمرانوں کو صحیح راستے پر چلنے کا مشورہ دیا اور بد قسمتی یہ ہے کہ ان کے مشورے پر کسی نے عمل نہیں کیا۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ اگر سیاست دان اور حکمران ان کے مشوروں پر عمل کرنے لگتے تو پھر قریشی صاحب کے لیے کرنے کو کوئی کام ہی باقی نہ رہتا۔ قدرت کو قریشی صاحب سے چونکہ کام لینا ہے، اس لیے جو حالات اردو ڈائجسٹ کے اجرا کے وقت تھے، کم و بیش ویسے ہی حالات اب بھی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے وہ اپنی خیر مناتے تھے، اب اردو ڈائجسٹ کی جوبلی مناتے پھر رہے

ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کی جوبلی کی تقریب پہلے لاہور میں منعقد ہوئی جس میں مہمانِ خصوصی وزیر اعظم تھے، اور اب کراچی میں صدر مملکت کی موجودگی میں یہ کارِ خیر انجام پایا ہے۔ لاہور کی تقریب کی تفصیلات تو ہم نے اخباروں میں پڑھی تھیں، کراچی میں جو کچھ ہوا وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔ ایسی صاف ستھری تقاریب ہم نے کم ہی دیکھی ہیں۔ تقریباً پانچ گھنٹوں تک مقررین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سامعین سکون و اطمینان کے ساتھ اس طرح تقریریں سنتے رہے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو بلکہ مسلسل سونگھ رہا ہو۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت تھی کہ اتنی دیر تک حاضرین نے سنجیدہ تقریروں کو کیسے برداشت کرلیا۔ ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، اس لیے کہ جو لوگ مارشل لا جیسے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظام کے تحت برسوں زندگی بسر کرچکے ہوں، ان کے لیے سنجیدگی سے پانچ گھنٹے گزارنا کون سا مشکل کام تھا۔

لیکن اس تقریب میں صرف سنجیدگی ہی نہیں تھی۔ شگفتگی اور شگفتہ مزاجی کے بھی کچھ پہلو تھے۔ مقررین پر یہ قید لگادی گئی تھی کہ وہ سات آٹھ منٹ سے زیادہ وقت نہ لیں۔ وجہ یہ تھی کہ حاضرین اور مقررین کی تعداد میں انیس بیس ہی کا فرق تھا۔ اگر ہر مقرر اپنے حوصلے کے مطابق تقریر کرتا تو سامعین کا حوصلہ جواب دے جاتا۔ مقررین نے وقت کی پابندی کا لحاظ ذرا کم ہی رکھا۔ ایک صاحب نے تو مقررہ وقت سے کہیں زیادہ وقت یہ بتانے میں صرف کردیا کہ ان کے لیے اپنی تقریر کو مختصر کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک صاحب جو ہمارے قریب ہی بیٹھے تھے، کہنے لگے: "قریشی صاحب کا بھی جواب نہیں۔ جن لوگوں کو اپنے رسالے میں نہیں چھاپتے، انھیں تقریریں کرنے کے لیے اپنے جلسوں میں بلا لیتے ہیں"۔ ایک دوسرے صاحب نے گرہ لگائی: "یہ اشتہاری مقررین ہوں گے۔ جس طرح قریشی صاحب اپنے رسالے میں اجرت لے کر اشتہار چھاپتے ہیں، اسی طرح اجرت لے کر تقریریں کرنے کا موقع بھی دیتے ہوں گے"۔

اس تقریب کی ایک خوبی یہ تھی کہ بیشتر مقررین کو قریشی صاحب لاہور سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ غالب کو تو اس کی حسرت ہی رہی کہ نوحہ گروں کو ساتھ رکھے، قریشی صاحب کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ تو جنابِ معلن کو بھی لاہور ہی سے لے کر آئے تھے۔ یہ فریضہ سراج منیر نے انجام دیا جن کے صاحب علم ہونے کے بارے میں متعدد روایتیں ہم تک پہنچی ہیں۔ بلکہ رسالہ "روایت"

بھی ہم تک پہنچ چکا ہے۔ جس میں سراج منیر کے کئی فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ سراج منیر کو تحریر کے ساتھ تقریر میں بھی کمال حاصل ہے۔ مولانا شبلی نے محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کی گپ بھی ہانک دیتے ہیں تو اُس پر وحی کا گمان ہوتا ہے۔ یہی حال سراج منیر کا تھا۔ جب وہ کسی مقرر کے تعارف میں سخن سازی کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سچ بول رہے ہوں۔

ہمیں سب سے زیادہ خوشی اپنے کالم پرور کرم فرما منظر علی خاں منظر کا مضمون سن کر ہوئی۔ ان کا مضمون اتنا شگفتہ تھا کہ صدر مملکت بھی کئی مرتبہ مسکرا دیے۔ اب تک تو منظر صاحب پر ہما شما ہنستے تھے' اب ان کا درجہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ صدر مملکت بھی ہنستے ہیں۔ اس تقریب میں شرکت سے منظر صاحب برنگ دیگر سامنے آئے۔ ایک تو سراج منیر نے ان کا تعارف کراتے ہوئے انھیں انشائیہ نگار کہا' دوسرے تقریب کی رپورٹ ٹی وی پر پیش کی گئی تو اناؤنسر نے انھیں "ممتاز دانشور" کا خطاب مرحمت فرمایا۔ منظر صاحب ان دونوں الزاموں کو ہنسی خوشی جھیل گئے۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو سراج منیر اور ٹی وی دونوں پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ دائر کر دیتے۔

(۲۲/ مئی ۱۹۸۶ء)

قافیہ و ردیف کا بوجھ

ہم تین چیزوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ تجریدی مصوری سے، علامتی افسانے سے اور اساتذہ کے کلام سے۔ وجہ یہ ہے کہ اِن تینوں سے مفہوم اخذ کرنا ناظر یا قاری کی ذمہ داری ہے نہ کہ مصور، افسانہ نگار اور شاعر کی۔ مصور الوان و خطوط سے، افسانہ نگار الفاظ سے اور اساتذۂ سخن ردیف و قوافی سے فن پارے کو اِس حد تک گراں بار کر دیتے ہیں کہ اُس میں مزید کوئی بار اٹھانے کی گنجایش نہیں رہتی۔ لہٰذا مفہوم و معنی کا یہ بار ہم جیسے ناتوانوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔ میر تقی میر کو بھی اِس قسم کا تجربہ ہوا تھا جس کا ذکر اس شعر میں ملتا ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اِس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

ہم تجریدی مصوری کی نمایشوں میں کبھی نہیں جاتے، یہاں تک احتیاط برتتے ہیں کہ جب شہر میں اِس قسم کی کوئی نمایش ہوتی ہے تو گھر سے باہر نہیں نکلتے کہ کہیں فضائی آلودگی ہم پر بھی اثر انداز نہ ہو جائے۔ علامتی افسانے لکھنے والوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ انھوں نے گفتگو میں علامتوں سے کام لیا تو ہمارا حشر بھی وہی ہو گا جو افسانے کی صنف کا ہوا ہے۔ اساتذۂ سخن کا ہم بے حد ادب کرتے ہیں، اور اِسی وجہ سے ہم نے کبھی ان سے بے تکلف ہونے کی جسارت نہیں کی۔ یعنی ان کے دواوین کے قریب جانا اور چھونا تو کیا، انھیں دور سے دیکھنا بھی ہمارے نزدیک سوءِ ادب ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو بڑی جماعتوں کے طالب علموں کو اُن کی شرارتوں پر جو سخت سزا دی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اُن سے استادِ ذوق کی کسی غزل کی شرح لکھوائی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے بڑی جماعتوں میں پہنچنے سے پہلے ہی سلسلۂ تعلیم منقطع کر لیا۔ معلوم

نہیں آج کل اسکولوں میں اِس قسم کی سزائیں دینے کا رواج ہے یا نہیں۔ اگر ہو گا تو یقیناً استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا کلام سزا دینے کے کام آتا ہو گا۔ یہ بات ہم نے بلاوجہ نہیں کہی۔ سلطان جمیل نسیم نے یہ واقعہ ہمیں سنایا ہے کہ حیدر آباد میں ایک مجرم کو پندرہ کوڑے کھانے یا استاد کی پندرہ غزلیں سننے کی سزا دی گئی۔ سزا کے انتخاب کا حق استعمال کرتے ہوئے مجرم نے کوڑے کھانے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ سزا نسبتاً نرم تھی۔ سلطان جمیل نسیم چونکہ افسانہ نگار ہیں، اِس لیے ممکن ہے بعض لوگ اِس واقعے کو درست نہ سمجھیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ کسی افسانہ نگار کا سہواً کسی واقعے کو صحیح بیان کر دینا خارج از امکان نہیں۔

استاد اختر انصاری شاعر ہی نہیں، ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ رسالہ تو کبھی کبھی چھپتا ہے لیکن دیوان ہر سال باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں استاد کا بیسواں دیوان شائع ہوا تھا تو وہ اُسے اپنے عقیدت مندوں میں قیمتاً تقسیم کرنے کے لیے کراچی تشریف لائے تھے۔ اِس سلسلے میں وہ ہم سے بھی ملے تھے۔ ہم نے عرض کیا تھا: "استاد! ہم اِس شرط پر قیمت ادا کریں گے کہ دیوان آپ کسی اور کو دے دیں"۔ اس گزارش سے وہ بے حد خوش ہوئے اور فرمایا: "اگر سب عقیدت مند آپ کی طرح کے ہوں تو پھر دیوان چھپوائے بغیر ہی اُس کا پورا ایڈیشن فروخت ہو سکتا ہے"۔

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اُسی طرح تمام استاد بھی یکساں طور پر استادی کے درجے پر فائز نہیں ہوتے۔ حضرت تابش دہلوی کا شمار بھی اساتذۂ فن میں ہوتا ہے لیکن اُن کی خوش گوئی اور خوش فکری میں کلام نہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے مقبول شاعروں میں سے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کا بے حد احترام ہے۔ اسی لیے ہم نے ان کے مجموعہ ہائے کلام کو ادباً دور ہی سے دیکھا ہے۔ ان کے نئے مجموعے کو قریب سے دیکھنے کی اتفاقی صورت یوں پیدا ہو گئی ہے کہ پچھلے دنوں ہم حیدر آباد سندھ جا رہے تھے، بس میں ہمارے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اُن صاحب کی بدذوقی پر حیرت ہوئی کہ بس کے تمام مسافر تو ڈرائیور کے ذاتی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے نازیہ اور زہیب کے نئے گانوں سے محظوظ ہو رہے ہیں اور یہ صاحب کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اسی دوران میں بلا ارادہ ہماری نظر اُس صفحے پر پڑی جو موصوف کے سامنے کھلا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج تھا: "شان الحق حقی کی شادی پر، غالب سے معذرت کے ساتھ"۔ ہم شان صاحب کے پرانے نیاز مند ہیں۔ اس لیے اس عنوان پر

ہمیں بے حد تعجب ہوا۔ شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ شان صاحب غالب کے دیوان کی شرح لکھتے یا تضمین کرتے تو معذرت کی گنجایش تھی، مگر شادی تو بالکل ایک مختلف کام ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم نے اپنے ہم سفر سے کتاب دیکھنے کی اجازت چاہی تو اُنھوں نے فوراً اُسے ہمارے حوالے کردیا، جیسے وہ اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی ان سے کتاب لے لے۔ اس کے بعد وہ تو گانے سننے میں اور ہم کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوگئے۔ اور یوں ہم نے جناب شان الحق حقی سے نیاز مندی کا رشتہ رکھنے کی پاداش میں حضرتِ تابش دہلوی کے چوتھے مجموعۂ کلام "غبارِ انجم" سے استفادہ کیا۔ اسے ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

تابش صاحب کو شان صاحب کی شادی پر غالب سے معذرت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انھوں نے شان صاحب کا سہرا غالب کی زمین میں لکھا ہے۔ گویا شادی تو شان صاحب کی ہوئی اور زمین غالب کی پامال ہوئی۔ دیکھیے تابش صاحب نے کیا عمدہ شعر نکالے ہیں :

روئے زیبا پہ ہے صاحب کے جو سہرے کی لڑی
کم ہے فی الجملہ اُسے جس قدر اچھّا کہیے
بند ہے جوشِ تحیّر میں زبانِ خامہ
نطق سرمہ بہ گلو ہے کہ اِسے کیا کہیے
یا اِسے طرّۂ سلمیٰ کے مشابہ لکھیے
یا اِسے عطر فشاں گیسوے لیلیٰ کہیے

باقی شعر بھی اِسی طرح کے ہیں اور ہر شعر میں نئی سے نئی تشبیہیں ملتی ہیں۔ تابش صاحب نے سہرے کے ساتھ تاریخِ تصنیف نہیں دی جس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ شادی نصف صدی پہلے کا نہیں حال ہی کا واقعہ ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، ورنہ لوگ شان صاحب کو مبارک باد کے خط لکھنے لگیں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ بعض شعرائے کرام تابش صاحب کی تقلید میں سہرے بھی لکھ ڈالیں۔

اس مجموعے میں اور بھی کئی دلچسپ نظمیں ہیں۔ مثلاً ایک نظم ڈاکٹر انعام احسن کی "دعوت آم" کے بارے میں ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب وہی ہیں جن کا تخلص 'حریف' ہے اور جو مولانا احسن

مارہروی کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ شاعری میں مزاح سے اور آنکھوں کے علاج میں سنجیدگی سے کام لیتے ہیں اور کبھی کبھی ضرورتِ شعری کے تحت اس کے برعکس بھی عمل کرتے ہیں جس کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے۔ ایک مرتبہ ہم انھیں آنکھیں دکھانے گئے۔ محاورتاً نہیں ضرورتاً۔ ڈاکٹر صاحب نے دور کی نظر کے معائنے کے لیے دیوار پر آویزاں ایک نظم پڑھوائی جو ان کی اپنی تصنیف تھی۔ قریب کی نظر کے ٹیسٹ کے لیے اپنا مطبوعہ دیوان ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے عرض کیا: "اس طرح تو ہماری نظر اور کمزور ہو جائے گی"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "فکر کی کوئی بات نہیں۔ دماغ کو تو فائدہ پہنچے گا"۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم آنکھوں کے علاج کے لیے گئے تھے اور دماغ کا علاج کرا کے آئے۔ انھیں ڈاکٹر صاحب کی "دعوتِ آم" کے بارے میں تابش صاحب فرماتے ہیں :

واہ کیا کہنا ڈاکٹر انعام
کی ہے آموں کی تم نے دعوتِ عام
کہیں لنگڑا کہیں دسہری ہے
کوئی سبزہ کوئی سنہری ہے
ایک سے ایک خوش مزہ خوش رنگ
شکل سے ذائقہ ہے خوش آہنگ
کتنا شفاف کتنا پاکیزہ
آبِ شیریں کا جیسے مشکیزہ
کتنا نرم و لطیف ہے چھلکا
جیسے کھلتا ہوا ورق دل کا

آم کے چھلکے کو دل کے ورق سے تشبیہ دینا تابش صاحب جیسے استادِ فن ہی کا کام ہے۔ افسوس کہ دعوت کے بعد دل کے یہ اوراق بے دردی سے پھینک دیے گئے ہوں گے۔

حکیم محمد سعید صاحب نے شربتِ روح افزا کی بوتلیں تحفے میں بھیجیں تو تابش صاحب نے اُن کا شکریہ اس طرح ادا کیا:

اے سعید العصر اے ہمدردِ قوم
ہے سلامِ شوق کے بعد التماس

آپ کی شیرینیِ الطاف سے
کھُل نہیں پاتے ہیں لب ہائے سپاس
آپ کے انعام مجھ پر بے شمار
آپ کے اکرام مجھ پر بے قیاس
روح افزا کے قرابے بھیج کر
آبِ حیواں کے مجھے بھیجے گلاس

روح افزا کے سیکڑوں اشتہار ہماری نظر سے گزرے ہیں لیکن جو کیفیت اِس نظم میں ہے' وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ اشتہاروں میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ روح افزا پینے کے بعد ہونٹ کھُلتے نہیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تابش صاحب کو جو شربت بھیجا گیا' وہ بہت زیادہ گاڑھا تھا اور اُنھوں نے پانی ملائے بغیر پی لیا۔

ایک زمانے میں جناب تابش جہانگیر روڈ کی سرکاری بستی میں رہتے تھے۔ ایک نظم میں انھوں نے اپنے کوارٹر کا حال لکھا ہے۔ اس کے چند شعر آپ بھی سنیے اور داد دیجے کہ کیسے خراب مکان میں رہ کر اُنھوں نے کیسی عمدہ شاعری کی ہے :

در بھی . دیوار بھی خمیدہ ہے
ایک اک کمرہ "آبدیدہ" ہے
چھت کے روزن بجھائی دیتے ہیں
دن میں تارے دکھائی دیتے ہیں
جب بھی بدلی کوئی گرجتی ہے
اینٹ سے اینٹ آپ بجتی ہے
کمرہ اور کوٹھری ٹپکتی ہے
ایک اک اولتی ٹپکتی ہے
رات دن کرتے رہتے ہیں کھڑ کھڑ
گھر کے سارے کواڑ ہیں پاپڑ

اس کتاب میں یوں تو اور بہت سی نظمیں بھی ہیں لیکن ہمارے کام کی وہی تھیں جن کا ذکر کیا گیا

ہے۔ باقی نظمیں قومی و ملی ہیں یا پھر بقول مولانا حسرت موہانی عاشقانہ و فاسقانہ قسم کی ہیں۔ لہٰذا قوم و ملت کو اور اہلِ فسق و فجور کو اِن نظموں سے براہ راست استفادہ کرنا چاہیے یعنی کتاب خریدنی چاہیے۔ اس کی قیمت صرف چالیس روپے ہے۔ اتنی معمولی رقم خرچ کر کے شان الحق حقی صاحب کی شادی میں اور ڈاکٹر انعام احسن کی دعوتِ آم میں شریک ہونا کوئی مہنگا سودا نہیں۔

(۱۴/ مارچ ۱۹۸۵ء)

خود نوشت شاعری

خدا خوش رکھے مولانا کوثر نیازی صاحب کو کہ بڑی پہلو دار شخصیت رکھتے ہیں۔ بیک وقت سیاست، مذہب، صحافت اور ادب سے تعلق ہے اور ہر تعلق اتنا مضبوط کہ جس میدان میں نکل گئے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ سیاست میں گئے تو نعرے لگانے والے کارکن کی حیثیت سے ترقی کر کے وزیر کے مرتبے تک پہنچے۔ مذہبی معاملات میں دخل دیا تو "مولانا" نامِ نامی کا جزوِ غالب بن گیا۔ بعض لوگ اس لفظ کو ان کا تخلص سمجھتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب عارف عبدالمتین نام سے پہلے تخلص لکھ سکتے ہیں تو ہمارے ممدوح کیوں نہیں لکھ سکتے۔ مولانا صاحب نے صحافت میں طالع آزمائی کی تو "شہاب" جیسا اخبار جاری کر کے اردو زبان کو صحافت کے ایک خاص رنگ سے مزیّن کیا۔ شاعری میں طبع آزمائی کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ جوش، فراق، حفیظ اور فیض کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے کوئی بڑا شاعر ہی پُر کر سکتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ جوش، فراق وغیرہ کو اپنے مرتبے کا شاعر نہیں سمجھتے۔ صرف علامہ اقبال کو برابر کا درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے تو انھوں نے فرمایا ہے:

ہم نے وزیری میں بھی فقیری کر کے دکھائی ہے کوثر
لیکن جب اقبال نہیں تو اور کسی کو سنائیں کیا

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال نہیں ہیں تو کیا ہوا، اقبال صفی پوری تو ہیں۔ مولانا صاحب جو کچھ چاہیں انھیں سنا سکتے ہیں اور اس کے جواب میں بہت کچھ سن بھی سکتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اقبال صفی پوری راضی نہیں ہوں گے، وہ خود علامہ اقبال سے کم درجے کے کسی شاعر کو

اپنا مدِ مقابل نہیں سمجھتے۔

مولانا کوثر نیازی کی سیاست اور شاعری کا ساتھ ساتھ آغاز ہوا تھا۔ دونوں سے انھیں طبعی مناسبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی سیاست شاعری کی طرح باغ و بہار نظر آتی ہے اور کبھی شاعری، سیاست کی طرح "خار زار" بن جاتی ہے۔ "خار زار" سے مراد یہ ہے کہ مولانا عروض اور زبان کی پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتے جس کی وجہ سے بقول لاغر مراد آبادی، ان کے بعض اشعار پڑھنے والوں کے "دامنِ ذوق" سے کانٹوں کی طرح الجھتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل ہم آگے چل کر پیش کریں گے لیکن آگے چلنے سے پہلے ہم یہ تو بتا دیں کہ حال ہی میں مولانا صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام "لمحے" شائع ہوا ہے، اور یہی ہمارا آج کا موضوع ہے۔ پچھلے ہفتے اس مجموعے کی تقریبِ رونمائی ہوئی تھی جس میں حضرت رئیس امروہوی نے فرمایا تھا: "مولانا کوثر نیازی کو اپنی بات شعر میں کہنے اور الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے اور وہ اندازِ بیان کی نزاکتوں اور اسلوب کی تمام تر نفاستوں کے محرمِ راز ہیں"۔

حضرت رئیس کے اس بیان کی تصدیق مولانا کے اس مختصر دیباچے سے ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے تازہ مجموعۂ کلام پر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "اگر اسے فن کارانہ تعلّی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اردو شاعری کو بعض نئے اسلوب دینے کی کوشش کی ہے"۔ جنابِ رئیس اور مولانا نیازی کے بیانات پر جب ہم نے حضرت لاغر مراد آبادی سے تبصرہ کرنے کی گزارش کی تو انھوں نے فرمایا: "دونوں ٹھیک کہتے ہیں۔ مولانا کوثر نیازی نے اردو شاعری کو اتنے نئے اسالیب دیے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ کہیں وہ عروضی اجتہاد فرماتے ہیں جس کے نتیجے میں مصرعوں پر مصرعے خارج از آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ لفظوں کا تلفظ اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں، ساکن حرف کو متحرک اور متحرک کو ساکن کر دیتے ہیں۔ کہیں وہ قافیوں میں جدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ چلی، گلی اور ڈھلی کا قافیہ بلی (بلی بھگت والا) باندھتے ہیں۔ ان کے اسلوبِ خاص کو سمجھنے کے لیے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ فرماتے ہیں:

مر گیا کیا ترا شاعر ترا کوثر نیازی
سونے سونے سے ہیں کیوں کوچہ و بازار ترے

پہلے مصرعے میں "نیازی" کو "نازی" پڑھا جائے تو وزن درست ہو گا۔ حالاں کہ مولانا صاحب کا

نازیوں سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرا شعر یہ ہے:

تم سے بڑھ کر ہو گا کوثر کون تمھارا دشمن اور
سالوں کی محنت کو پل بھر میں ضایا کر بیٹھے

'سالوں کی محنت' اور 'ضایا' کی داد کچھ رئیس امروہوی ہی دے سکتے ہیں جن کے نزدیک اس شعر کے مصنف کو الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت حاصل ہے"۔

حضرتِ لاغر بہت زیادہ علمی گہرائی میں چلے گئے۔ ہمیں بھی مولانا کوثر نیازی کی طرح علم عروض و قافیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مولانا کے کلام میں دل چسپی کا اور بہت سا سامان موجود ہے۔ دیباچے میں مولانا صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "زرِ گل" کے مقابلے پر نئے مجموعے میں گہرائی زیادہ ہے کیوں کہ اس دور تک پہنچتے پہنچتے انھیں زندگی کے تلخ و شیریں پہلوؤں کو دیکھنے کا بھرپور موقع ملا ہے۔ آیئے ذرا اس مجموعے کی گہرائی ناپ لیں۔ فرماتے ہیں :

چن لیا کیوپڈ نے مجھ کو اپنے تیروں کا ہدف
ہائے کس اندھے پہ میری ذات کے جوہر کھلے

جب تک یہ شعر نہیں پڑھا تھا تو ہمیں کیوپڈ کی غلط بخشیوں کی وجہ سے اس کے اندھا ہونے میں شبہہ تھا اور اب تو یہ محسوس ہو رہا ہے جیسے کیوپڈ تیسری دنیا کے بعض سیاست دانوں کی طرح موروثی اندھا تھا۔ کیوپڈ کے تیروں کا ہدف بننے کے بعد مولانا صاحب کی یہ حالت ہوئی :

تجھ سے کرتے ہیں تقاضا تری تصویروں کا
ہم حقیقت میں اگرچہ ہیں طلب گار ترے

اس طلب گاری کی نوعیت ملاحظہ ہو:

تم کو کیوں جرم کے احساس نے مارا کوثر
جسم کے پیار کو دنیا تو روا کہتی ہے

کہاں مولانا صاحب کی تقدس مآبی اور کہاں جسم کا پیار.... جرم سے زیادہ جرم کے احساس کی سنگینی کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا :

پیکر میں مرے اتنا رچ بس سا گیا ہے وہ
بُو اُس کے بدن کی سی آتی ہے پسینے سے

"پسینے" کا اتنا خوبصورت استعمال شاعری میں دوسری مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ پہلی مرتبہ کسی نے کہا تھا: "پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے"۔ شاید اسی مصرعے کے مصنف کی طرح مولانا صاحب کے پسینے کا تعلق بھی جبیں سے تھا ورنہ وہ اس قسم کے شعر نہ کہتے :

زمین گول ہے چوکور کیوں نہیں آخر
ہر اک مقام پہ ظاہر ہمارا پاگل پن

مولانا صاحب اپنی غزلوں کے ہیرو کو "ملکِ سخن کا شہزادہ" کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ شہزادے صاحب اپنا محلّہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ اہلِ محلّہ پر جو قیامت گزری اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے:

گیا ہے جب سے وہ ملکِ سخن کا شہزادہ
عجیب حال محلّے کی لڑکیوں کا ہے

اگر شہزادے نے آیندہ انتخابات میں حصہ لیا تو معلوم نہیں یہ لڑکیاں انھیں ووٹ دیں گی یا نہیں؟ خیر یہ محلے والوں کا داخلی معاملہ ہے ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ شہزادہ جان عالم محلّہ چھوڑ کر گئے کہاں؟ اس کا سراغ ایک نظم سے ملتا ہے۔ شہزادے صاحب لندن چلے گئے اور وہاں دریائے ٹیمز کے کنارے کسی اور کے ساتھ راتوں کو ٹہلا کرتے تھے :

ٹیمز کے پاس وہ گلگشت شبانہ ہائے
کسی صورت بھی فراموش نہیں ہو سکتی

شہزادے صاحب جب وطن واپس آئے تو یہ مشکل پیش آئی کہ راستے میں فلموں والی سماج کی دیوار کھڑی ہو گئی :

خدا سے مانگ ہی لیں گے تجھے مگر ہم نے
خدا کے بعد سنا ہے کوئی سماج بھی ہے

ظالم سماج نے کوئی ایسی چال چلی کہ ہیروئن بے راہروی پر اتر آئی۔ اس نے کسی اور سے ساز باز کر لی :

ایک دولت کے پجاری کی پرستار بھی ہے
اور پھر مجھ سے محبت کی طلب گار بھی ہے

بڑی غلط بات ہے۔ فریقِ ثانی کو زیب نہیں دیتا کہ دونوں طرف ہاتھ مارے۔ اسے کسی ایک کا ہو کر رہنا چاہیے تھا۔ شہزادہ جان عالم اور دولت کے پجاری میں سے کسی ایک کو بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کرلینا چاہیے تھا۔ بہرحال ہیروئن نے دیکھا کہ شہزادے صاحب کچی گولیاں نہیں کھیلتے تو اُس نے تغافل سے کام لینا شروع کر دیا۔ شہزادہ جان عالم اس پر بھی باز نہ آئے تو ہیروئن نے ان پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے جن کی تفصیل ان شعروں میں ملتی ہے :

میں تو تھا اس کے چمن زارِ محبت کا اسیر
لیکن اس نے مجھے ہر شاخ کا طائر جانا
اس نے اخلاص کے مارے ہوئے دیوانے کو
ایک آوارہ و بدنام سا شاعر جانا

اس کے بعد تعلقات تقریباً ختم ہو گئے۔ ایک مرتبہ امید کی کرن نظر آئی :

وہ کہاں آتی مگر ہمجولیاں کہنے لگیں
آج ہم بھی دیکھ آئیں تیرے دیوانے کو چل

لیکن گمانِ غالب ہے کہ ہیروئن نے ہمجولیوں کو شہزادے کے پاس جانے سے روک دیا۔ اس کے بعد شہزادے کا یہ حال ہوا :

کہیں بکھری ہیں کتابیں کہیں میلے کپڑے
گھر کی حالت ہی عجب ہم نے بنا رکھی ہے

یہ تو سنا تھا کہ عشق میں گھر، صحرا ہو جاتا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جلد سازی کی دکان یا لانڈری بھی کھل سکتی ہے۔

مولانا کوثر نیازی کے مجموعۂ کلام میں صرف کیوپڈ کے تیروں اور محلے کی لڑکیوں کا ذکر نہیں، اور بہت کچھ بھی ہے۔ مثلاً اس میں بہت سے ایسے شعر ملتے ہیں جن میں مولانا صاحب نے اپنی وزارت کے زمانے کو بڑی حسرت سے یاد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی شاعری فراق کے لمحوں میں پیدا ہوتی ہے۔ "لمحے" کی شاعری بھی فراق کی شاعری ہے جس میں زمانۂ افتراق کی یادیں قدم قدم پر دامن گیر ہوتی ہیں اور مولانا صاحب بیتے دنوں کی یادوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں :

آوارہ ہیں لیکن اب اتنے بھی نہیں ہیں جتنے کل
بیتے دنوں کی یادوں کا بس بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں

مطلب یہ کہ جیسی اور جتنی آوارگی وزارت کے زمانے میں کرلی تھی، اتنی گو اَب ممکن نہیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ کام چل ہی جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بوجھ اٹھا کر بس اتنی ہی آوارگی کی جاسکتی ہے جتنی ریلوے اسٹیشن کا قلی کرلیتا ہے۔ پلیٹ فارم سے بوجھ اٹھایا اسٹیشن سے باہر لے جاکر رکھ دیا۔ لیکن مولانا صاحب کا بوجھ ایسا نہیں ہے کہ وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی سر سے اتار سکیں۔ جب تک وزارت کا پرانا زمانہ لوٹ کر نہیں آئے گا، یہ بوجھ سر پر ہی نہیں دل پر بھی رہے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے۔

وزارت کے اچھے دنوں میں مولانا صاحب کے چاروں طرف ہاں میں ہاں ملانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ مگر جب زمانہ بدلا تو یہ سب "جی حضوریے" غائب ہوگئے۔ دیکھیے اس صورت حال کو مولانا صاحب نے کتنی خوب صورتی سے بیان کیا ہے :

کہاں گئے مری مصروف ساعتوں کے رفیق
صدائیں دیتی ہیں اب ان کو فرصتیں میری

اپنی موجودہ کس مپرسی کو مولانا نے جابجا موثر انداز سے بیان کیا ہے:

جن کا ہر لمحہ گزرتا تھا مری قربت میں
دور و نزدیک نظر آتے نہیں اب میرے
مجھ سے کترا کے گزر جاتے ہیں دیرینہ رفیق
راستے دیکھتے ہیں سخت کٹھن جب میرے

بیزار ہیں کوثر وہی گھر آج ہمیں سے
جو دم سے ہمارے ہی کل آباد ہوئے تھے

انھیں اس کا بھی شدید احساس ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اب تقدیر بدل چکی ہے :

دیکھو نہ دوستو مجھے حیرت سے اس طرح
میں اب بھی ہوں وہی مری تقدیر وہ نہیں

تقدیر کے بدلنے کا جو نتیجہ نکلا' اس کی عکاسی بھی دیدنی ہے :

چند مرجھائے ہوئے پھول ہیں گل دانوں میں
رنگ پہلا سا کہاں اب مرے افسانوں میں

ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ سرکاری دفتر کے گل دان مولانا کے پاس کیسے رہ گئے۔ عرض یہ ہے کہ یہ گل دان سرکاری نہیں' اگر ہوتے تو صدر ضیاء الحق کے شائع کردہ وائٹ پیپر میں ان کا بھی تذکرہ ہوتا۔ یہ دراصل علامتی گل دان ہیں جن سے مراد زمانۂ ماضی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کا مطلب ہے ماضی کی یادیں۔ یعنی وہ دیرینہ رفیق جو کبھی دامن کشِ دل رہتے تھے' اب دامن کشاں گزر جاتے ہیں۔ دیرینہ رفیقوں کو مرجھائے ہوئے پھول اس لیے کہا ہے کہ گزشتہ آٹھ برسوں میں ان رفیقوں پر امتدادِ زمانہ کا کچھ تو اثر ہوا ہو گا۔ اور کچھ نہیں تو اُن کی عمروں میں آٹھ آٹھ برس کا اضافہ تو یقیناً ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ لیلیٰ وزارت سے جدائی مولانا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس بُت حیلہ جُو کو یاد کرنے کے انھوں نے نئے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک خوب صورت شعر ملاحظہ ہو :

جو تری فرقت میں گزرے تھے ہواؤں کی طرح
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اب تک ان حسیں لمحات کو

"ڈھونڈنے" کا یہی عمل مولانا کی شاعری میں قنوطیت پر رجائیت کو غالب کر دیتا ہے اور بالآخر وہ یہ اعلان کرتے ہیں:

مجھ کو کچھ دیر میں غرقاب سمجھنے والو
کیسے طوفاں سے نکلتا ہے سفینہ دیکھو

سفینے کو طوفاں سے نکالنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور حکومت سے مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لیے اس قسم کے شعر کہتے ہیں :

آپ بھر جائے گا ہر زخمِ جدائی دل کا
تم کسی روز ذرا ہنس کے بلاؤ تو سہی
ہم نے مانا کہ بلانوش نہیں ہے کوثر
اپنی آنکھوں سے کبھی اس کو پلاؤ تو سہی

جب ان شعروں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُدھر سے طلبی کا پیغام نہ آیا تو مولانا نے ایک خاص طریقہ اختیار کرنے کا اعلان کیا:

اب اس کے دروازے پر دستک دیں گے اس عالم میں
پاؤں سے ننگے، گردن میں مالا، ہاتھوں میں کشکول

اور پھر عمل بھی کر کے دکھا دیا۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ بارگاہِ عالی سے بلاوا آگیا۔ ملاقات ہوئی اور یوں غم کے بادل چھٹ گئے اور امید کا سورج طلوع ہوا۔ مولانا صاحب کے حوصلے اس حد تک بڑھے کہ انھوں نے یہ شعر تصنیف کر ڈالا :

آج حصار دار و رسن میں ہوں پر آنے والا دن
شہر کی دیواروں پر چسپاں دیکھے گا فرمان مرے

شہر کی دیواروں پر دواخانوں اور قسمت کا حال بتانے والوں کے اشتہار اور پوسٹر تو نظر آتے ہی رہتے ہیں، اب اِن شاء اللہ مولانا کوثر نیازی کے فرامین بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔

بارہ گاہِ عالی میں باریابی کے بعد سے مولانا مسلسل انتظار میں رہتے ہیں اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ :

گمان دل کو ہوا ہے ہر ایک آہٹ سے
کہ جیسے اب کوئی دروزاہ کھٹکھٹائے گا

اس سلسلے میں یہ شعر بھی مولانا کی دلی کیفیات کا غماز ہے:

دل نہیں لگتا ہے کوثر محفلِ ارشاد میں
پھر اسی جانِ تمنا کے صنم خانے میں چل

مولانا جیسے شاعرانہ مزاج رکھنے والے عبقری کے لیے محفل ارشاد میں بیٹھنا ایسا ہی ہے جیسے ہرن پر گھاس لادنا۔ ان کی صحیح جگہ "جانِ تمنا" کا "صنم خانہ" ہے جہاں پہنچ کر اس قسم کے شعر "سرزد" ہوتے ہیں:

ہے تقاضائے غمِ جاں آج مے خانے میں چل
یعنی اس شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل

دوسرا مصرع مجاز کا ہے جسے مولانا نے اپنا لیا ہے۔ ایک مصرع ہی کیا، مولانا صاحب کو چاہیے کہ مجاز کا پورا کلام اپنے نام سے چھپوالیں کیونکہ وہ "لباسِ مجاز" میں ہی اچھے لگتے ہیں۔

یہاں ایک ضروری امر کی وضاحت بھی کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔ "لمحے" میں دو شعر ایسے ملتے ہیں جن میں اربابِ اقتدار سے ملاقات کا تاثر کچھ عجیب سا ہے :

رو دھو کے آج اس کو تو آخر منا لیا
خود کو مگر خود اپنی نظر سے گرا لیا

حال دل اس کو سنا کر ہے بہت خوش کوثر
لیکن اب سوچ ذرا کیا تری اوقات رہی

ان شعروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مولانا کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے یہ شعر کسی اور شاعر کے ہوں جو غلطی سے مولانا کے دیوان میں شامل ہو گئے ہیں۔ تاریخِ ادب میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے دیوان میں شامل ہو گیا۔ ایسے کلام کو اصطلاح میں الحاقی کلام کہتے ہیں۔ کم علمی کی وجہ سے ہم اس معاملے میں کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ سوڈیڑھ سو سال بعد کوئی محقق ہی فیصلہ کر سکے گا کہ مذکورہ دو شعر الحاقی ہیں یا باقی سارا کلام۔

یوں تو مولانا کا یہ دیوان اول تا آخر اُن کی آپ بیتی ہے لیکن اپنے بارے میں بعض شعر تو انھوں نے بڑے کمال کے کہے ہیں۔ مثلاً:

خدا کا شکر کہ میں خود شناس ہوں ورنہ
سمجھتا کون پُراسرار عادتیں میری

یہ کچھ عادتوں اور حرکتوں پر موقوف نہیں، ہر پُراسرار چیز پُرکشش ہوتی ہے۔ مولانا کی شخصیت کی کشش ان کی پُراسرار عادتوں ہی کی وجہ سے ہے، اور یہ خوشی کی بات ہے کہ مولانا اپنی عادتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ موقع شناسی کی طرح خود شناسی بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ مولانا کی پُراسرار عادتوں کی تفصیل تو انھیں کو معلوم ہوگی، البتہ ایک عادت کا علم ہمیں بھی ہے جس کا ذکر مولانا نے اس شعر میں کیا ہے :

مجھ میں ہے کوثر مرے بچپن کی اک عادت ابھی
روٹھ جاؤں تو بہت مشکل ہے بہلانا مجھے

ہمیں تو مولانا کی شاعری بھی بچپن کی ایک عادت ہی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ جب وہ شعر کہنے پر آجاتے ہیں تو پھر انھیں روکنا یا سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اس کتاب کی ضخامت کے مقابلے پر قیمت خاصی زیادہ ہے۔ ممکن ہے اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالیں کہ آج کل کی شاعری کی طرح روپے کی قیمت بھی بہت گر گئی ہے۔ ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر کتاب کی قیمت کی بجائے کلام کو دیکھا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا :

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہی کلام اگر مولانا صاحب کی وزارت کے زمانے میں چھپتا تو کتاب کی قیمت ہی نہیں، تعدادِ اشاعت بھی زیادہ ہوتی۔ دس بیس ہزار نسخے تو اطلاعات اور اوقاف کی وزارتیں ہی خرید لیتیں۔ خیر اب بھی خدا نے چاہا تو یہ کتاب خوب بکے گی۔ ہمارے ملک میں کتابوں کے ایسے قدردان بڑی تعداد میں موجود ہیں جو کتاب کی قیمت نہیں دیکھتے، صرف گیٹ اپ دیکھتے ہیں۔ گیٹ اپ کے اعتبار سے یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ کسی پریس میں نہیں بیوٹی پارلر میں چھپی ہے۔ کاغذ، طباعت، سرورق، غرض کسی پہلو سے کتاب پر آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ اگر کہیں ٹھہرتی ہے تو مولانا صاحب کی تصویر پر جو کتاب کے عقبی سرورق پر جلوہ گر ہے۔ اس تصویر میں مولانا صاحب اپنے کلام کے برعکس خاصے سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عین فکرِ سخن کے دوران یہ تصویر کھینچی گئی ہو۔

(۳و ۱۰/ جنوری ۱۹۸۵ء)

"بوئے رسیدہ" یا "بوئے عمر رسیدہ"

آج کل پاکستان اور ہندوستان کے ادبی تعلقات خاصے خوشگوار ہو رہے ہیں۔ عام پاکستانی روزگار کے لیے دوبئی وغیرہ جاتے ہیں لیکن ادیب غمِ روزگار سے بے نیاز ہو کر ہندوستان کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے اور اُنھیں خوب بانس پر چڑھایا جاتا ہے اور پھر اِسی حالت میں اُن کے ادبی قد و قامت کی پیمائش کی جاتی ہے۔ گویا جن ادیبوں کو خود اُن کے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا' اُن کے پوچھنے والے بلکہ آنسو پونچھنے والے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔

اِس سال ہندوستانی ادیب بھی خاصی بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ اُن میں زیادہ تر مشاعروں کے شاعر تھے جن کے نام پہلی اور آخری بار ایک ساتھ سننے میں آئے۔ کچھ شاعرات بھی تھیں جن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا ترنم تھا۔ یعنی اگر اُن کی شاعری سے اُن کا ترنم منہا کر دیا جائے تو ناز و ادا ہی باقی رہ جاتے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان سے بعض ایسے اہلِ قلم بھی آئے جن کے لیے اہلِ پاکستان نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے۔ جناب جگن ناتھ آزاد کا شمار ایسے ہی معززینِ ادب میں ہوتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے اُن ڈیڑھ دو شاعروں میں سے ہیں جو پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ وہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال پاکستان ضرور تشریف لاتے ہیں۔ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے اور کبھی علامہ اقبال کے حوالے سے کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنے کے لیے۔ یہاں آتے ہی وہ اپنے چاہنے والوں میں تبرک کی طرح تقسیم ہونے لگتے ہیں۔ ایک دن میں اُن کی دس دس دعوتیں ہوتی ہیں۔ خوش اخلاق وہ اتنے ہیں کہ ہر دعوت قبول کر لیتے ہیں اور ہر دعوت کے بعد کلام بھی سناتے ہیں۔ لیکن وہ صرف شاعر نہیں' پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں' اِس لیے ہر محفل میں گفتگو بھی

خوب کرتے ہیں اور یہ گفتگو بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ اُنھوں نے حافظہ بلا کا پایا ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں شعر یاد ہیں' اپنے ہی نہیں' دوسروں کے بھی۔ اپنا کلام تو ہر شاعر کو یاد ہوتا ہے لیکن آزاد صاحب کو دوسرے شاعروں کے شعر بھی بڑی تعداد میں یاد ہیں۔ علامہ اقبال کا تو پورا کلام حفظ ہے۔ محتاط اتنے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے شعر علامہ اقبال کے نام سے یا علامہ کے شعر اپنے نام سے سنا دیے ہوں۔ حالاں کہ علامہ سے اُن کی عقیدت ایسی ہے کہ من و تو کا فرق مٹ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ علامہ کے شعر اپنے نام سے سنا کر وہ اپنے آپ کو عالمی سطح کے شاعروں میں شامل کر سکتے ہیں' اور اپنے شعر علامہ کے نام سے سنا کر اُنھیں سائل دہلوی اور نوح ناروی کی قبیل کا شاعر ثابت کر سکتے ہیں۔

اب کے آزاد صاحب کی گفتگو کا مرکزی خیال جموں کا سیلاب تھا جس میں اُن کا ذاتی کتب خانہ برباد ہو گیا۔ وہ اِس سیلاب کا ذکر خصوصاً اپنی کتابوں کی "غرقابی" کا تذکرہ بڑے درد انگیز انداز میں کرتے رہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ نہ صرف مطبوعہ کتابیں ضائع ہوئیں' اُن کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی برباد ہو گئے۔ ایک محفل میں جب ہم نے آٹھویں مرتبہ سیلاب کی داستانِ دل خراش سنی تو عرض کیا' اگر آپ اجازت دیں تو ایک درد انگیز واقعہ بلا تشبیہ ہم بھی سنائیں۔ آزاد صاحب نے نہایت خوش دلی سے اجازت دے دی' حالاں کہ محفل میں وہ کسی دوسرے کو بولنے کی اجازت ذرا مشکل ہی سے دیتے ہیں۔ ہم نے جو واقعہ سنایا یہ تھا کہ چند برس قبل ایک مشہور ادیب کے گھر میں اتفاق سے آگ لگ گئی۔ اُن کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں جل گئیں۔ کئی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہارِ ہمدردی کے لیے اُن کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقعے پر اظہارِ افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے منفرد انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ اُس نے کہا: "اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے لیکن یاد رکھیے ہر شر میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے"۔

اِس واقعے سے آزاد صاحب بھی محظوظ ہوئے۔ فرمایا: "چونکہ یہ واقعہ آپ نے بلا تشبیہ سنایا

ہے اِس لیے آپ کی نیک نیتی پر شبہہ نہیں کیا جاسکتا"۔

آزاد صاحب کی کراچی تشریف آوری سے کچھ دن پہلے اُن کا نیا مجموعۂ کلام "بوئے رسیدہ" کے نام سے کراچی سے شائع ہوا تھا۔ یہ موصوف کا ساتواں مجموعۂ کلام ہے جو پہلی مرتبہ پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ آزاد صاحب کی کراچی میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناشر نے "بوئے رسیدہ" کی تقریبِ رونمائی کا اہتمام کیا جس میں کراچی کے مشہور نقادوں نے مقالے پڑھے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی تمام نقادوں نے جو مقالے پڑھے، وہ "بوئے رسیدہ" کی بجائے تقریب کے دعوت نامے کے مطالعے کا نتیجہ تھے۔ ایک مقالہ نگار سے ہم نے کہا: "حضرت! آپ نے کتاب کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں، آزاد صاحب کے بارے میں سامنے کی باتیں کہہ دی ہیں"۔ اُنھوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا: "آزاد صاحب کے سامنے، سامنے ہی کی باتیں نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ قصّہ یہ ہے کہ تقریب سے صرف چند گھنٹے پہلے مجھ سے مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کتاب مجھے اُس وقت ملی جب میں مقالہ لکھ چکا تھا"۔

آزاد صاحب کو بھی اِس کا احساس تھا کہ مقالہ نگاروں نے اُن کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم نے اُن کی دل جوئی کی خاطر عرض کیا: "پاکستان میں یہی رواج ہے کہ کتابوں کی رونمائیوں میں جو مقالات پڑھے جاتے ہیں، وہ متعلّقہ کتابوں کو پڑھے بغیر لکھے جاتے ہیں"۔ آزاد صاحب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اِس کا سبب پوچھا تو ہم نے بتایا: "کتاب پڑھنے کے بعد اُس کی خوبیاں تلاش کرنے کا کام مشکل ہو جاتا ہے"۔

آزاد صاحب کو اِس کا بھی غم تھا کہ اُنھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "بوئے رمیدہ" رکھا تھا لیکن ناشر نے اُسے "بوئے رسیدہ" بنا دیا۔ آزاد صاحب چاہتے تھے کہ کتاب کا نام تبدیل کر دیا جائے کیوں کہ "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب ہے۔ لیکن ناشر اِس پر آمادہ نہ ہوا کیوں کہ اُس نے کتاب کا خوبصورت سرورق کئی رنگوں میں بڑی محنت سے تیار کیا تھا اور خاصی رقم صرف کر کے اُسے چھپوایا تھا۔ آزاد صاحب نے "بوئے رسیدہ" کی بے معنویت کا ذکر کئی مرتبہ کیا۔ ایک محفل میں استاد لاغر مراد آبادی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے فرمایا: "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب نہیں ہے۔ چوں کہ اِس مجموعے میں آپ کا ادھیڑ عمری کے زمانے کا کلام شامل ہے، اِس لیے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات آتی ہے کہ "بوئے رسیدہ" سے مراد "بوئے عمر رسیدہ" ہے۔

(۱۸/ مئی ۱۹۸۹ء)

بڑی شاعری اور بُری شاعری

اپنے قارئین سے ہماری اتنی بے تکلفی تو نہیں ہے کہ انھیں شعر سنائے جائیں کیوں کہ ہمارے نزدیک شعر سنانے یا بے نقط سنانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ آج کل کراچی کا موسم ایسا خوش گوار ہے کہ طبیعت شعر و شاعری کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ لہٰذا تکلف برطرف، عرض کیا ہے کہ :

تمھاری یاد میں بکھر بکھر جاتا ہوں
خود سے پوچھتا ہوں کیا سبب تھا بے وفائی کا

زندگی کی طلب ہے نہ مرنے کا خوف
جانے کیسے بے دلی کے عالم میں جی رہے ہیں ہم

ہزار تلخیاں ہیں اپنی ذات کے ساتھ
میں کہاں بھٹک گئی ہوں تیری یاد کے ساتھ

قارئینِ کرام یہ شعر سن کر آپ یقیناً محظوظ ہوئے ہوں گے اور اِس کے ساتھ ہی تھوڑے سے حیران اور پریشان بھی ہوئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ محظوظ ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ شعر اسلوب کے اعتبار سے اچھوتے ہیں، حیرانی و پریشانی کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں جن پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ پہلے یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ شعر ہماری جولانیِ طبع کا نتیجہ یعنی ہمارے طبع زاد نہیں

ہیں۔ انھیں ہم نے کسی دوسری زبان سے ترجمہ بھی نہیں کیا کیوں کہ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان اس طرح کی بے تکلفی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اسی قسم کے شعروں کے مجموعے شائع کر کے مقتدرہ قومی زبان اردو کو نافذ کرنے کی مہم میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ ایسے شعر دل پر براہ راست اثر کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ مقتدرہ کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ املا اور رموز اوقاف کے جھگڑوں میں الجھی ہوئی ہے۔ حالاں کہ یہ جھگڑے محکمۂ اوقاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں مقتدرہ نے املا پر ایک سیمینار کیا تھا جس میں نامی گرامی دانش وروں کو بلایا گیا تھا جو نامی زیادہ تھے اور گرامی برائے نام۔ افسوس کہ ہمیں نہیں بلایا گیا اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارا املا درست ہے۔ معلوم نہیں اس سیمینار میں شرکت سے مذکورہ بالا نامیوں گرامیوں کو کیا فائدہ پہنچا، ہمیں شرکت نہ کرنے سے البتہ یہ فائدہ ہوا کہ ہم ہجّوں کی غلطیاں کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ اب مقتدرہ کو چاہیے کہ ایک سیمینار خوش خطی پر بھی کر ڈالے کیوں کہ جب سے نوری نستعلیق کا رواج ہوا ہے لوگوں نے اس کے حسن سے مرعوب ہو کر اپنا خط بگاڑ لیا ہے۔ خوش خطی والے سیمینار کی صدارت میرزا ادیب صاحب کو کرنی چاہیے کیوں کہ میرزا صاحب کا خط، خطِ مرموزہ کی قسم کی چیز معلوم ہوتا ہے جسے پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہمارے رسالے میں میرزا صاحب کا ایک تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس کا مسودہ جب ایڈیٹر نے کتابت کے لیے دیا تو کاتب صاحب نے فرمایا: "میں اردو کے مسودوں کی کتابت کرتا ہوں۔ موہنجوڈارو کے رسم الخط سے واقف نہیں ہوں"۔ اس پر ایڈیٹر نے عملے کے ایک رکن سے میرزا صاحب کے مسودے کو نقل کرایا اور کاتب کے حوالے کیا۔ نقل نویس نے آٹھ دس جگہ املا کی غلطیاں کی تھیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ نقل نویس بھی مقتدرہ کے املا سیمینار میں بطور مبصر شرکت کر چکے تھے۔

نوری نستعلیق کا ذکر آیا ہے تو ایک لطیفہ بھی سن لیجے۔ کچھ عرصہ ہوا نوری نستعلیق کے موجد جناب جمیل مرزا نے ایک پریس کانفرنس کی تھی۔ اس کے بعد عشائیہ بھی تھا۔ جمیل مرزا صاحب نے ایک صحافی سے پوچھا: "کیا آپ کو کھانا پسند آیا"؟ صحافی نے جواب دیا: "بہت مزے کا کھانا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں نوری نستعلیق نگل رہا ہوں"۔

معاف کیجیے، ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ بات شعروں سے شروع ہوئی تھی اور ہم یہ عرض

کر رہے تھے کہ مذکورہ شعر ہماری تصنیفِ لطیف نہیں ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ انھیں مولانا کوثر نیازی کے رشحاتِ فکر سمجھیں لیکن یہ بھی درست نہیں کیوں کہ تیسرے شعر میں تانیث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا صاحب اپنی سیاسی وفاداریاں تو بدل سکتے ہیں، صیغہ نہیں بدل سکتے۔

قارئین کرام کو زیادہ دیر تک سسپنس میں رکھنا مناسب نہیں، لہٰذا ہم بتائے دیتے ہیں کہ مذکورہ اشعار گلوکارہ ناہید اختر کے ہیں۔ لاہور کے ایک اخبار میں موصوفہ کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ: "یوں تو مجھے شروع ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا لیکن گلوکاری کی مصروفیات کی وجہ سے میں اپنا شوق پورا نہ کر سکی۔ گزشتہ تین چار برس سے شعر کہنے کا شوق پھر زور پکڑ گیا تو میں نے طبع آزمائی شروع کر دی اور اب تک کئی غزلیں لکھ چکی ہوں"۔

محترمہ کا نمونۂ کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شعر کہنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کاش وہ گلوکاری کی مصروفیات کو بہانہ بنا کر شاعری کے شوق کو نہ دبائیں۔ مصروفیات تو قتیل شفائی اور اقبال صفی پوری کی بھی تھیں لیکن انھوں نے کبھی اپنے شوق کو نہیں دبایا۔ ہمیشہ شاعری ہی کو دباتے رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس حد تک دب گئی ہے کہ آج ان دونوں کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔

بہرحال یہ امر مسرت کا باعث ہے کہ گزشتہ تین چار برسوں سے ناہید اختر کا شوقِ شاعری زور پکڑ گیا ہے۔ شاید اسی زور آزمائی کا نتیجہ ہے کہ ان کے شعر عروض کی پٹڑی سے اتر گئے لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ اچھے شعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ عروض کا پابند ہو۔ جب کسی شعر میں کام کی اور بہت سی باتیں ہوں، عروض تو کیا معنوں کو بھی بہ آسانی نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ محترمہ کے جو تین شعر اوپر درج کیے گئے ہیں ان میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ مثلاً پہلے شعر ہی کو لیجے۔ اس میں محترمہ نے اپنے لیے تذکیر کا صیغہ استعمال کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ کسی کی بے وفائی کا سبب انھوں نے اپنے آپ سے پوچھا ہے، کوئی کم ہمت ہوتا تو فال نکالنے والے توتے سے پوچھتا۔

اگر ہم صاحبِ دیوان ہوتے تو اپنا دیوان دے کر محترمہ سے ان کے تینوں شعر لے لیتے۔ اب ہم یہی کر سکتے کہ محسن بھوپالی کے تینوں دیوان محترمہ کے حوالے کر دیں اور محترمہ کے تینوں شعر محسن

بھوپالی کو سونپ دیں۔ سودا بُرا نہیں۔ محسن صاحب فائدے میں ہی رہیں گے کیوں کہ محترمہ نے اعلان کیا ہے کہ آیندہ وہ ٹی وی پر خود اپنا کلام گایا کریں گی۔ محسن بھوپالی کے کلام کو جب وہ اپنا کلام سمجھ کر گائیں گی تو یہ کلام زبان زدِ خاص و عام ہو جائے گا۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ ناہید اختر کے تین شعر محسن بھوپالی کے کس کام آئیں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تینوں دیوان ناہید اختر کو دے دینے کے بعد محسن بھوپالی کے پاس کچھ نہ کچھ رہنا چاہیے۔ اگلے سال ساداتِ امروہہ کے مشاعرے میں انھیں کلام سنانا ہی ہو گا۔ یہ تین شعر وہاں کام آئیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ساداتِ امروہہ کے مشاعروں میں شعروں سے زیادہ شاعر کام آتے ہیں۔

ناہید اختر نے بتایا ہے کہ ان میں شعر گوئی کا شوق احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کے مطالعے سے پیدا ہوا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ فراز اور پروین کی شاعری کے مطالعے کا کوئی مثبت نتیجہ ظاہر ہوا' ورنہ اب تک تو ہم نے یہی دیکھا تھا کہ ان دونوں کے کلام سے سے متاثر ہو کر لوگ شاعری ترک کر دیتے تھے۔

ناہید اختر نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خصوصاً میر تقی میر اور غالب کا کلام کئی بار پڑھا ہے۔ موصوفہ کے اس بیان کی تصدیق ان کے مندرجہ بالا اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ میر اور غالب کے ہاں محبوب کی بے وفائی اور زندگی سے بیزاری کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ ناہید اختر نے بھی ان مضامین کو اس خوب صورتی سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے بہ آسانی زندگی سے بیزار ہو سکتے ہیں۔

ناہید اختر نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی کہا ہے: "شعر کہنے سے پہلے میں نے مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب مقدمۂ شعر و شاعری کا مطالعہ کیا ہے' اس کے بغور اور بار بار مطالعے سے مجھے شعر گوئی کے بارے میں بہت سا علم حاصل ہوا ہے"۔ مولانا حالی اگر زندہ ہوتے تو انھیں بے حد خوشی ہوتی کہ ان کا علم ضائع ہونے سے بچ گیا اور آخر کار کسی نہ کسی کے کام آ ہی گیا۔

ناہید اختر نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کسی بڑے شاعر سے اصلاح لینے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں کشور ناہید کی طرح ناہید اختر کا کلام بھی اصلاح سے بالا ہے۔ جب اصلاح کی گنجایش ہی نہیں تو کوئی اصلاح کیا دے گا؟ ویسے بھی آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ ہم نے کئی ایسے استاد

دیکھے ہیں جو اصلاح کے بہانے شاگردوں کا کلام ہتھیا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں استاد اختر انصاری اکبر آبادی کا ایک واقعہ ان کے شاگرد سلطان جمیل نے سنایا ہے۔ سلطان جمیل اب تو اپنے منھ کا مزہ بدلنے اور اور دوسروں کے منھ کا مزہ خراب کرنے کے لیے افسانے لکھتے ہیں لیکن کسی زمانے میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک غزل استاد کو اصلاح کے لیے دی۔ کچھ دنوں بعد شاگرد نے غزل واپس مانگی تو استاد نے کہا: "میاں طبیعت پر زور دے کر شعر کہا کرو تمھاری غزل تو بڑی بے مزہ تھی۔ اصلاح کی گنجایش بالکل نہیں تھی' اس لیے میں نے پھاڑ کر پھینک دی"۔

کچھ عرصے بعد یہی غزل استاد نے اپنے رسالے میں اپنے نام سے شائع کر دی۔ شاگرد نے دیکھی تو شکوہ کیا: "استاد! آپ نے تو کہا تھا کہ غزل پھاڑ کر پھینک دی' پھر یہ رسالے میں آپ کے نام سے کیسے چھپ گئی"؟ استاد نے فرمایا: "میاں غلطی ہو گئی۔ جیب میں تمھاری غزل رکھی تھی اور میری بھی۔ اپنی غزل میں نے پھاڑ کر پھینک دی اور تمھاری غزل کاتب کے حوالے کر دی۔ آیندہ اصلاح کے لیے مجھے تم دو غزلیں دینا تا کہ ایک پھاڑ کر پھینک دوں تو دوسری اصلاح کے بعد تمھیں واپس کر دوں"۔

(۹/ اگست ۱۹۸۵ء)

ناول یا تحقیقی مقالہ

خدا بخشے مرزا ظفر الحسن مرحوم بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ انھوں نے گھر گھر جا کر کتابیں جمع کیں اور غالب لائبریری قائم کردی۔ یہ اہلِ کراچی پر اُن کا بہت بڑا احسان ہے۔ جن دنوں یہ لائبریری نئی نئی قائم ہوئی تھی، مرزا صاحب کا معمول یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکلتے اور شام کو گاڑی بھر کتابیں جمع کر کے خوش خوش واپس آتے۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد انھوں نے جمع شدہ کتابوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اِن میں ننانوے فی صد کتابیں مشہور شاعر عبدالعزیز خالد کی تصانیف تھیں۔

اگر اب کوئی مرزا صاحب مرحوم کی تقلید میں لائبریری کے لیے کتابیں جمع کرنے کے لیے نکلے تو یقین ہے کہ اِس مرتبہ جس کتاب کے سب سے زیادہ نسخے بطور عطیہ ملیں گے، وہ شہزاد منظر کی تازہ ترین تصنیف ہوگی جس کا نام ہے "اندھیری رات کا تنہا مسافر"۔ یہ ایک ناول ہے جو خاصی بڑی تعداد میں تحفتہً تقسیم کیا گیا ہے۔ عبدالعزیز خالد کی کتابیں لائبریری کو مع سرورق ملی تھیں لیکن شہزاد منظر کا ناول سرورق کے بغیر ملے گا کیوں کہ ناول سے زیادہ اُس کا سرورق مقبول ہوا ہے۔ شہر کی بے شمار پان سگریٹ کی دکانوں کی آرائش کا کام آج کل اِسی سرورق سے لیا جا رہا ہے۔

اس کی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ ناول کے متن سے زیادہ اُس کا سرورق جاذبِ توجہ ہے۔ ناول لکھنا تو شہزاد منظر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن سرورق بنانے والا مصور خاصا مشاق معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اُس کی ساری زندگی فلموں کے پوسٹر بنانے میں گزری ہوگی۔

ناول کے شروع میں ۱۴ صفحات دیباچے کی نذر ہوئے ہیں اور آخری آٹھ صفحات میں مصنف کی ایک اور تصنیف "جدید اردو افسانہ" کے بارے میں مشاہیر کی رائیں درج کی گئی ہیں۔ اگر اِن چیزوں کو ناول کا حصہ نہ سمجھا جائے تو باقی صرف ۱۲۲ صفحات رہ جاتے ہیں اور وہ بھی درسی سائز کی

کتاب کے۔ اگر یہ ناول شفیق الرحمان کی کتاب "حماقتیں" کے سائز میں چھاپا جاتا تو اُس کی ضخامت اِس کتاب کے ایک باب کے برابر ہوتی ہے۔ اِس بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہزاد منظر کی اِس تصنیفِ لطیف کو ناول کہنا بڑی زیادتی ہے' اسے طویل مختصر افسانہ یا زیادہ سے زیادہ ناولٹ کہنا چاہیے۔ ہمیں اِس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ جب منیر نیازی اپنی جوانی کے زمانے کے کلام کو "کلیات" کے نام سے چھاپ سکتے ہیں تو شہزاد منظر جوانی سے پہلے کی کسی تحریر کو ناول کے نام سے کیوں نہیں پیش کر سکتے"؟

جنابِ مصنف نے اپنے طویل دیباچے میں اِس ناول کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں' وہ خاصی دلچسپ ہیں۔ جن لوگوں کے پاس ناول پڑھنے کے لیے وقت یا حوصلہ نہ ہو' وہ صرف دیباچہ پڑھ کر شاد کام ہو سکتے ہیں۔ مصنف نے سب سے پہلے اِس الزام کی تردید کی ہے کہ اردو میں کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا۔ اچھے ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے چار ناولوں کے نام لیے ہیں۔ امراؤ جان ادا' آگ کا دریا' ایسی بلندی ایسی پستی' اور وہ ناول جس پر اِس وقت یہ کالم لکھا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں پہلے تین ناولوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ صرف چوتھے ناول کا تذکرہ کافی تھا کیونکہ مقصد الزام کی تردید ہے نہ کہ اچھے ناولوں کے نام گنوانا۔ نام گنوانے کا کام تو شہزاد منظر اپنے تنقیدی مضامین میں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اِس دیباچے کو مردم شماری کی رپورٹ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

مصنّف نے اِس ناول کی شانِ نزول یہ بتائی ہے کہ اسپین کی شاعرہ گبریلا مسترل کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے انھیں خیال آیا کیوں نہ اس موضوع پر ناول لکھا جائے۔ سو انھوں نے فوراً ناول لکھنا شروع کر دیا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ناول مکمل کر کے کراچی کے ایک رسالے میں چھپوا دیا۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو کوئی بات نہ تھی کہ آدمی جوش میں آکر بڑے بڑے معرکے سر کر لیتا ہے لیکن موصوف کچھ اور آگے بڑھے۔ انھوں نے اس ناول کی پہلی اشاعت کے بعد اسے تین مرتبہ از سرِ نو لکھا اور اتنی ہی مرتبہ اسے رسالوں میں چھپوایا۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تینوں دفعہ ناول ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اِس میں مسلسل تبدیلیاں کرتا رہا۔ آخری مرتبہ جب یہ ناول ایک سرکاری رسالے میں شائع ہوا تو اِس کے سارے پس منظر اور بعض قابلِ اعتراض حصوں کو حذف کر دیا گیا۔ اِس لیے کہ اُس وقت تک بنگلہ دیش سے پاکستان

کے سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرکاری جریدے میں جنس کا تذکرہ ممنوع تھا"۔

گبریلا مسترل کی سوانح عمری پڑھنے سے لے کر بنگلہ دیش سے پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہونے تک اِس ناول میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں' اُن کا مطالعہ یقیناً دلچسپی کا باعث ہو گا۔ مگر افسوس کہ فاضل مصنف نے پانچویں مرتبہ کتابی صورت میں ناول کا جو متن شائع کیا ہے' اُس سے ناول کی اُن اندرونی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہوتا' البتہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ناول کا موضوع ایسا ہے کہ اُس پر بار بار طبع آزمائی کی ضرورت ہے۔ امید ہے جنابِ مصنف نظرِ ثانی کا یہ عمل جاری رکھیں گے۔ اِن شاء اللہ کبھی نہ کبھی وہ دن ضرور آئے گا جب اِس ناول میں مزید اصلاح کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس ناول کے سارے واقعات کلکتہ اور لندن کے گرد گھومتے ہیں۔ اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ جنابِ مصنف کبھی لندن نہیں گئے' اس لیے انھیں لندن کے پس منظر میں ناول لکھنے کا کوئی حق نہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ اعتراض بے جا ہے۔ اگر شہزاد منظر لندن نہیں گئے تو کیا ہوا' صہبا لکھنوی تو جا چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے شہزاد منظر نے اُن سے معلومات حاصل کر کے ناول لکھا ہو۔ ہمارے نزدیک اعتراض کرنے والے اور اعتراض کا جواب دینے والے دونوں غلطی پر ہیں۔ صہبا لکھنوی اِس لیے لندن نہیں گئے تھے کہ انھیں شہزاد منظر کے ناول کے لیے پس منظر کا انتظام کرنا تھا۔ انھیں اِس سے کہیں زیادہ اہم کافی کام انجام دینے تھے۔ مثلاً اردو مرکز کے مشاعرے میں کلام سُنانا تھا۔ بی بی سی کے ایک پروگرام میں اردو زبان کے مستقبل پر اظہار خیال کرنا تھا۔ افتخار عارف اور ساقی فاروقی وغیرہ سے اُن کا تازہ کلام مع "افکار" کے سالانہ چندے کے وصول کرنا تھا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہاں تو ذکر ہو رہا تھا کہ جب شہزاد منظر نے لندن نہیں دیکھا تو لندن کے پس منظر میں ناول کیسے لکھ لیا۔ اِس کا جواب خود شہزاد منظر نے اِن الفاظ میں دیا ہے: "میں نے اِس بارے میں کافی تحقیق سے کام لیا ہے۔ انگلستان خصوصاً لندن کے بارے میں انگریزی' اردو' بنگلہ اور ہندی میں جتنی کتابیں' سفرنامے' خود نوشت سوانح حیات اور یادداشتیں ملیں' پڑھ لیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی تارکینِ وطن سے ملاقاتیں کیں اور جب کافی معلومات حاصل ہو گئیں تو میں نے ناول لکھنا شروع کیا"۔

اب تک تو یہی سنا تھا کہ جب لوگ سفر کیے بغیر سفرنامے لکھتے ہیں تو غیر ممالک کے بارے میں کتابیں پڑھتے ہیں، شہزاد منظر پہلے مصنف ہیں جنھوں نے ناول لکھنے کے لیے اتنی بہت سی تاریخ اور جغرافیے کی کتابیں پڑھیں اور باقاعدہ تحقیق کی۔ اِس بنا پر ہماری تجویز یہ ہے کہ موصوف کو ناول نگار نہ سہی، محقق تو ضرور مان لینا چاہیے۔

سلطان جمیل نسیم کا خیال ہے کہ اتنی تحقیق اور مطالعے کے باوجود شہزاد منظر کے ناول کا لندن ویسا ہی ہے جیسا کہ کراچی کا لالو کھیت ☆۔ اور بعض جگہ تو ناول پڑھتے ہوئے قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ تین ہٹی کے پُل پر کھڑا ہے۔ سلطان جمیل نسیم کو چونکہ ناول لکھنے اور پڑھنے کا تجربہ نہیں ہے، اِس لیے اُن کا اعتراض زیادہ وزنی نہیں ہے۔ ہم انھیں مشورہ دیں گے کہ وہ تین ہٹی کے پُل سے ذرا دور جا کر ناول کا مطالعہ کریں تو بہتر ہو گا۔ پُل کے اوپر کھڑے ہو کر ناول پڑھنے کا نتیجہ مہلک بھی ہو سکتا ہے۔

مصنف نے دیباچے میں یہ بھی لکھا ہے: "اِس ناول کے ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اِس کے مخصوص پس منظر اور کرداروں کے باعث اِسے بعض لوگ ترجمہ تصور کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ مصنف کے لیے بہت بڑا کمپلی منٹ ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں، کہ یہ ناول صد فیصد اوریجنل ہے اور یہ میری ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے"۔

نہ جانے وہ کون سخن فہم ہیں جنھیں اِس ناول پر ترجمے کا گمان گزرا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ناول ترجمہ نہیں ہے بلکہ اسے کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دوسری زبانیں بولنے والوں سے ہماری اِتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ ہم انھیں کسی آزمائش میں ڈالیں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد خیال آیا کہ ممکن ہے ہمارے پڑھنے والے یہ اعتراض کریں کہ ہم نے ناول کی کہانی اور کرداروں وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ عرض ہے کہ ہم نے ناول کی ادبی حیثیت کے بارے میں کوئی رائے اس لیے نہیں دی کہ اگلے ایڈیشن میں جنابِ مصنف اس پر نظر ثانی کریں گے۔ تب ممکن ہے کہ کہانی اور کردار تبدیل ہو جائیں، اس صورت میں ہماری تنقیدی رائے کے ضائع جانے کا احتمال ہے۔ لہٰذا ناول کے موجودہ ایڈیشن کے ساتھ ہم اپنی تنقیدی رائے کیوں ضائع کریں۔

☆ لالو کھیت: کراچی کا ایک علاقہ جہاں تین ہٹی کا پُل ہے۔

(۲۷/ دسمبر ۱۹۸۴ء)

اسقاطِ سخن

ایک محفل میں فیض احمد فیض کے کمالات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ ایک ضرورت سے زیادہ ترقی پسند نقاد نے فرمایا، فیض کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اردو زبان کو بہت سے ایسے اشعار دیے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں۔ اِس کے بعد اُنھوں نے یہ دو شعر سنائے :

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک بھی ستم کی سیاہ رات چلے

اہلِ محفل اِن شعروں پر جھومنے لگے اور ہمارا سر گھومنے لگا۔ ہم نے گزارش کی کہ یہ شعر فیض کے نہیں ہیں۔ اِس پر نقاد موصوف نے طنزیہ انداز میں فرمایا: "تو کیا آپ کے ہیں"؟ ایک دوسرے صاحب نے جنابِ نقاد کی تائید میں کہا: "تمام سیاسی جلسوں میں یہ شعر فیض ہی کے نام سے پڑھے جاتے ہیں"۔ تیسرے صاحب یوں لب کشا ہوئے: "اب لوگ فیض کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ اُن کے شعروں کو بھی اُن کے شعر ماننے کے لیے تیار نہیں"۔ اِس ہجومِ عاشقاں میں اگرچہ خاموش رہنا ہی بہتر تھا لیکن ہم نے ہمت سے کام لے کر عرض کیا: "بلاشبہہ فیض بڑے شاعر ہیں لیکن ہر اچھا شعر اُن کا نہیں ہو سکتا۔ دوسروں نے بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ جو دو شعر آپ نے سنائے ہیں وہ فیض کے نہیں مجروح سلطان پوری کے ہیں"۔

اتفاق سے اُس وقت مجروح کے مجموعۂ کلام "غزل" کا پاکستانی ایڈیشن ہمارے پاس تھا۔ وہ ہم

نے نقاد صاحب کے سامنے رکھ دیا اور وہ صفحات بھی دکھا دیے جن پر مذکورہ دونوں شعر موجود تھے۔ نقاد صاحب کچھ دیر دیوان کی ورق گردانی کرتے رہے اور پھر کہنے لگے : "یہ تو جعلی ایڈیشن ہے۔ اِس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا"۔ ہم نے بتایا: "یہ ایڈیشن جعلی نہیں ہے مجروح صاحب کی اجازت سے اُن کے ایک عزیز نے مجروح اکیڈمی کراچی کی طرف سے شائع کیا ہے اور اِس پر مشہور نقاد محمد علی صدیقی کا دیباچہ ہے۔ محمد علی صدیقی کبھی کسی جعلی ایڈیشن پر دیباچہ نہیں لکھ سکتے۔ دیباچے میں اُن شعروں کا حوالہ موجود ہے جو آپ نے فیض کے نام سے سنائے ہیں"۔

نقاد صاحب نے جب یہ دیکھا کہ اُن کا دعویٰ بے بنیاد ثابت ہو رہا ہے تو اُنھوں نے ایک اور نکتہ پیدا کیا : "محمد علی صدیقی کا دیباچہ بھی تو جعلی ہو سکتا ہے"۔ ہم نے کہا: "اگر آپ پسند فرمائیں تو محمد علی صدیقی کو فون کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ دیباچہ اصلی ہے یا جعلی"۔ کہنے لگے : "اِس کی کیا ضمانت ہے کہ فون پر اصلی محمد علی صدیقی سے بات ہو، اِس نام کا کوئی جعلی شخص بھی تو بات کر سکتا ہے"۔ اِس منطق کے بعد ہم لاجواب ہو گئے اور بحث ختم ہو گئی۔

مجروح سلطان پوری سے ہمیں دلی ہم دردی ہے۔ ایک تو اُن کا دیوان پہلے ہی مختصر ہے۔ اُس پر اُن کے تمام اچھے شعر فیض کے کھاتے میں ڈال کر اُسے اور بھی مختصر کر دیا گیا ہے۔ اگر فیض کے عقیدت مندوں کا یہی چلن رہا تو کلیاتِ فیض کے نئے ایڈیشن میں مجروح سلطان پوری کا پورا کلام شامل کر دیا جائے گا۔ جن مقطعوں میں مجروح تخلص باندھا گیا ہے اُن کے بارے میں کہا جائے گا کہ جس طرح غالب کا دوسرا تخلص اسد تھا، اُسی طرح فیض بھی کبھی کبھی منھ کا مزا بدلنے کے لیے مجروح تخلص استعمال کرتے تھے۔

اِس صورتِ حال پر ہمیں پریشان نہیں، خود مجروح صاحب بھی دل گرفتہ ہیں۔ پچھلے دنوں وہ پاکستان تشریف لائے تھے تو اُن کا ایک طویل انٹرویو روزنامہ "جنگ" میں شائع ہوا تھا۔ اِس انٹرویو میں مجروح صاحب نے اِس پر افسوس کا اظہار کیا کہ اُن کے شعروں کو کسی اور کے نام سے منسوب کیا جارہا ہے۔ انٹرویو میں افسوس کی بات یہی ایک ہے، باقی ساری باتیں بڑی مزے کی ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں: "پہلے شاعری ہونی چاہیے، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا سوال بعد میں ہونا چاہیے"۔ خدا جانے مجروح صاحب کس قبیل کے ترقی پسند ہیں جو شاعری کو ترقی پسندی پر ترجیح دیتے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو ترقی پسندی ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ باقی ساری چیزوں کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔

جب سے ترقی پسند تحریک کی پچاس سالہ برسی یعنی جوبلی منائی گئی ہے تب سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ادیب کو لکھنے پڑھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اُس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے ترقی پسند ہونے کا اعلان کر دے۔

مجروح صاحب نے ایک بات بڑی عجیب کہی ہے کہ بڑے شاعر میر و غالب تھے یا پھر جوش اور اقبال ہیں۔ باقی تمام شاعروں کی اہمیت اتنی ہے کہ وہ بڑے شاعروں کے لیے میٹیریل جمع کرتے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں فیض، مجاز، سردار جعفری اور مخدوم وغیرہ کے نام لے کر اُنھوں نے کہا کہ یہ سب شاعر قد نہیں نکال سکے۔ اِن کوتاہ قد شاعروں میں مجروح صاحب نے اپنے آپ کو بھی شامل کر لیا ہے اور فرمایا ہے: "ہو سکتا ہے کہ ہمارا میٹیریل لے کر آیندہ کوئی بڑا شاعر پیدا ہو"۔ قطع نظر اِس سے کہ جس میٹیریل کی وجہ سے آپ خود بڑے شاعر نہیں بن سکے، اُسے لے کر کوئی دوسرا کیسے بڑا شاعر بن سکتا ہے، ہمیں تو اِس پر حیرت ہے کہ مجروح صاحب جیسا مقبول اور ہر دل عزیز شاعر اپنے آپ کو بڑے شاعروں میں شمار نہیں کرتا جب کہ آج کل تو یہ حالت ہے کہ وہ نومولود شعرا جن کی شاعری اسقاطِ سخن قسم کی کوئی چیز ہے، وہ بھی اپنے آپ کو میر کے برابر سمجھتے ہیں۔

نثری نظم کے بارے میں مجروح صاحب نے بڑی سنسنی خیز گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں: "نثری شاعری آج کل جس چیز کا نام ہے وہ صرف شاعر نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنی ہوس مٹانے کا نام ہے کہ مجھے بھی شاعر کہا جائے.... یہ شکست خوردگی کی ایک علامت ہے کہ آپ شاعر تو ہیں نہیں مگر زبردستی شاعر بننا چاہتے ہیں۔ یہ نثری شاعری کیا ہوتی ہے؟ یا شاعری ہوگی یا نثر ہوگی"۔

ہمارے نزدیک اِس میں کوئی برائی نہیں ہے کہ کوئی شخص شاعر نہ ہو اور شاعروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھنا پسند کرے۔ بُری بات تو یہ ہے کہ شاعروں کی فہرست میں جن لوگوں کے نام شامل ہیں، اُن میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کی وجہ سے شاعری بدنام ہوتی ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی کا قول ہے کہ بُرے شعر کہنے سے بہتر ہے کہ آدمی نثری نظم لکھے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کوئی شریفانہ زندگی بسر نہ کر سکے تو اُسے خودکشی کر لینی چاہیے۔

مجروح صاحب سے پوچھا گیا کہ اُن شاعروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو مشاعرے میں کلام سناتے وقت یہ کہتے ہیں کہ اپنا یہ شعر مجھے خود بھی بہت پسند ہے۔ مجروح صاحب نے فرمایا: "جو شعرا ایسا کہتے ہیں وہ نہایت احمق ہوتے ہیں"۔ اِس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ اگر کسی

شاعر کو اپنا کوئی شعر پسند ہے تو مشاعرے میں اُس کا اعلان کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اِس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس شعر کو کم از کم ایک شخص نے پسند کیا ہے۔ اگر مشہور شاعر بشیر بدر کی نظر سے ہمارا یہ کالم گزرے تو اُن سے گزارش ہے کہ وہ مجروح صاحب کی بات کا بُرا نہ مانیں۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ کیا جانیں کہ مشاعرے میں شاعر وہی شعر سناتا ہے جو اُسے پسند ہوں۔ ناپسندیدہ شعر تو دیوان کی صورت میں چھپوا دیے جاتے ہیں، مشاعرے میں نہیں سنائے جاتے۔

مجروح صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اچھا شاعر بننے کے لیے اچھا انسان بننا ضروری ہے۔ چونکہ موصوف حُسنِ اتفاق سے اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے انسان بھی، اِس لیے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونا آسان کام ہے۔ مجروح صاحب کی یہ بات اگر مان لی جائے تو اِس کا مطلب یہ ہو گا کہ جو اچھا انسان نہ ہو وہ اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ ہماری رائے میں یہ نہایت سفاکانہ نقطۂ نظر ہے کیوں کہ آج کل جو ننانوے فی صد شاعر اچھی شاعری نہیں کر رہے، اُن کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ اچھے انسان نہیں ہیں۔ ہم ذاتی طور پر ایسے بہت سے شاعروں کو جانتے ہیں جو نہایت اچھے انسان ہیں لیکن جب وہ شعر کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے گھاس کاٹ رہے ہوں۔ اِس بنا پر مجروح صاحب کا جملہ اِس طرح ہوتا تو بہتر تھا کہ جو اچھا انسان نہ ہو وہ اچھی طرح گھاس نہیں کاٹ سکتا۔

مجروح صاحب اردو شاعری کی صحت مند روایات کے امین اور زبان و بیان کے معاملے میں درجۂ استناد رکھتے ہیں۔ لیکن انٹرویو میں معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ انگریزی الفاظ وہ اِس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ اتنی کثرت سے انشاء اللہ خان انشا والے میر غفر غینی غین کا استعمال بھی نہیں کرتے تھے۔ مجروح صاحب کے چند جملے بطور نمونۂ کلام پیش کیے جاتے ہیں:

"فلموں کا معیار اتنا کمرشیلائزڈ ہو گیا ہے کہ انھوں نے ہیومن رسپونسبلنی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے..... پوئٹری اور میوزک کا فرق ہمیشہ رہا ہے..... ہمارا ملک چونکہ بڑا ملک ہے۔ مختلف سبجکٹ ہیں، اِس وجہ سے ورائٹی ہمارے ہاں زیادہ ہے... میں چاہتا ہوں کہ اُن کے اندر سیلف رسپکٹ پیدا ہو۔ کوالٹی اور کوانٹنی دونوں ہوں"۔

اتنی زیادہ انگریزی جنابِ مجروح کی زبان سے اچھی نہیں لگتی۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں جدید یے مجروح صاحب کی پیروی میں انھیں WOUNDED سلطان پوری نہ کہنے لگیں۔

(۱۲/ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

ادبی غنڈہ ٹیکس

(۱)

اتنی تیزی سے تو کسی کو رسوائی بھی نہیں ملتی جتنی تیزی سے منظر علی خان منظر کو شہرت ملی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام "کربِ آگہی" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں "آگہی" تو آٹے میں نمک کے برابر تھی، اور باقی کرب ہی کرب تھا، اور وہ بھی مصنف کا نہیں پڑھنے والوں کا ـــ اور اب مصنف کی تیسری تصنیف "مکرر کہے بغیر" شائع ہوئی ہے۔ جس پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تین سال کے مختصر عرصے میں تین کتابوں کا مصنف بن جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ملک میں کاغذ کی قلت کی جو شکایت پائی جاتی ہے وہ بلا سبب نہیں۔ اگر منظر صاحب اسی رفتار سے کتابیں چھاپتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ دوبارہ کاغذ کی جگہ بھوج پتر کے استعمال کا رواج ہو جائے۔

منظر صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ ان کی نادر الکلامی کا جو قادر الکلامی کی ضد ہے، جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ انھوں نے غزلیں کہی ہیں، مزاحیہ نظمیں لکھی ہیں اور سہرے بھی تصنیف کیے ہیں۔ یہ ان کی نادر الکلامی ہی کا نتیجہ ہے کہ غزلوں، مزاحیہ نظموں اور سہروں میں تفریق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قاری اگر محتاط نہ ہو تو وہ مزاحیہ نظم کو سہرا سمجھ سکتا ہے اور سہرے کو غزل۔ ویسے اس میں کوئی کلام نہیں کہ منظر صاحب کے کلام میں شادمانی اور شادکامی کا عنصر اتنا غالب ہے ان کی ہر غزل پر یہ گمان گزرتا ہے جیسے انھوں نے اپنے غزل والے فرضی محبوب کا سہرا لکھا ہو۔ سہرے تو غالب اور ذوق نے بھی لکھے تھے لیکن غزل کو سہرا بنا دینا کسی روایتی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام منظر صاحب ہی کے بس کا تھا، اور انھوں نے اسے نہایت عمدگی سے انجام دیا ہے۔ اس محنتِ شاقہ کے نتیجے میں منظر صاحب کی جو حالت ہوئی، اس کی عکاسی انھوں نے اس شعر میں کی ہے :

اب نہ وہ رنگ نہ وہ روپ نہ وہ نقش و نگار
سنگِ آثارِ قدیمہ ہوں، مکاں تھا پہلے

منظر صاحب شاعری میں ہوں تو ہوں، نثر میں ہرگز سنگِ آثارِ قدیمہ نہیں ہیں۔ جس نے بھی ان کے نثری مضامین کا پہلا مجموعہ "بدلتے چہرے" پڑھا ہے، وہ ہماری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ نثر وہ بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ جو لوگ مذکورہ کتاب کا مطالعہ کر چکے ہیں ان سے ہم عرض کریں گے کہ اگر وہ اب بھی کچھ پڑھنے کے قابل رہ گئے ہیں تو انھیں منظر صاحب کا نیا مجموعۂ نثر "مکرر کہے بغیر" ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ اتنا دلچسپ ہے کہ اگر شروع کر دیا جائے تو قاری اسے ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ دورانِ مطالعہ قاری خود ہی ختم ہو جائے۔ آخر سردار جی کا گھوڑا بھی ختم ہو گیا تھا۔ انسان گھوڑے سے زیادہ طاقت ور نہیں ہے جو اُس کے ختم ہونے پر تعجب کیا جائے۔

"مکرر کہے بغیر" مضامین اور شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں خود مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ انشائیے نہیں ہیں۔ اگر اس دعوے کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوچنا پڑے گا کہ آخر یہ مضامین ہیں کیا۔ (قاری اور مصنف میں سے کسی ایک کو تو سوچنا ہی چاہیے!) اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ہم نے مضامین پڑھے، لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ کیوں کہ یہ مضامین کسی سانحے یا واقعے کا سبب تو بن سکتے ہیں، نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ بہر حال اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ منظر صاحب نے شاعری چھوڑ کر نثر کی طرف جو توجہ کی ہے، اس سے شاعری اور نثر دونوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ شاعری کو یوں کہ اسے خراب کرنے والوں کی تعداد میں ایک کی کمی ہو گئی اور نثر کو یوں کہ اسے پامال کرنے والوں میں ایک کا اضافہ ہو گیا۔

ہمارا ارادہ تھا کہ اس جگہ منظر صاحب کی خوب صورت نثر کا ایک آدھ نمونہ بھی پیش کر دیا جائے تا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم کتاب کی بلا سبب تعریف کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں یہ امر مانع ہے کہ اگر تلاشِ بسیار اور زحمتِ کثیر کے بعد ایک آدھ نمونہ دستیاب ہوا اور ہم نے اسے یہاں نقل کر دیا تو کتاب میں پڑھنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔ جو لوگ منظر صاحب کی نثر سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں، وہ براہِ راست کتاب کا مطالعہ کریں تو بہتر ہو گا۔

اس کتاب پر ڈاکٹر وزیر آغا نے نہایت عالمانہ دیباچہ لکھا ہے جس کی وجہ سے کتاب میں علم کی جو کمی رہ گئی تھی، اس کی تلافی بڑی عمدگی سے ہو جاتی ہے۔ مختار زمن صاحب نے بھی اپنے مخصوص

شگفتہ انداز میں پیش لفظ لکھا ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ اسے اردو کی کسی بھی کتاب کے ساتھ بطور پیش لفظ شائع کیا جا سکتا ہے۔ فلیپ پر موجودہ عہد کے تین بڑے مزاح نگاروں شفیق الرحمٰن، سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کی تحریریں ہیں۔ تینوں نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ مصنف کی تعریف کی ہے۔ اتنی فراخ دلی کا تو سودا نے اپنی ہجویات میں بھی مظاہرہ نہیں کیا۔

منظر صاحب کو ہم دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کے تین بڑے ادیبوں سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ اس خراجِ تحسین وصول کرنے پر ہمیں ایک دوست یاد آ گئے جنھوں نے اپنے بارے میں پچاس سے زائد ادیبوں سے تعریفی و توصیفی کلمات لکھوائے اور اس سلسلے میں ہر حربہ استعمال کر ڈالا۔ ان کی اس روش پر ہم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا: "ادیبوں سے اپنے بارے میں رائے لکھوا لیتا ہوں تو کیا بُرا کرتا ہوں۔ آخر اس ملک میں غنڈہ ٹیکس بھی تو وصول کیا جاتا ہے"۔

(۳۰ر نومبر ۱۹۸۴ء)

(۲)

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ جناب منظر علی خان منظر کی پانچویں تصنیفِ لطیف بھی شائع ہو گئی۔ یہ جملہ لکھنے کے بعد ایک اور اندیشہ پیدا ہوا ہے کہ کہیں کاتب صاحب لفظ "لطیف" کو "لطیفہ" نہ لکھ دیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہم کاتب صاحب سے جواب طلبی نہ کر سکیں گے۔ آج تک کسی نے سہوِ قلم کے نتیجے میں وجود میں آنے والی کتابوں پر مصنفین سے جواب طلبی نہیں کی تو یک لفظی سہوِ قلم پر کاتب کو شرمندہ کیوں کیا جائے۔ شرمندہ ہونے کے لیے ہم کافی ہیں کہ ہر طرح کی کتابیں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ منظر صاحب کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی اور اُس پر ہم نے کالم لکھا تھا۔ یہ شاعری کی کتاب تھی، اس لیے منظر صاحب نے دل کا غبار کتاب میں اور ہم نے کالم میں نکالا تھا۔ منظر صاحب کی شاعری اسی گرد و غبار میں دب کر رہ گئی۔ لیکن جب اُن کی دوسری کتاب چھپی تو محسوس ہوا کہ واقعی انھوں نے نثر لکھنے کا نیا انداز نکالا ہے جو براہ راست دل پر اثر کرتا ہے۔ جن

لوگوں کا دل کمزور ہے وہ اس نثر کی خوبیوں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس میں منظر صاحب کا کوئی قصور نہیں، یہ کمزور دل لوگوں کی اپنی کوتاہی ہے۔

منظر صاحب کا کمال صرف یہی نہیں کہ وہ خود لکھتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں دوسروں کو لکھنے پر اکساتے ہیں۔ پہلے درخواست کرتے ہیں، پھر تقاضے کرتے ہیں اور آخر میں دھمکیاں بھی دے دیتے ہیں۔ اس موثر کارروائی کی وجہ سے منظر صاحب کی ذات ادبی جمود کو ختم کرنے کا ایک مستقل ذریعہ بن گئی ہے۔

منظر صاحب کی جب کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس پر کم از کم ایک درجن افراد کی قیمتی آرا درج ہوتی ہیں۔ قیمتی اس لیے کہ منظر صاحب آرا لکھوانے لیے اپنی کار کا پٹرول اور رائے لکھنے والے کا سیروں خون جلاتے ہیں۔ اور اُس کتاب کے ساتھ جو بروشیر چھپتا ہے، چار پانچ درجن اہل الرائے اس میں بھی نظر آتے ہیں۔ منظر صاحب کی وسیع القلبی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ جن لوگوں کو قانون کی رُو سے ووٹ دینے کا حق نہیں، انھیں بھی وہ رائے دینے کے لائق سمجھتے ہیں۔ اب تک ایک سو سے زائد افراد منظر صاحب کی کتابوں کے بارے میں لکھ چکے ہیں اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں پہلی اور آخری بار منظر صاحب ہی کی فرمایش پر کچھ لکھنے کا موقع ملا۔ ان سب لکھنے والوں نے اچھی اچھی رایوں کا اظہار کیا ہے اور اس بات سے بے پروا ہو کر کہ خود ان کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے تبدیل ہو سکتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اکادمی ادبیات اور رائٹرز گلڈ کی طرح ایک "انجمنِ دیباچہ نگاران منظر علی خان" قائم کی جائے تاکہ اجتماعی کوششوں سے دیباچہ نگاری کے فن کو فروغ دیا جا سکے۔ نیز دیباچہ نگاروں کی عزت و ناموس کا تحفظ کیا جا سکے تاکہ ان کی طرف کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ یہ تجویز نہایت معقول ہے، البتہ ہم مجوزہ انجمن کے دائرۂ عمل کو وسیع کرنے کی سفارش کریں گے کہ اس میں کالم نگاروں کو بھی شامل کر لیا جائے تاکہ منظر صاحب کے حوالے سے کالم نگاری کو بھی فروغ ہو۔

منظر صاحب کی تازہ کتاب "چھپائے نہ بنے" ہے جس پر اظہارِ خیال کے لیے ہم نے اتنی لمبی تمہید لکھی ہے۔ اس کتاب میں انشائیے، شخصی خاکے اور کتابی تبصرے شامل ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ انشائیہ کون سا ہے اور شخصی خاکہ کون سا، البتہ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ منظر صاحب کی تحریروں کا یہ مجموعہ شگفتگی اور شگفتہ بیانی کا خوب صورت مرقع ہے۔ اس کے ہر صفحے پر

دو چار جملے ایسے ضرور مل جاتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ اس کتاب میں کوئی صفحہ خالی نہیں، ورنہ خوشی کا پیمانہ چھلک جاتا۔

منظر صاحب کیسی عمدہ نثر لکھتے ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے کیجیے:

"ہم اہلِ بہار عموماً گھاس کو گھانس کہتے ہیں اور اسے گھوڑے یا گدھے کے آگے ڈالتے وقت بھی نون نکالنے کا تردد نہیں کرتے۔ تاویل اس کی یہ دیتے ہیں نون غنہ ہی تو ہے، اگر لگا رہ گیا تو بے زبانوں کو اسی طرح مزہ دے گا جس طرح اہل حیدر آباد کو چاول کے ساتھ دیتا ہے"۔

یہ اقتباس ہم نے سحر انصاری کے دیباچے سے "نقل را عقل باید" کے اصول سے انحراف کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ اگر یہ اصل کتاب میں موجود نہ ہو تو قصوروار سحر انصاری ہوں گے نہ کہ ہم۔ یہ بات ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ بعض دیباچہ نگار اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کتاب پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے، حوالے کے طور پر دیے جانے والے اقتباسات بھی خود ہی تصنیف کر ڈالتے ہیں۔ ممکن ہے بعض بدخواہ اس بیان سے یہ نتیجہ نکالیں کہ ہم بھی کتاب پڑھے بغیر یہ کالم لکھ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمیں کتاب پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں، اس کا ہر مضمون فرداً فرداً ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ یوں کہ منظر صاحب جب کوئی مضمون لکھتے ہیں، اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہمیں بھجوا دیتے ہیں۔ ہم اسے نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اس کی دوسری جانب کے سادہ حصے کو کام میں بھی لاتے ہیں۔ ہم نے اپنے کئی کالم منظر صاحب کے مضامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپیوں پر ہی لکھے ہیں۔ یہ کاغذ اتنا عمدہ اور چکنا ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے، فوٹو اسٹیٹ دونوں طرف سے سادہ ہو تاکہ ہم اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

سحر انصاری کا دیباچہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس سے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ شگفتہ مزاجی میں منظر صاحب سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔ اب تک ان کے سنجیدہ تنقیدی مضامین اور آتشِ فراق میں جھلسی ہوئی غم زدہ شاعری ہماری نظر سے گزری تھی جس کی بنا پر ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ فانی بدایونی کی طرح ہنسنے ہنسانے کے خلاف ہیں۔ لیکن یہ دیباچہ پڑھ کر ہم نے اپنی رائے تبدیل کر لی۔ حالانکہ رائے تبدیل کرنے کے لیے کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر سحر صاحب، منظر علی خان کی ہر کتاب پر ایسا ہی دلچسپ دیباچہ لکھ دیا کریں۔ دیباچے کی وجہ سے کتاب میں اور کتاب کی وجہ سے دیباچے میں جان پڑ جائے گی۔

فلیپ لکھنے والوں میں مشہور شاعر سلطان رشک بھی شامل ہیں۔ وہ جیسی غزلیں لکھتے ہیں، ویسا ہی فلیپ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "منظر علی خاں عنوانات کے انتخاب، الفاظ کے چناؤ اور جزئیات نگاری میں بے حد منفرد اور محتاط ہیں۔ اچھی غزل کے مطلع کی طرح ان کا سرنامہ یا عنوان نہایت پُر معنی اور ظرافت کا لحاف اوڑھے ہوئے ہوتا ہے"۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ الفاظ کے چناؤ میں منظر صاحب محتاط ہیں، لیکن خود جناب رشک نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ابھی تو سردی پوری طرح شروع بھی نہیں ہوئی کہ انھوں نے منظر صاحب کو لحاف اوڑھا دیا ہے۔ لحاف نہ ہوا، انشائیہ ہو گیا کہ جب چاہا اور جیسے چاہا اوڑھ لیا۔

(۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

ادب کا جعلی شناختی کارڈ

سلطان جمیل نسیم مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شہرت' ان کی افسانہ نگاری کی وجہ سے اتنی نہیں ہوئی جتنی ہماری کالم نگاری سے۔ ہم نے اپنے کالموں میں موقع بے موقع ان کا اس کثرت سے ذکر کیا ہے کہ بعض قارئین نے ہمیں یہ طعنہ دیا ہے کہ ہم ان کے پبلسٹی ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ طعنہ ہمیں استاد لاغر مراد آبادی کے سلسلے میں بھی اکثر سننا پڑتا ہے لیکن ہم ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے کیوں کہ ان دونوں حضرات سے ہمارے مخلصانہ تعلقات ہیں۔ ان تعلقات کا ہمیں نہیں تو کم از کم ان دونوں کو تو کوئی فائدہ پہنچنا چاہیے۔

ادھر کچھ عرصے سے ہم نے سلطان جمیل کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ لندن تشریف لے گئے تھے۔ اس سفر کا مقصد افتخار عارف کے اردو مرکز میں اپنے خرچ اور اپنی ہی ذمہ داری پر اپنے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کرانا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موصوف نے اپنے افسانوی مجموعے "کھویا ہوا آدمی" پر ہم سے بصد اصرار دیباچہ لکھوایا تھا۔ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو اس میں ہمارا دیباچہ موجود نہیں تھا' اس کی جگہ مشفق خواجہ کا لکھا ہوا دیباچہ شامل تھا۔ یہ مانا کہ دیباچہ نگار نے کتاب اور اس کے مصنف کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن کسی افسانوی مجموعے پر مشفق خواجہ سے دیباچہ لکھوانا ایسا ہی ہے جیسے سعادت یار خاں رنگین کے دیوانِ ریختی پر نظیر صدیقی سے دیباچہ لکھوایا جائے۔ ظاہر ہے افسانے پر مشفق خواجہ اور ریختی پر نظیر صدیقی لکھیں گے تو اپنے ساتھ اپنے موضوعات کو بھی لے ڈوبیں گے۔

بہرحال ہمیں افسوس ہے کہ مشفق خواجہ کے دیباچے کی وجہ سے کتاب اور کتاب کی وجہ سے دیباچہ ضائع ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ہمیں اس بات کا ہے کہ سلطان جمیل نے اصرار

کرکے ہم سے جو دیباچہ لکھوایا تھا' اسے کتاب میں شامل نہیں کیا۔ ہم نے اس دیباچے پر خاصی محنت کی تھی۔ اگر موصوف خود اتنی محنت کرتے تو اُن کو اپنی کتاب پر کسی سے دیباچہ لکھوانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

ہم نے جب سلطان جمیل سے پوچھا کہ انھوں نے ہمارا دیباچہ اپنی کتاب میں شامل کیوں نہیں کیا تو انھوں نے بتایا کہ دیباچے کا مسودہ کاتب سے گم ہو گیا تھا۔ ہم نے عرض کیا' کاتب سخن فہم نہیں تھا ورنہ وہ کتاب کا مسودہ بھی گم کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے سلطان جمیل سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہمارا مسودہ واپس نہیں ملے گا' ہم اپنے کالم میں آپ کا ذکر نہیں کریں گے۔ یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف ہمارا مسودہ واپس کر دیا بلکہ یہ اجازت بھی دے دی کہ ہم اس دیباچے کو جہاں چاہیں چھپوالیں۔ بھلا اس تحریر کو کوئی اور کیوں چھاپے گا' لہٰذا ہم خود ہی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ پورا دیباچہ تو نقل کرنا مشکل ہے' کچھ اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

سلطان جمیل نسیم سے ہمارے مراسم بہت پرانے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اس زمانے سے جانتے ہیں جب ہم دونوں لڑکپن کی حدود میں تھے۔ ہم تو سن و سال کی منزلیں طے کرکے "بزرگی بہ سال" کے مرحلے تک آن پہنچے مگر وہ اب بھی دیکھنے میں لڑکے ہی نظر آتے ہیں' اور لڑکے بھی ایسے' جیسے ابھی ابھی میر تقی میر کی کلیات سے برآمد ہوئے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سلسلۂ روز و شب ان پر بالکل اثر انداز نہیں ہوا۔ ان کا بیٹا پاس بیٹھا ہو تو چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے اور چھوٹا بھائی پاس کھڑا ہو تو اس پر چچا کا گمان گزرتا ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی خاصے مشہور ہیں۔ نام تاجدار عادل ہے اور پیشے کے اعتبار سے ٹی وی پروڈیوسر ہیں۔ سلطان جمیل کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ٹی وی پروڈیوسر کے بڑے بھائی ہیں۔ دوسری اور بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر حضرتِ صبا اکبر آبادی کے بیٹے ہیں۔ تیسری شناخت یہ ہے کہ وہ حضرتِ رعنا اکبر آبادی کے نواسے ہیں۔ چوتھی شناخت یہ ہے کہ مشہور موسیقار سہیل رعنا کے بھانجے ہیں۔ اس شناخت پریڈ کے بعد ضرورت نہیں رہتی کہ سلطان جمیل کی کوئی اور شناخت بھی ہو۔ تاہم افسانہ نگاری کو وہ اپنے شناختی کارڈ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ حکومت نے جعلی

شناختی کارڈ رکھنے پر پابندی لگا رکھی ہے لیکن ادبی دنیا میں اس قسم کی پابندیوں کی پروا نہیں کی جاتی۔

قارئین نے اندازہ کرلیا ہو گا کہ سلطان جمیل کا تعلق ایک موقر ادبی گھرانے سے ہے جس کا ہر دوسرا شخص شاعر ہوتا ہے اور جو پہلا شخص شاعر نہیں ہوتا وہ بھی آخر آخر میں نثری نظم ضرور لکھنے لگتا ہے۔ کچھ نام تو ہم نے اوپر درج کر دیے ہیں' ان کے علاوہ بھی سلطان جمیل کے خاندان میں بے شمار شاعر گزرے ہیں جن کے نام گنوانے کا یہ موقع نہیں کیونکہ آج کل کے اخلاف کو اسلاف کے نام گنوانے سے زیادہ گنوانے سے دلچسپی ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سلطان جمیل کو کچھ اور ملا ہو یا نہ ملا ہو' ورثے میں ادبی ذوق ضرور ملا ہے۔ ان کی پرورش خالص ادبی ماحول میں ہوئی ہے۔ انھوں نے آنکھیں کھولنے کے بعد سوائے شاعری کے کچھ نہیں دیکھا اور آنکھیں ابھی پوری طرح کھلی بھی نہیں تھیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو ادب کی راہ پر ڈال دیا۔ شاعری اس لیے نہ کی کہ یہ راہ پامال ہو چکی تھی۔ افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی کہ اسے وہ خود پامال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

سلطان جمیل سے ہمارے جو بے تکلفانہ تعلقات ہیں' ان کی گہرائی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہم نے آج تک ان کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا۔ لیکن کچھ عرصے سے سلطان جمیل کے جی میں خدا جانے کیا آئی ہے کہ انھوں نے ہمیں اپنے افسانے پڑھوانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ ہم نے کئی بار انھیں سمجھایا کہ مخلصانہ تعلقات کو اغراض سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی اور انھوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر ہم نے ان کے افسانے نہ پڑھے تو وہ مراسم قطع کرلیں گے۔ ہم نے عرض کیا' افسانے نہ پڑھنے کی بنا پر جو فیصلہ آپ کریں گے' اگر افسانے پڑھنے کے بعد وہی فیصلہ ہم نے کرلیا تو؟

سلطان جمیل کی ادبی سرگرمیاں صرف افسانے لکھنے تک محدود نہیں ہیں' وہ عملی آدمی بھی ہیں۔ ان کا گھر کیا ہے اچھا خاصا حلقۂ اربابِ ذوق ہے۔ مہینے میں ایک دوبار ادیبوں کی محفل گرم ہوتی ہے۔ یہ ادیب ادبی مسائل پر غور کرتے ہیں جس کے نتیجے میں سلطان جمیل کے ذاتی مسائل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ یوں کہ سلطان جمیل کی تنخواہ کا بڑا حصہ انھیں ادبی محفلوں کے انعقاد پر خرچ ہوتا ہے۔ ان محفلوں میں صرف زبانی جمع خرچ نہیں ہوتا لذتِ کام و دہن کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض ادیبوں نے اس لذت کی خاطر سلطان جمیل کو ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کر رکھا

ہے۔

سلطان جمیل روایتی شاعروں کی طرح ادب ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے' وہ کچھ شریفانہ مشاغل بھی رکھتے ہیں۔ وہ ایک بنک میں افسر ہیں۔ بحیثیت ایک بینکار کے ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے لیکن ہمارا ذاتی تجربہ کچھ خوشگوار نہیں ہے۔ ہم نے جب بھی قرض مانگا' انھوں نے صاف انکار کردیا۔ کالموں کا انتخاب چھاپنے کا ارادہ تھا' اس کے لیے قرض مانگا تو کہا ہم بنک والے صرف منافع بخش کاروبار کے لیے قرض دیتے ہیں اور وہ بھی مناسب ضمانت کے ساتھ۔ افسوس کہ بنک والوں نے نفع و نقصان کا جو معیار بنایا ہے' وہ ادبی معیاروں سے بالکل مختلف ہے۔

سلطان جمیل اپنے پیشے کے ساتھ اتنے مخلص ہیں کہ صبح سے شام تک دل لگا کر محنت کرتے ہیں۔ وہ اتنے ذمہ دار ہیں کہ دفتری اوقات میں دوستوں سے فون پر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اگر اتنی ہی ذمہ داری کا ثبوت وہ اپنے فرصت کے اوقات میں بھی دیتے تو افسانہ نگاری سے بہتر مشغلہ تلاش کرسکتے تھے۔ بہرحال اب جب کہ وہ افسانہ نگار بن ہی گئے ہیں تو ہمیں ان کی کامیابی کی دعا کرنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ دعا کرتے وقت عموماً استحقاق کا نہیں مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔

(۲۵/ فروری ۱۹۸۸ء)

شاعری اور عزّتِ سادات

تیسری دنیا کے بعض ممالک میں اتنی آسانی سے تو مارشل لا بھی نہیں لگتا جتنی آسانی سے ہمارے ملک میں ہر تیسرا آدمی صاحبِ دیوان بن جاتا ہے۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اچھے خاصے معقول لوگ بھی شاعری کرنے اور دیوان چھپوانے کی فکر میں ہیں۔ شاعری کوئی زیادہ بری چیز نہیں لیکن "جس کا کام اسی کو ساجھے" والا اصول پیش نظر رہنا چاہیے۔ اگر قتیل شفائی اور محسن بھوپالی جیسے لوگ شعر کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات فطری شاعر ہیں یعنی شعر کہنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے، لیکن جو لوگ اچھے خاصے معقول کام کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں، انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ معقول کاموں کو چھوڑ کر شاعری کریں۔ جب شاعری غالب جیسے بڑے شاعر کے لیے ذریعۂ عزت نہیں تھی تو کسی اور کے لیے کیسے ہو سکتی ہے؟

یہ تمہید ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ اس وقت سید یوسف بخاری دہلوی کا مجموعۂ کلام "دامنِ یوسف" ہمارے سامنے ہے۔ اس دامن کو دوستانہ کھینچنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ بخاری صاحب کا تعارف کرا دیا جائے۔ موصوف نصف صدی سے ادبی دنیا میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کی پہلی کتاب آج سے پورے پچاس برس پہلے دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں "یہ دلّی ہے" کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ دلّی کی قدیم تہذیب اور معاشرت کے بارے میں یہ بے مثال کتاب ہے۔

جامع مسجد دہلی کی امامت بخاری صاحب کے خاندان میں چلی آتی ہے۔ موجودہ امام صاحب ان کے بہت قریبی عزیز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں جامع مسجد کے امام تو بہت ہوئے لیکن جامع مسجد کی سیڑھیوں کی امامت ایک ہی شخص کے حصے میں آئی ہے اور وہ ہیں جناب یوسف بخاری۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جو زبان بولی جاتی تھی، وہ اب صرف یوسف بخاری بولتے ہیں۔ وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" والی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال ان کے لکھنے کا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں صاحب طرز ادیب ہیں۔ جنھیں اس اجمال کی تفصیل دیکھنی ہو، وہ علی گڑھ والے پروفیسر اختر انصاری کی کتاب "دلّی کا روڑا" دیکھ لیں۔ پروفیسر صاحب نے یہ کتاب یوسف بخاری کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے بخاری صاحب کے اسلوب بیان کی خصوصیات پر دریا دلی سے اظہار خیال کیا ہے اور اُن کی نثر کے بہت سے خوب صورت اقتباسات پیش کیے ہیں۔

بابائے اردو نے یوسف بخاری کو دلّی کا روڑا کہا تھا۔ اس سے پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے میر امن کو یہ طویل ترین تخلص عطا کیا تھا، اور کہا تھا: "دلّی کے روڑے ہیں، محاورے کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں"۔ بخاری صاحب نے محاورے کے ہاتھ پاؤں نہیں توڑے کہ یہ کام نثری نظم والے بہتر طور پر انجام دے رہے ہیں۔ البتہ انھوں نے پچاس برس تک نثر لکھنے کے بعد اچانک شاعری شروع کر کے شاعری کے ہاتھ پاؤں باندھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دامن یوسف میں شاعری اس طرح نظر آتی ہے جیسے صاف ستھرے دامن پر کوئی دھبّا۔

بخاری صاحب نے کتاب کے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ: "شاعری میرا میدان نہیں، میری اصل جولاں گاہ نثر ہے"۔ دیوان مرتّب کرنا اور پھر چھپوا دینا اس دعوے کی دلیل ہے۔ اگر بخاری صاحب اپنا دیوان طبع نہ کراتے تو اُن کا دعویٰ بے دلیل ہوتا۔

بخاری صاحب نے ستّر برس کی عمر میں اٹھارہ برس کی عمر والی جو غزلیں لکھی ہیں، ان کے کچھ اشعار آپ بھی سُنیے:

دیکھنا ان کا نگاہ ناز سے
میرے دل پر اک قیامت ڈھا گیا
خواب میں وہ دل ربا کیوں کر ملا
اے تصور وہ بھی کچھ شرما گیا

رات کو خواب میں وہ بے خوابی
واہمہ تھا، خیال تھا، کیا تھا!

نظموں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یعنی اس دیوان میں بعض ایسے موضوعات پر بھی نظمیں ملتی ہیں کہ بخاری صاحب سے پہلے شاید ہی کسی نے ان موضوعات پر طبع آزمائی کی ہو۔ مثلاً اپنا مکان کرائے پر دیا تو اُس پر نظم لکھ ڈالی۔ کسی نے شیروانی کا تحفہ دیا تو اُس کا منظوم شکریہ ادا کر دیا۔ ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو اُس کا دستاویزی ثبوت نظم کی صورت میں پیش کر دیا۔ کوئی عزیز سفر پر روانہ ہوا تو زادِ راہ کے طور پر ایک الوداعی نظم اس کے حوالے کر دی۔ کچھ نظمیں عید بقر عید کے بارے میں ہیں۔ کچھ تاریخی عمارات پر لکھی ہیں۔ مثلاً جامع مسجد دہلی اور قطب مینار وغیرہ پر۔ قطب مینار والی نظم ہمیں بہت اچھی لگی کیونکہ اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ مینار ہمالیہ کی چوٹی سے بھی اونچا ہے۔ ہم نے ہمالیہ کی چوٹی دیکھی ہے نہ قطب مینار۔ بخاری صاحب نے ان دونوں کو بچشم خود دیکھ کر ہی نظم لکھی ہو گی۔ اس لیے انھوں نے جو کچھ کہا ہے' اس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس سے بخاری صاحب کے مشاہدے کی گہرائی بلکہ اونچائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح مولانا حالی نے اپنے دیوان کے ساتھ مقدمہ لکھا تھا اور وہ دیوان سے زیادہ مشہور ہوا تھا' اسی طرح بخاری صاحب نے بھی ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ بھی دیوان سے زیادہ مشہور ہو گا۔ یہ مقدمہ اتنا دلچسپ ہے کہ دیوان اس کا تابع مہمل نظر آتا ہے۔ اس میں ادب کے بعض بنیادی مسائل پر فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے :

"جدید رجحانات کے زیر اثر دواوین اور مجموعہ ہائے کلام کے ناموں کی روش بدل چکی ہے۔ پہلے شعرا کے مجموعوں کے نام یک تا سہ لفظی ہوا کرتے تھے لیکن اب پانچ پانچ الفاظ تک نوبت آگئی ہے۔ ان کی معنوی نوعیت بظاہر ایسی ہے کہ سرورق پر صرف نام پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاید افسانوں کا مجموعہ یا کوئی ناول وغیرہ ہے۔ مثلاً پیاس کا صحرا' رازوں سے بھرا بستہ' مرے دل مرے مسافر' خالی ہاتھوں میں ارض و سما"۔

بخاری صاحب نے جس مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے' وہ واقعی بہت اہم ہے۔ جدید شاعروں کو شاعری کرتے وقت نہ سہی' اپنے مجموعوں کے نام رکھتے وقت تو شاعرانہ ذوق کا ثبوت دینا چاہیے اور ایسے ناموں سے اجتناب کرنا چاہیے جو "بر عکس نہند نام زنگی کافور" کے زمرے میں آتے ہوں۔ مثلاً "پیاس کا صحرا" جغرافیے کی کتاب معلوم ہوتی ہے جس میں "پیاس" نامی صحرا کے بارے میں معلومات ہوں۔ "رازوں سے بھرا بستہ" جاسوسی ناول نظر آتا ہے۔ "مرے دل مرے مسافر"

امراض قلب کے بارے میں کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ "خالی ہاتھوں میں ارض و سما" شعبدے بازی سے متعلق کتاب کا نام ہو سکتا ہے۔

بخاری صاحب نے دوسرا اہم مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ آج کل جو شاعری ہو رہی ہے، وہ ہماری ادبی روایات کے منافی ہے۔ انھوں نے جدید شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :

چاندنی میں ڈھل رہا تھا بیڈ روم
نرم گدّوں پر اکیلا چاند تھا

گھر میں سب کے قفل پڑے تھے
باہر کیوں پھر گائے بندھی ہے

چھپکلی نے اپنے منھ میں داب رکھا ہے مجھے
اور میں کیڑے مکوڑوں کی طرح لاچار ہوں

بیٹ کر جاتی ہے چڑیا فرق پر
عظمت آدم کا آئینہ ہوں میں

کاش بخاری صاحب اس قسم کے مزے دار شعروں کا انتخاب ذرا وسیع پیمانے پر کرتے۔ شاید کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے خیال سے انھوں نے ہاتھ روک لیا۔ وہ اپنے شعر کم کر سکتے تھے، اور اسی نسبت سے انتخاب کے شعر بڑھا سکتے تھے۔ اس طرح کتاب کی ضخامت تو نہ بڑھتی، پڑھنے والوں کی دلچسپی کا سامان بڑھ جاتا۔

بخاری صاحب نے دیباچے میں اپنے بارے میں کم اور دوسروں کے بارے میں زیادہ باتیں کی ہیں۔ نام لے لے کر بعض ادیبوں کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ اور دلّی کی ٹکسالی اور کہیں کہیں کرخنداری زبان میں حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اپنے کالم کی محدود

گنجایش کے پیش نظر ہم تفصیل میں نہیں جاسکتے۔ تاہم بخاری صاحب کی حق گوئی و بے باکی کی ایک مثال پیش کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اپنے بارے میں انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ جب وہ دہلی میں تھے تو مشاعروں میں ترنم سے غزلیں سنایا کرتے تھے' اور یہ غزلیں وہ ارشاد احمد ارشاد نامی ایک شاعر سے لکھوایا کرتے تھے۔ بخاری صاحب نے "فرمودۂ ارشاد" غزلوں کے کچھ اشعار بھی درج کیے ہیں۔ یہ شعر اچھے خاصے ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنے اچھے شعر کہنے والے کو آج کوئی نہیں جانتا اور سید یوسف بخاری اس کالم کی اشاعت کے بعد صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہوں گے۔ اگر بخاری صاحب نے زیر نظر مجموعے میں شامل غزلیں بھی ارشاد احمد ارشاد سے لکھوائی ہوتیں تو یہ مجموعہ سال رواں کا بہترین شعری مجموعہ قرار پاتا۔

(۶/ اپریل ۱۹۸۴ء)

سرقہ نویسی

آغا اشرف اردو اور پنجابی کے ادیب ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ان کا تعارف خود انھیں کی زبان میں کرایا جائے: "میری ادبی زندگی کے سفر کی ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی اور اسی راہ میں پاکوبی کرتے ہوئے بہت دور نکل آیا ہوں۔ میں اس وقت دو ہزار سے زیادہ تصانیف کا مصنف ہوں۔ افسانے، ناول، ڈرامے اور رپورتاژ کے علاوہ میں نے ہر صنفِ ادب پر، سوائے شاعری کے، بھرپور لکھا ہے جس میں وہ کربِ تخلیق مضمر ہے جو علمی و ادبی رجحانات و محرکات کو جنم دیتا ہے۔ میری تحریریں میری زندگی کی لغزشوں، تلخیوں، ناکامیوں، مایوسیوں اور حادثوں سے عبارت ہیں اور یوں زندگی نے اب تک مجھے جو کچھ دیا ہے اپنی تحریروں سے اسے واپس لوٹا رہا ہوں"۔

یہ سطور آغا اشرف کی آپ بیتی "ایک دل ہزار داستان" کے آخری باب سے اخذ کی گئی ہیں اور یہی آپ بیتی ہمارا آج کا موضوع ہے۔ مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم آغا صاحب کی تصانیف کی تعداد پر حیرت کا اظہار کرلیں۔ دو ہزار سے زیادہ تصانیف پر حیرت ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے، افسوس کا نہیں۔ افسوس کا مقام تو تب ہوتا جب دو ہزار کی تعداد میں دو چار کی کمی رہ جاتی۔ غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے اپنی تصانیف کی تعداد ساڑھے نو سو بتائی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر رباعی کو ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے، اور یوں سیکڑوں رباعیاں، سیکڑوں تصانیف کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ آغا صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اپنی ہر کتاب کے ہر باب کو یا ہر مختصر مضمون یا افسانے کو نیز احباب کے نام لکھے گئے ہر خط کو ایک مستقل تصنیف سمجھا ہو اور اس طرح دو ہزار سے زیادہ تصانیف وجود میں آگئی ہوں۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان میں ایک ایسا مصنف بھی موجود ہے جس کا ذکر تاریخ ادب میں نہ

سی، گینز بک آف ریکارڈز میں تو آ ہی سکتا ہے۔

آغا اشرف کی آپ بیتی اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ آغا صاحب نے اپنی کم اور اپنے دل کی داستان زیادہ لکھی ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کتاب کا ہیرو اُن کا دل ہے، اور خود آغا صاحب اپنے دل کے تابعِ مہمل کی حیثیت سے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عشقیہ ناولوں سے زیادہ دلچسپ اور رومانی فلموں سے زیادہ سنسنی خیز اِس کتاب میں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی تمنا میں بعض نوجوان اپنی زندگی اور جس کی حسرت میں بعض بوڑھے اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں۔

آغا اشرف نے آپ بیتی میں اپنے والدِ محترم کی دل آویز شخصیت کے بارے میں ایک پورا باب لکھا ہے اور نہایت سعادت مندی کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ: "آغا (ارشد حسین) صاحب کی رنگین مزاجی نے بڑے گل کھلائے۔ کسی کو اپنے عشق میں تھئی تھئی نچایا اور کسی کے عشق میں خود تھئی تھئی ناچے۔ کہیں اوک سے پی اور کہیں پیمانے سے اور کہیں صراحی کو منھ لگا کر ڈیک لگا دی۔ لوگوں کا ایمان اور زندگی کا سامان لوٹنے والی کئی ایسی تھیں جو آغا صاحب پر لٹیں اور کئی ایسی تھیں جن پر آغا صاحب لٹو ہوئے۔ اندر سبھا کے راجہ اندر بنے۔ باپ کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگے۔ خوب گلچھرے اڑائے"۔ (ص ۴۵)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جناب مصنف جب اپنے والدِ محترم کے بارے میں اس حد تک سچ بول سکتے ہیں تو خود اپنے بارے میں انھوں نے کیا کچھ نہ لکھا ہو گا۔ اس مختصر کالم میں کتاب کے ہر صفحے پر پھیلی ہوئی "داستان" کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں تاہم آغا صاحب کے "بیانِ حلفی" کا ایک حصہ نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ فرماتے ہیں: "میرے رومانوں کا سلسلہ چلا تو اُس کی فہرست بہت دور تک چلی اور جن کے ساتھ رومان چلے دو چار نہ تھیں، دس بیس بھی نہ تھیں۔ چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط مرزا غالب کی رومانی زندگی کا حدود اربعہ ہے۔ میرے عشق کی اٹلس کئی براعظموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے نہ تو اُن بتوں کی نقاب کشائی اور چہرہ نمائی مجھ سے .... ممکن ہے اور نہ حسینوں کے انبار در انبار خطوط کو چھان پھٹک کر بیرنگ محبت ناموں کو الگ کرنا ہی میرے بس کا روگ ہے"۔

اس صورت حال کے باوجود مصنف کی ہمت اور محنت کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے اپنے

عشق کی بہت سی داستانوں سے کتاب کے صفحات رنگین کیے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اوسطاً فی صفحہ دو معاشقے بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف نے نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنا کچاچٹھا اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح کسی زمانے میں سردار دیوان سنگھ مفتون دوسروں کا کچا چٹھا پیش کیا کرتے تھے۔

کسی آپ بیتی کے مندرجات کی صحت یا عدم صحت کو جانچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس لیے مصنف کے بیانات ہی کو درست تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مصنف اپنے تجربات و مشاہدات بیان کرتا ہے اور یہ عموماً ان لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں جن کا انتقال ہوچکا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم خود نوشت نگار کے بیان کردہ واقعات کی تصدیق یا تردید مرحومین سے نہیں کراسکتے۔ لیکن زیر نظر کتاب پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا کم از کم ایک مرحوم شخصیت سے مصنف کے بعض بیانات کی تصدیق کرائی جاسکتی ہے۔

اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ آغا اشرف نے فرانس کی سیاحت سے متعلق جو کچھ لکھا ہے' وہی کچھ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" میں بھی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی یعنی آغا اشرف کی کتاب سے پورے بائیس سال پہلے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان ۱۹۲۶ء میں فرانس گئے تھے' انھوں نے اس ملک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' وہ سب کچھ آغا اشرف کی کتاب میں لفظ بلفظ موجود ہے۔ البتہ آغا صاحب نے کہیں کہیں کچھ الفاظ تبدیل کردیے ہیں تا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی عبارت کے "سقم" دور ہو جائیں۔

یہ تو ممکن نہیں کہ تقابلی مطالعے کے لیے ہم دونوں کتابوں کے پورے پورے باب نقل کر دیں' چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تا کہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ دو ادیبوں کا نہ صرف ذخیرۂ الفاظ یکساں ہو سکتا ہے بلکہ انھیں ایک ہی جیسے واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔

آغا اشرف نے تولون سے پیرس تک کے سفر کا حال ان الفاظ میں لکھا ہے: "ہم نے تولون سے پیرس جانے کے لیے واگون لی (خواب گاڑی) کا ٹکٹ لیا جو اُس زمانے میں یورپ کی بہترین اور سب سے زیادہ گراں ترین تھی' استنبول سے شمالی فرانس میں کیلے کی بندرگاہ تک جاتی تھی۔ واگون لی میں ہر مسافر کو ایک علاحدہ چھوٹا سا ڈبہ مل جاتا تھا جس پر بستر' پڑھنے لکھنے کے لیے میز کرسی اور ساتھ لگا ہوا غسل خانہ ہوتا تھا۔ سبک رفتاری میں یہ یورپ کی بہترین گاڑی مانی جاتی تھی۔ میز پر بیٹھ

کر اطمینان سے خط لکھا جا سکتا تھا۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ ریل گاڑی حرکت میں ہے۔ بعد میں انگلستان کی زیرِ زمین چلنے والی عمدہ قسم کی ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا لیکن واگون لی کی بات کہیں نہ ملی۔ غالباً اس کے ڈبوں کے نچلے حصوں میں جو کمانیاں اور پرزے لگائے جاتے تھے' وہ خاص طور پر تیار ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود حرکت کے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ یہ کمانیاں ایسی لچک دار بنائی جاتی تھیں کہ دھچکا بالکل نہ لگتا تھا"۔ (ص ۲۲-۳۲۱)

ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں: "تولون سے پیرس جانے کے لیے واگون لی (خواب گاڑی) کا ٹکٹ لیا تھا جو یورپ کی بہترین اور سب سے زیادہ گراں ٹرین ہے اور استنبول سے شمالی فرانس میں کیلے کی بندرگاہ تک جاتی تھی.... واگون لی میں ہر مسافر کو ایک علاحدہ چھوٹا سا ڈبہ مل جاتا ہے جس میں بستر' پڑھنے لکھنے کے لیے میز کرسی اور ساتھ لگا ہوا غسل خانہ ہوتا ہے.... تیزی اور سبک رفتاری میں یہ یوروپ کی بہترین ٹرین مانی جاتی ہے۔ میز پر بیٹھ کر اطمینان سے خط لکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ریل گاڑی جنبش میں ہے۔ بعد میں یوروپ کے مختلف ملکوں کی عمدہ قسم کی ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا لیکن واگون لی کی بات کہیں نہیں ملی۔ غالباً اس کے ڈبوں کے نچلے حصوں میں جو کمانیاں اور پرزے لگائے جاتے ہیں' وہ خاص طور پر تیار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود حرکت اور جنبش کے سکون کا احساس ہوتا ہے' اور یہ کمانیاں ایسی لچک دار بنائی جاتی ہیں کہ دھکا یا دھچکا نام کو نہیں لگتا"۔ (ص ۵-۲۰۴)

ان دونوں اقتباسات میں یہی فرق نہیں ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین کا بیان صیغۂ حال میں ہے اور آغا اشرف کا صیغۂ ماضی میں' بلکہ یہ اہم اختلاف بھی ہے کہ واگون لی میں سفر کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خان نے یورپ کے مختلف ملکوں کی عمدہ قسم کی ریل گاڑیوں میں بھی سفر کیا' لیکن افسوس کہ آغا اشرف کو صرف انگلستان کی زمین دوز ریل گاڑیوں میں بیٹھنے کا موقع ملا۔

سوربون میں آغا صاحب کی ملاقات متعدد حسیناؤں سے ہوئی۔ ان میں سے ایک جس کا نام ماتری تھا اور جو ایک کیبرے ڈانسر تھی' وہ آغا صاحب کو اپنے گھر لے گئی۔ آگے کا حال آغا صاحب کی زبان سے سُنیے: "ماتری سوربون کے علاقے کے جس مکان میں رہتی تھی' وہاں اس کے کمرے کی کھڑکی سے نوترے دام کا گرجا نظر آتا تھا جس سے فرانسیسی تاریخ کے ہر عہد کی یادیں وابستہ تھیں۔ جہاں یہ واقع تھا' وہیں رومن لوگوں نے لیو تیشیا کا شہر آباد کیا تھا جس کے آثار گرجا گھر کے

قریب موجود تھے۔ گرجا کے آس پاس کے علاقے کا نام مجھے ایل دے لاستے (شہر کا جزیرہ) بتایا گیا۔ اس لیے کہ دریائے سین کی ایک شاخ اس جگہ ایک جزیرہ سا بنا رہی تھی۔ یہ جزیرہ جو دو پلوں کے ذریعے شہر سے ملتا تھا' پیرس کا مرکز تھا۔ اسی طرح اس کا مرکز نوترے دام کا گرجا تھا جو نہ صرف پیرس بلکہ فرانس کا مرکز تھا۔ اس لیے کہ فرانس کے نقشوں میں ملک کے تمام فاصلے اسی مقام سے ناپے جاتے تھے"۔ (ص ۳۲۳)

جو کچھ آغا صاحب کو کیبرے ڈانسر ماتری کے مکان کی کھڑکی سے نظر آیا تھا' وہی کچھ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں: "میں جس مکان میں رہتا تھا وہاں میرے کمرے کی کھڑکی سے نوترے دام کا کلیسا نظر آتا تھا۔ اس کلیسا سے فرانسیسی تاریخ کے ہر عہد کی یادیں وابستہ ہیں۔ جس جگہ یہ واقع ہے وہیں رومن لوگوں نے لیو تیشیا کا شہر آباد کیا تھا جس کے آثار کلیسا کے قریب جو کھدائی ہوئی ہے' اس میں نکلے ہیں۔ کلیسا کے آس پاس کا علاقہ ایل دے لاستے (شہر کا جزیرہ) کہلاتا ہے' اس لیے کہ دریائے سین کی ایک شاخ نے اس جگہ ایک جزیرہ سا بنا دیا ہے۔ جس طرح یہ جزیرہ جو دو پلوں کے ذریعے سے شہر سے ملتا ہے' پیرس کا مرکز ہے' اسی طرح اس کا مرکز نوترے دام کا کلیسا ہے۔ یہ صرف پیرس ہی کا نہیں' فرانس کا مرکز ہے' اس لیے کہ فرانس کے نقشوں میں ملک کے تمام فاصلے اسی مقام سے ناپے جاتے ہیں"۔ (ص ۲۰۹)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خان سوربون کے جس مکان میں رہتے تھے' ایک طویل عرصے بعد اسی مکان میں آغا صاحب کو بھی قیام کا موقع ملا۔ جن الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے کھڑکی سے نظر آنے والا منظر بیان کیا ہے' انھیں الفاظ میں آغا صاحب نے بھی منظر نگاری کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کو خالی کرتے وقت ڈاکٹر صاحب اپنے سامان کا کچھ حصہ (الفاظ' جملے' تاریخی معلومات وغیرہ) یہیں چھوڑ گئے تھے۔ یہ سامان بعد میں آغا صاحب کے کام آیا اور خوب کام آیا۔

دریائے سین کے کنارے آغا صاحب نے جو کچھ دیکھا' اسے ان لفظوں میں بیان کیا: "دریائے سین کے کنارے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی صندوق نما دکانیں میلوں چلی گئی تھیں۔ جہاں پرانی کتابیں' بلاک سے تیار کی ہوئی تصویریں' نقشے اور متفرق علمی اشیا سستے داموں مل جاتی تھیں.... جب کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو علم دوست اشخاص سیر و تفریح کے لیے چہل قدمی کرنے نکل جاتے۔ اس

کباڑخانے میں بعض دفعہ نہایت عمدہ چیزیں کوڑیوں کے مول مل جاتیں۔ یہیں اچانک میری نظر ایک کباڑیے کی دکان میں پڑے دیوانِ ولی دکنی پر پڑی جسے اب سے سو سال پہلے گارساں دے تاسی نے ترتیب دے کر شائع کیا تھا۔ یہ دیوان مجھے چند فرانک میں مل گیا۔ یہ کتاب میں نے' جب شانتی نکیتن گیا' ٹیگور کو شانتی نکیتن کی لائبریری کے لیے تحفے کے طور پر دے دی"۔ (ص ۳۲۳)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: "دریائے سین کے کنارے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی صندوق نما دکانیں میلوں چلی گئی ہیں جہاں پرانی کتابیں اور تصویریں' بلاک سے تیار کی ہوئیں تصویریں اور نقشے اور متفرق علمی اشیا سستے داموں مل جاتی ہیں۔ جب کچھ کرنے کو نہ ہو تو علم دوست اشخاص یہاں سیر و تفریح کے لیے چہل قدمی کرنے نکل جاتے ہیں۔ یہاں بعض دفعہ نہایت عمدہ چیزیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میری نظر دیوانِ ولی پر پڑی جسے اب سے سو سال پہلے گارساں دے تاسی نے ترتیب دے کر شائع کیا تھا۔ یہ مجھے چند فرانک میں مل گیا۔ جب میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تھا تو میں نے یہ کتاب یونیورسٹی کی لائبریری کو تحفے کے طور پر دے دی تھی"۔ (ص ۲۱۴)

افسوس کہ دیوان ولی کا اتنا نادر نسخہ آغا صاحب نے گورو دیو ٹیگور کو دے دیا۔ کاش وہ اس دیوان کو اپنے پاس رکھتے تو ہم لاہور جا کر اُس کی زیارت کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے "یادوں کی دنیا" میں دو فرانسیسی پروفیسروں موسیو سلوان لیوی اور موسیو فوشے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "موسیو سلوان لیوی سردیوں میں پیرس میں رہتے تھے اور موسم بہار اور گرمیوں میں پیرس سے کچھ فاصلے پر مون مون رانسی چلے جاتے تھے جہاں ان کا ذاتی بنگلہ تھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں روسو کی معتقد مادام .... نے اس کی رہائش کے لیے جنگل کے قریب ایک مکان پیش کیا تھا اور جہاں اس نے کئی تصانیف لکھی تھیں... موسیو فوشے... کا بھی ذاتی بنگلہ تھا جو بالکل عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ موسیو فوشے ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک میں مدتوں رہے۔ ان کے مکان کے بیرونی صحن میں مہاتما بدھ کے متعدد بڑے بڑے مجسمے تھے۔ اندر مکان میں ایک بڑا کمرہ مجسموں اور مختلف نوادر سے بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر چین اور ہندوستان کی مصوری کے نمونے بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے جن کے بیچ بیچ میں چینی نقش و نگار کے پردے آویزاں تھے۔ موسیو فوشے نے قدیم تصاویر کے تحفظ پر تحقیقات کی تھی اور اس فن میں

بڑے ماہر خیال کیے جاتے تھے۔ حکومت حیدر آباد نے بھی کچھ عرصے کے لیے ان کی خدمات مستعار لی تھیں کہ وہ اجنتا کی دیواری تصاویر کے تحفظ کے لیے اپنی تجاویز پیش کریں"۔ (ص ۲۳-۲۲۲)

آغا صاحب نے موسیو سلوان لیوی کا ذکر نہیں کیا لیکن موسیو فوشے سے ملاقات کا حال لکھا ہے اور اس طرح کہ موسیو سلوان لیوی کے حالات کا کچھ حصہ موسیو فوشے کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا ہے۔ آغا صاحب بقول خود، کمل نامی ایک گائیڈ کے ذریعے موسیو فوشے سے ملے تھے۔ فرماتے ہیں: "صبح کمل مجھے اپنے ادیب دوست موسیو فوشے کے پاس مون مون رانسی لے گیا جہاں ان کا بنگلہ تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں روسو کی معتقد مادام .... نے ان کی رہائش کے لیے جنگل کے قریب ایک مکان پیش کیا تھا۔ جہاں روسو نے کئی تصانیف لکھیں .... موسیو فوشے کا کمرہ بالکل عجائب گھر معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک میں مدتوں رہے۔ ان کے مکان کے بیرونی صحن میں مہاتما بدھ کے متعدد بڑے بڑے مجسمے تھے۔ اندر مکان میں ایک بڑا کمرہ مجسموں اور مختلف نوادر سے بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر چین اور ہندوستان کی مصوری کے نمونے بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے جن کے درمیان چینی نقش و نگار کے پردے آویزاں تھے۔ موسیو فوشے نے قدیم تصاویر کے تحفظ پر تحقیقات کی تھی اور اس فن میں بڑے ماہر خیال کیے جاتے تھے۔ حکومت حیدر آباد نے بھی کچھ عرصے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی تھیں تا کہ وہ اجنتا کی دیواری تصاویر کے تحفظ کے لیے اپنی تجاویز پیش کریں"۔ (ص ۳۳۱)

ہمارے خیال میں اتنی مثالیں کافی ہیں۔ ہمیں کون سا پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا ہے جو ہم اقتباسات کے انبار لگا دیں۔ اب یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے کہ وہ ڈاکٹر یوسف حسین خان اور آغا اشرف کی کتابوں کے تقابلی مطالعے سے یہ معلوم کریں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے بائیس برس بعد لکھی جانے والی آغا صاحب کی کتاب سے کس طرح استفادہ کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں بہت عالم فاضل آدمی تھے۔ یقیناً ان کے پاس ایسا کوئی علم ہو گا جس کے ذریعے وہ مستقبل میں لکھی جانے والی کتابوں کے مطالب سے واقف ہو جاتے ہوں گے۔

(۱۰/ اگست ۱۹۸۹ء)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

انشائے غالب	(انتخاب رقعاتِ غالب)	مرتبہ رشید حسن خاں	۶۰/-
تذکیر و تانیث		جانشیں امیر مینائی جلیل حسن جلیل	۷۵/-
اردو ڈراما نگاری کا تنقیدی جائزہ		ابراہیم یوسف	۴۵/-
پتھر کی دیوار	(شعری مجموعہ)	سردار جعفری	۱۵/-
وسط ایشیا	(سفرنامہ)	آصف جیلانی	۵۱/-
معیارِ اردو	(محاورے)	جلیل حسن جلیل	۲۱/-
سیرت طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم		اختر الواسع	۱۰/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج		ڈاکٹر سید ظہور قاسم	۱۰/-
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات		سید جمال الدین	۵۱/-
محاوراتِ ہند۔ سبحان بخش		مرتبہ محبوب الرحمٰن فاروقی	۵۱/-
حضرت محمدؐ اور قرآن	(مذہب)	ڈاکٹر رفیق زکریا	۲۰۰/-
تفہیم	(مضامین)	رشید حسن خاں	۷۵/-
شناس و شناخت	(تنقید)	پروفیسر انور صدیقی	۶۰/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے	(مضامین)	ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری	۵۱/-
چہرہ در چہرہ	(طنز و مزاح)	مجتبیٰ حسین	۵۱/-
فی البدیہہ	//	یوسف ناظم	۴۵/-
تعلیم و تعلّم	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۷۵/-
سرسید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا سرسید اور اردو یونی ورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسن خاں	خطبہ	مرتبہ خواجہ محمد شاہد	۱۰/-
شعریات سے سیاسیات تک		غلام ربانی تاباں	۵۱/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں	(تنقید)	عبدالقوی دسنوی	۷۵/-
انشا اور تلفظ (طلبہ کے لیے)	(قواعد)	رشید حسن خاں	۹/-
عبارت کیسے لکھیں //	//	//	۱۵/-
آدم خور چیتا	(شکاریات)	ریاض احمد خاں	۴۵/-
اندازِ گفتگو کیا ہے	(تنقید)	شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
دستک اس دروازے پر		وزیر آغا	۵۱/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	(مضامین)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
جھینی جھینی بینی چدریا	(ناول)	عبدل بسم اللہ	۷۵/-